حدیثِ چشم

سمیع اللہ ملک

حدیث چشم

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَـٰنِ الرَّحِيمِ

اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور بے پناہ رحم کرنے والے ہیں

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ

خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اچھے کام کرے گا تو اس کو ان کا فائدہ ملے گا برے کرے گا تو اسے ان کا نقصان پہنچے گا۔ اے پروردگار اگر ہم سے بھول یا چوک ہو گئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کیجیو۔ اے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیو جیسا تو نے ہم سے پچھلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے پروردگار جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا ہمارے سر پر نہ رکھیو۔ اور (اے پروردگار) ہمارے گناہوں سے درگزر کر اور ہمیں بخش دے۔ اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا مالک ہے اور ہم کو کافروں پر غالب فرما (البقرہ:286)

انتساب

یورپ اور امریکا میں پلنے بڑھنے والی اپنی نوجوان نسل کے نام جن کو پہلی بار اپنے مسلمان ہونے کا احساس اور اہمیت کا پتہ چلا کہ مسلمان ہونا، غیر مسلموں اور مسلم دشمنوں کی نظروں میں کیا ہوتا ہے۔ اور وہ کس قدر اہم ہیں کہ دنیا کی اکلوتی سپر طاقت جو تاریخ میں اپنی طاقت کے اعتبار سے بے مثال ہے، اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑی ہے۔

فہرست

سیریل نمبر	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
1	عقل، طاقت اور ایمان	بروز منگل ۱۵/ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۳ نومبر ۲۰۰۹ء	8
2	سیاسی اکھاڑا یا جمہوری اکھاڑا	بروز جمعرات ۱۷/ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۵ نومبر ۲۰۰۹ء	11
3	جامہ صد چاک	بروز ہفتہ ۱۹/ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۷ نومبر ۲۰۰۹ء	14
4	اقبالؒ کی یاد رسم یا وسیلہ فکر	بروز سوموار ۲۱/ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۹ نومبر ۲۰۰۹ء	18
5	آزادی رخصت ہو چکی؟	بروز بدھ ۲۳ ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۱۱ نومبر ۲۰۰۹ء	21
6	نام و نسب کی گالیاں	بروز جمعۃ المبارک ۲۵ ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۱۳ نومبر ۲۰۰۹ء	24
7	قوتِ عمل کی کمزوری	بروز اتوار ۲۷ ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۱۵ نومبر ۲۰۰۹ء	26
8	راستوں کی دھول	بروز منگل ۲۹ ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۱۷ نومبر ۲۰۰۹ء	30
9	فروزاں مشعل	بروز جمعرات ۲ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۱۹ نومبر ۲۰۰۹ء	33
10	وہ پچھتاوہ، جس کا نہیں کوئی مداوہ	بروز ہفتہ ۴ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۲۱ نومبر ۲۰۰۹ء	36
11	تمہارا میرا رشتہ	بروز سوموار ۶ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۲۳ نومبر ۲۰۰۹ء	39
12	ماڈریٹ اسلام	بروز منگل ۷ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۲۴ نومبر ۲۰۰۹ء	43
13	خودکش: جواز عدم جواز کی کشمکش	بروز بدھ ۸ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۲۵ نومبر ۲۰۰۹ء	46
14	اپنی دہکائی آگ	بروز جمعرات ۹ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۲۶ نومبر ۲۰۰۹ء	49
15	ان سے ملئے	بروز سوموار ۱۳/ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۳۰ نومبر ۲۰۰۹ء	52
16	سارتر کا فرانس	بروز منگل ۱۴/ذوالحج ۱۴۳۰ھ یکم دسمبر ۲۰۰۹ء	55
17	احساس کی کھیتی	بروز بدھ ۱۵/ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۲ دسمبر ۲۰۰۹ء	58
18	اپنا شیطان	بروز جمعۃ المبارک ۱۷/ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۴ دسمبر ۲۰۰۹ء	61
19	سنگ دل کون؟	بروز اتوار ۱۹/ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۶ دسمبر ۲۰۰۹ء	64
20	ہمارے خواب	بروز منگل ۲۱ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۸ دسمبر ۲۰۰۹ء	67
21	زیب داستاں	بروز جمعرات ۲۳ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۱۰/دسمبر ۲۰۰۹ء	70
22	قدرت کا پوشیدہ راز	بروز ہفتہ ۲۵ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۱۲/دسمبر ۲۰۰۹ء	73
23	حیثیت کا غلط استعمال	بروز سوموار ۲۷/ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۱۴/دسمبر ۲۰۰۹ء	76
24	کھوکھلا ڈھانچہ	بروز بدھ ۲۹ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۱۶/دسمبر ۲۰۰۹ء	79
25	قیامت سے پہلے قیامت	بروز جمعۃ المبارک یکم محرم ۱۴۳۱ھ ۱۸ دسمبر ۲۰۰۹ء	82
26	لباس کی جنگ	بروز منگل ۵ محرم ۱۴۳۱ھ ۲۲ دسمبر ۲۰۰۹ء	85

سیریل نمبر	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
27	رخصتی طے ہو چکی	بروز جمعرات ۷ محرم ۱۴۳۱ھ ۲۴ دسمبر ۲۰۰۹ء	88
28	ماتھے کا جھومر	بروز جمعۃ المبارک ۸ محرم ۱۴۳۱ھ ۲۵ دسمبر ۲۰۰۹ء	91
29	کوتاہیوں کا کفارہ	بروز ہفتہ ۹ محرم ۱۴۳۱ھ ۲۶ دسمبر ۲۰۰۹ء	94
30	ہم ذلیل ورسوا کیوں	بروز اتوار ۱۰ محرم ۱۴۳۱ھ ۲۷ دسمبر ۲۰۰۹ء	97
31	میرا قصور	بروز سوموار ۱۱ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۲۸ دسمبر ۲۰۰۹ء	100
32	خلافِ مصلحت	بروز جمعرات ۱۴ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۹ء	104
33	ایک مضبوط پاکستان	بروز جمعۃ المبارک ۱۵ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ یکم جنوری ۲۰۱۰ء	108
34	کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں	بروز ہفتہ ۱۶ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۲ جنوری ۲۰۱۰ء	111
35	کمزور یا منافق	بروز بدھ ۲۰ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۶ جنوری ۲۰۱۰ء	115
36	ثقافتی فتح	بروز جمعرات ۱۲ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۷ جنوری ۲۰۱۰ء	118
37	سرحد پار کے دوست	بروز جمعۃ المبارک ۲۲ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۸ جنوری ۲۰۱۰ئ	122
38	پہلوان	بروز سوموار ۲۵ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۱۱ جنوری ۲۰۱۰ء	126
39	خونِ ناحق	بروز جمعۃ المبارک ۲۹ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۱۵ جنوری ۲۰۱۰ء	129
40	کلیجہ جلتا ہے	بروز اتوار یکم صفر ۱۴۳۱ھ ۱۷ جنوری ۲۰۱۰ء	132
41	فائدہ کس کا؟	بروز منگل ۳ صفر ۱۴۳۱ھ ۱۹ جنوری ۲۰۱۰ء	135
42	توکل	بروز بدھ ۴ صفر ۱۴۳۱ھ ۲۰ جنوری ۲۰۱۰ء	138
43	نفع کی پوٹلی	بروز ہفتہ ۷ صفر ۱۴۳۱ھ ۲۳ جنوری ۲۰۱۰ء	141
44	گورپیا کوئی ہور	بروز اتوار ۸ صفر ۱۴۳۱ھ ۲۴ جنوری ۲۰۱۰ء	144
45	نیٹ ورک	بروز منگل ۱۰ صفر ۱۴۳۱ھ ۲۶ جنوری ۲۰۱۰ء	147
46	جاودانی حقیقت	بروز جمعرات ۱۱ صفر ۱۴۳۱ھ ۲۷ جنوری ۲۰۱۰ء	150
47	بھکاری ملک کا سخی	بروز جمعۃ المبارک ۱۲ صفر ۱۴۳۱ھ ۲۸ جنوری ۲۰۱۰ء	153
48	خونی لکیر	بروز اتوار ۱۴ صفر ۱۴۳۱ھ ۳۰ جنوری ۲۰۱۰ء	156
49	وفاداری کے داغ	بروز سوموار ۱۵ صفر ۱۴۳۱ھ ۳۱ جنوری ۲۰۱۰ء	159
50	سچا کون	بروز بدھ ۱۷ صفر ۱۴۳۱ھ ۲ فروری ۲۰۱۰ء	162
51	مہذب دنیا	بروز جمعرات ۱۸ صفر ۱۴۳۱ھ ۳ فروری ۲۰۱۰ء	165
52	حفظ ماتقدم	بروز ہفتہ ۲۰ صفر ۱۴۳۱ھ ۵ فروری ۲۰۱۰ء	168

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ
53	جبار بھی قہار بھی	بروز اتوار ۲۱ صفر ۱۳۴۱ھ ۶ فروری ۲۰۱۰ء	171
54	گناہِ کبیرہ	بروز سوموار ۲۲ صفر ۱۳۴۱ھ ۷ فروری ۲۰۱۰ء	174
55	مشکوک کمیونٹی	بروز بدھ ۲۴ صفر ۱۳۴۱ھ ۹ فروری ۲۰۱۰ء	178
56	امن بذریعہ ظلم	بروز جمعرات ۲۵ صفر ۱۳۴۱ھ ۱۰/فروری ۲۰۱۰ء	181
57	ذرا رک کر سوچئے	بروز ہفتہ ۲۷ صفر ۱۳۴۱ھ ۱۲/فروری ۲۰۱۰ء	184
58	ہماری وصیت	بروز اتوار ۲۸ صفر ۱۳۴۱ھ ۱۳/فروری ۲۰۱۰ء	187
59	اعترافِ جرم	بروز یکم ربیع الاوّل ۱۳۴۱ھ ۱۵ فروری ۲۰۱۰ء	190

عقل، طاقت اور ایمان

ایک دفعہ پھر ہٹلر نیو ورلڈ آرڈر کے ساتھ مارتا دھاڑتا اور چنگاڑتا ہوا طاقت کے بل بوتے پر یورپ کو تاراج کرنے کے لئے نکل کھڑا ہوا' یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے مقاصد کی کامیابی کے لئے بڑا بڑا پر عزم' پر یقین اور پر امید تھا کہ پرتگال سے لیکر ماسکو تک وہ جرمنی کی حکمرانی کا جھنڈا لہرائے بغیر واپس نہ لوٹے گا۔ وہ برطانوی افواج بھی اس کے سامنے بے بس ہو گئیں تھیں جن کے اقتدار کا سورج دنیا میں غروب نہیں ہوتا تھا۔ جب پے در پے ناکامیوں نے برطانوی نیول چیف کو مایوس کر دیا تو وہ چرچل کے سامنے جنگ کی موجودہ صورتحال پر اپنی ناکامیوں کا اعتراف کرنے پہنچ گیا ''مسٹر پرائم منسٹر! اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں اپنی منصوبہ بندی تبدیل کرنا ہو گی۔'' چرچل نے اپنے مایوس نیول چیف کے منہ کی طرف دیکھا اور حسبِ معمول سگار کا گہرا کش لے کر دھواں چھوڑتے ہوئے فوری کھڑا ہو گیا' نیول چیف کے بالکل سامنے اس کی بجھتی آنکھوں میں اپنی چمکدار آنکھیں ڈال کر بڑے پر سکون لہجے میں پوچھا "کیوں"؟

"ہمارے جہاز اور توپیں جرمنی کا مقابلہ کرنے سے اب قاصر ہو گئیں ہیں" چرچل نے قہقہہ لگایا اور نیول چیف کو اپنی گھورتی آنکھوں سے مخاطب ہو کر کہا "آفیسر! آج تک عقل سے زیادہ کوئی بڑی توپ ایجاد نہیں ہوئی۔'' نیول چیف کے منہ پر حیرانی و پریشانی دیکھ کر چرچل دوبارہ اس کی طرف مڑا' پورے یقین کے ساتھ گرجدار آواز میں بولا کہ ''اگر جرمنوں کے پاس ہم سے بہتر توپیں اور جہاز ہیں تو ہمارے پاس ان سے بہتر عقل ہے' لہٰذا فاتح ہم ہی ہونگے' تم لوگ بس لڑتے رہو۔'' تاریخ گواہ ہے کہ چرچل کی بات صد فیصد ٹھیک نکلی۔ برطانیہ کے شاطر دماغ نے متکبر ہٹلر کو ماسکو میں پھنسا دیا اور امریکہ کو جاپان میں اس طرح الجھا دیا کہ اس نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر دنیا میں پہلی مرتبہ ایٹم بم برسا کر ہمیشہ کے لئے تاریخ میں اپنے منہ پر ایسی کالک ملی کہ آج تک دنیا بھر کے دانشور اور عام شہری باجماعت اس عمل پر امریکا پر لعنت اور شدید نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف آج بھی ہم جب دوسری عالمی جنگ عظیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں عقل طاقت پر غالب نظر آتی ہے۔

دنیا میں کامیابی کا نسخہ ہمیشہ عقل کا صحیح اور بروقت استعمال ہے۔ ہم جب بھی مسلم دنیا اور مغربی طاقتوں کی آویزش کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں مسلم دنیا مغلوب' کمزور اور ناتواں نظر آتی ہے' آخر کیوں؟ جبکہ مسلم دنیا کے پاس وسائل اور افرادی قوت کی قطعاً کمی نہیں' تمام تر پابندیوں کے باوجود انتہائی کم وسائل کے ساتھ پاکستان عالمِ اسلام میں پہلی جوہری طاقت بن کر ابھرا اور اس کے ساتھ ساتھ جوہری طاقت کے استعمال کے لئے ایک بہترین ڈلیوری میزائل سسٹم رکھنے والا ملک بھی بن گیا لیکن کیا وجہ ہے کہ اس کے باوجود یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری طاقت کا یہ سارا بھرم خاک میں ملتا جا رہا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہم عقل اور ذہانت سے کام نہیں لیتے۔ آپ صرف بھارت کی سفارت کاری کا مطالعہ کر لیں' آپ کو ساری مسلم دنیا کی عقل کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔

سرد جنگ کے دور میں بھارت اور روس گہرے دوست تھے۔ روس بھارت کو اربوں ڈالر کی امداد اور اسلحہ دیتا تھا لیکن اسی عرصہ میں بھارت کے امریکا

کے ساتھ بھی گہرے تعلقات تھے۔ ۱۹۶۲ء میں بھارت اور چین کی جنگ شروع ہوئی تو نہرو کو اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ پاکستان اس جنگ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہیں کشمیر میں نہ گھس جائے۔ اس نے امریکی صدر کینیڈی سے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تو امریکی صدر نے پاکستان کی جانب سے اس بات کی ضمانت دی کی پاکستان دورانِ جنگ ایسی کوئی حماقت نہیں کرے گا۔ یہ کیسا بھارتی کمال ہے کہ امریکا اور روس دونوں ایک دوسرے کی جانی دشمن تھے لیکن بھارت کے دونوں گہرے دوست تھے۔ سرد جنگ کے بعد بھارت اور اسرائیل ایک دسرے کے اس قدر قریبی اتحادی بن گئے کہ اسرائیل بھارت کو ہر سال ۰۰۹ ملین ڈالر کا جدید اسلحہ دینے والا ملک بن گیا۔

بھارت اور اسرائیل کی اربوں ڈالر کی سالانہ تجارت شروع ہو گئی۔ اسرائیلی وزیرِ اعظم شیرون نے دہلی کا دورہ اس وقت کیا جب روس اور اسرائیل ایک دوسرے کے انتہائی دشمن تھے۔ عالمِ اسلام میں عربوں کی مثال ملاحظہ فرمائیں۔ عرب پچھلے ساٹھ سالوں سے اسرائیل کے ساتھ لڑ رہے ہیں اور وہ ہر اس ملک کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں جو اسرائیل کا دوست ہے لیکن بھارت کا کمال دیکھئے کہ بھارت ہر سال عربوں سے دس ارب ڈالر کا تیل خریدتا ہے' پندرہ ارب ڈالر کی تجارت کرتا ہے' اس کے پچاس لاکھ باشندے عرب ریاستوں میں کام کرتے ہیں اور بھارت ساری دنیا کے سامنے اسرائیل کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اپنے اس تعلق پر ناز کرتا ہے۔ آپ ایران کو دیکھ لیں' اسرائیل اور ایران ایک دوسرے کے سخت دشمن ہیں' اسرائیل ایرانی نیوکلر اور میزائل پروگرام کو اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ قرار دے چکا ہے' ہر آئے دن ایرانی نیوکلر پلانٹ پر حملے کی دھمکی بھی دیتا رہتا ہے لیکن ساتھ ہی ایران اسرائیل کے دوست بھارت کو پاکستان سے بہتر دوست کا درجہ دیتا ہے۔

اس وقت ایران اور بھارت میں گہری چھنتی ہے' دونوں ممالک ایک دوسرے کو ''موسٹ فیورٹ اقوام قرار دے چکے ہیں۔ اسی طرح بھارت کی عراق کے سابقہ مرحوم صدر صدام حسین کے ساتھ اس وقت بھی گہرے تعلقات تھے جب عراق اور ایران میں شدید جنگ ہو رہی تھی اور صدام ان دنوں اسرائیل اور ایران کو اپنا سب سے بڑا دشمن کہتا تھا لیکن بھارت کی دوستی اور تجارتی تعلقات ان تینوں ممالک کے ساتھ تھے اور اب بھی اس کے تعلقات میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آیا۔ یہ ہے بھارت کی عجیب و غریب سفارت کاری' وہ آپس میں تین دشمنوں کو اپنا دوست بنا کر اپنے مفادات کو ہمیشہ سامنے رکھتا ہے جبکہ اس کے مقابلہ میں پورا عالمِ اسلام اسرائیل کا دشمن ہے لیکن اسرائیل کے دوست بھارت کو اپنی دوستی کے تخت پر ساتھ بٹھا رہے ہیں۔

اب آپ پاکستان کی مثال لیں' ہم نے پچھلے باسٹھ برسوں سے امریکا کی دوستی میں روس سے دشمنی مول لئے رکھی اور ہر اس مسلم ملک سے بھی فاصلہ رکھا جس کا حکم ہمیں امریکا نے دے رکھا تھا لیکن جب فائدہ کا وقت آیا تو بھارت ان سب کی آنکھ کا تارہ اور محبوب بن گیا۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد خلیجی ریاستوں نے پاکستانیوں کو ویزہ دینے سے بھی انکار کر دیا بلکہ پاکستانیوں کا نکال نکال کر بھارتی ہندوؤں کو بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۹۰ء کی خلیجی جنگ میں صدام حسین زندہ باد کے نعرے پاکستان نے لگائے لیکن اقوام متحدہ کی پابندیوں کے باوجود بھارت مسلسل تیل حاصل کرتا رہا۔

ایران ہمارا ہمسایہ ملک اب بھارت کی زبان میں ہم سے بات کرتا ہے۔ پاکستان میں حالیہ دہشت گردی کے واقعات میں زاہدان میں قائم بھارتی قونصل خانے نے جو کھلم کھلا مداخلت کی ہے اس کے ثبوت تو پاکستان کے حساس اداروں نے فوری طور پر ایران کے حوالے بھی کئے ہیں لیکن ایران اس پر کوئی کاروائی کرنے کے لئے تیار نہیں۔ زاہدان میں قائم بھارتی قونصل خانے کی طرف سے بلوچستان میں مداخلت کے ثبوت باقاعدہ طور پر ایران کے حوالے کئے گئے لیکن ایرانی حکومت ابھی تک اس پر کاروائی کو نظر انداز کر رہی ہے۔ پاکستان میں دہشت گردی کی سنگین وارداتوں میں ملوث ۷۵ سے زائد پاکستانی مجرم اس وقت ایران میں مقیم ہیں لیکن یہ ہمسایہ ملک ان مطلوب مجرمان کو پاکستان کے حوالے کرنے سے لیت و لعل سے کام لے رہا ہے۔ حالیہ سیستان میں خودکش حملے کا سارا الزام فوری طور پر پاکستان پر لگا دیا گیا اور اس کے جواب میں پاکستان نے فوری طور پر اٹھارہ سے زائد مطلوبہ ایرانی افراد کو ایرانی حکومت کے حوالے کر دیا لیکن اس کے باوجود ایرانی سیکورٹی گارڈز آئے دن پاکستان کی حدود کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

افغانستان کے جہاد میں پاکستان نے جو قربانیاں دی ہیں وہ تاریخ کا ایک ناقابل فراموش حصہ ہے جس کی وجہ سے امریکا دنیا کی واحد سپر پاور بنا لیکن پاکستان کے ان احسانات کا بدلہ بھارت نے وصول کیا اور امریکا نے سول ایٹمی معاہدے کے لئے بھارت کو منتخب کیا۔ ایک دفعہ پھر افغانستان پر حملے کرنے کے لئے امریکا نے پاکستان کے تمام ہوائی اڈے، چھاونیاں اور سڑکیں استعمال کیں، پاکستان کو داخلی طور پر تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا گیا اور نجانے اور اس کی کتنی قیمت ادا کرنی پڑے گی لیکن اس کا فائدہ بھارت نے اس طرح اٹھایا کہ کیری لوگر بل میں بھی بھارت کو پاکستان پر اس طرح فوقیت دی جا رہی ہے کہ پاکستان کی خود مختاری کو بھارت کا محتاج کرنے کی مکروہ کوشش کی گئی ہے۔ چلئے یہ مان لیتے ہیں کہ روس، بھارت اور اسرائیل اپنے اپنے مفادات کی خاطر پاکستان کے دشمن ہیں لیکن عرب ریاستیں، ایران اور چین تو ہمارے دوست تھے، وہ کیوں آج ہم سے منہ موڑ گئے ہیں؟

دنیا بے شمار ممالک مفادات کی جنگ میں مصروف ہیں، لاتعداد ممالک ایک دوسرے سے خار کھائے بیٹھے ہیں، کیا ہم میں اتنی بھی صلاحیت نہیں کہ ان وجوہات کا پتہ لگائیں۔ اب یہ بات تو ثابت ہو چکی ہے اور حساس اداروں نے ان ٹیلیفون کی ریکارڈنگ بھی حکومت کے حوالے کر دی ہے جس میں ''امریکا میں پاکستانی سفیر حسین حقانی'' کچھ امریکی سینیٹرز کو ان مکروہ شرائط کو کیری لوگر بل میں شامل کرنے کی استدعا کر رہے ہیں۔ ملک کے وزیر داخلہ رحمان ملک کا کردار بھی سب کے سامنے ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ امریکی سیکرٹری خارجہ ہیلری کلنٹن کے پاکستانی دورے میں حسین حقانی کی عدم موجودگی کو سب ہی نے محسوس کیا کیونکہ حسین حقانی کے اس کردار سے قوم واقف ہو چکی ہے۔

چرچل نے کہا تھا دنیا میں آج تک عقل سے بڑی کوئی توپ ایجاد نہیں ہوئی، ہم کس قدر بدقسمت ہیں کہ قائداعظم کے بعد آج تک ہماری توپوں میں کوئی جان نہیں رہی شائد ہمارے حکمران اپنے مفادات کی خاطر عقل سے محروم ہو چکے ہیں اسی لئے سنا ہے کہ این آر او کو منظور کروانے کے لئے اسمبلی ممبران کی خرید و فروخت جاری ہے۔ کیا اب عقل کے ساتھ ایمان بھی فروخت ہو گا؟

!نام میرے رب کا جو دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے

فگار خوف کا سایہ ہے میری نسلوں پر اماں میں رہتے ہوئے بے امان رکھے گئے

لندن بروز منگل ۱۵ ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۳ نومبر ۲۰۰۹ء

سیاسی اکھاڑا یا جمہوری کباڑا

امریکی خارجہ سیکرٹری پاکستان کے دورے کے دوران پہلی مرتبہ ایک مختلف تجربے سے دوچار ہوئیں جہاں پاکستانی عوام کے مختلف لوگوں سے براہِ راست مل کر امریکا کے بارے میں ان کے خیالات' ان کی کڑوی اور سچی باتیں سننے کو ملیں لیکن اس کے باوجود بھارت کے متعلق بہت محتاط رویہ اور موجودہ جمہوری حکومت کے ساتھ یکجہتی اور تعاون کا انہوں نے کئی مرتبہ اعادہ کیا۔ ان کے کچھ پروگرام ٹی وی پر دیکھنے کے دوران نجانے مجھے امریکا کا ایک اور حلیف ملک جنوبی کوریا شدت سے کیوں یاد آیا۔ ''پارک تائے جون'' ۳۱ جنوری ۲۰۰۰ء کو جنوبی کوریا کے وزیرِ اعظم کو منتخب ہوئے ابھی چند ہفتے ہی گزرے تھے کہ ان کے خلاف عدالت میں ٹیکس چوری کا مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ ایک طرف وہ جنوبی کوریا کے منتخب صدر کی حیثیت سے اپنا سرکاری کام سرانجام دیتے رہے اور دوسری طرف وہاں کی عدالت نے ان کے خلاف ٹیکس چوری کے مقدمے کی سماعت جاری رکھی' شائد وہاں کے آئین میں مقدمے کے دوران کسی بھی اعلیٰ عہدے دار کو قانونی اور آئینی استثنیٰ نہیں جیسا پاکستان کے آئین میں تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔

بالآخر چار مہینے کے بعد ۱۰ مئی ۲۰۰۰ء کی دوپہر کو ان کے خلاف فیصلہ سنا دیا گیا' انہیں ٹیکس چور قرار دیتے ہوئے عدالت نے ان کو سزا سنا دی کیونکہ انہوں نے ٹیکس ڈیپارٹمنٹ سے اپنے اثاثے چھپائے تھے۔ ۱۳ مئی ۲۰۰۰ء کو جنوبی کوریا کے وزیرِ اعظم پارک تائے جون نے عدالت کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا' سارے میڈیا کے سامنے اپنی قوم سے معافی مانگی اور اپنے عہدے سے فی الفور استعفیٰ دیکر گھر روانہ ہو گئے۔

جنوبی کوریا پاکستان کے مقابلے میں ایک چھوٹا ملک ہے۔ اس کی آبادی پانچ کروڑ سے کہیں کم ہے اور 38 ہزار 330 مربع میل پر محیط ایک چھوٹا ملک ہے۔ اس کی تاریخ بھی فوجی انقلابوں' مارشل لائوں' آئینی معطلیوں' انتظامی ایل ایف اوز اور انتخابی دھاندلیوں سے بھری پڑی ہے۔ وہاں بھی امریکا بہادر ان کے تمام عسکری' سیاسی اور ثقافتی معاملات میں بری طرح دخیل ہے لیکن اس کے باوجود تیسری دنیا کے اس چھوٹے اور غریب ملک کے جمہوری ڈھانچے میں ایک ٹیکس چور سیاستدان' ایک سزا یافتہ وزیرِ اعظم کی گنجائش نہیں۔ اس ملک میں بھی عدالتیں اتنی آزاد اور خود مختار ہیں کہ وہ برسرِ اقتدار وزیرِ اعظم کے خلاف نہ صرف مقدمہ سن سکتی ہیں بلکہ اس کو سزا سنا کر گھر بھی بھیج سکتی ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں پاکستان کے سیاستدان' پاکستان کے وزراء' ایم این اے' ایم پی اے' سینیٹرز کی ایک کثیر تعداد نے وقت پر گوشوارے جمع نہیں کروائے جس کے بعد الیکشن کمیشن نے 68 سے زائد ممبران کو ان کی رکنیت سے عارضی طور پر معطل تو کر دیا لیکن چند دنوں بعد ان کو بحال بھی کر دیا گیا۔ قانون موجود ہے' قانون ساز شخصیات اس قانون سے پوری طرح آگاہ ہیں لیکن گوشوارے داخل کروانے کی آخری تاریخ ۳۰ ستمبر بھی گزر جاتی ہے' جمہوریت اگلے سال میں قدم رنجہ بھی فرما لیتی ہے لیکن ہماری جمہوریت کے نگہبان وقت پر گوشوارے جمع کروانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ یہ ہے ہمارے ملک کا جمہوری ڈھانچہ!

پاکستان کی 62 سالہ تاریخ کا 65 فیصد عرصہ طالع آزماؤں اور فوجی آمریت میں گزرا ہے‘ اس مدت میں قوم نے چار فوجی حکمرانوں کو اپنے بدن پر یونیفارم زیبِ تن کئے ہوئے سیاستدانوں پر نااہلی اور کرپشن کے الزامات‘ ملک کو سنگین اور خطرناک حالات سے باہر نکالنے اور اپنی محب الوطنی‘ کا یقین دلاتے ہوئے ملک کی باگ ڈور سنبھالنے یا زمامِ اقتدار پر قبضہ کرنے کا اعلان کرتے دیکھا ہے یا بھگتا ہے۔ پھر اس سارے عرصے میں تمام سیاستدان ان فوجی حکمرانوں سے جمہوریت کی بھیک مانگتے ہیں۔ یہ تمام فوجی حکمران پہلے تو آئین میں اپنے جابرانہ اور غیر آئینی اقدامات کی گنجائش پیدا کرتے ہیں‘ اپنے اقتدار کے لئے آئین معطل کرنا پڑے تو یہ کام بھی بڑی رعونت کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں‘ اور پھر اسی آئین میں اپنی مرضی کی ترامیم کر کے اپنی حکومت کا جواز پیدا کرتے ہیں۔ یہ ہے ہمارے ملک کا جمہوری ڈھانچہ !

یہ فوجی حکمران پھر اسی ترمیم شدہ آئین کے تحت انتخابات کراتے ہیں‘ ضرورت پڑنے پر انہی اسمبلیوں کو رخصت کر کے گھروں کو بھیج دیتے ہیں۔ انہی اسمبلیوں کے منتخب افراد غیر منتخب فوجی حکمرانوں کے حق میں قراردادیں منظور کرتے ہیں‘ منتخب حکومتیں غیر منتخب عہدیداروں کو اپنا ’’باس‘‘ کہتی ہیں بلکہ اسی ملک کے ایک بہت بڑے جمہوری لیڈر تو ایک عرصے تک ایسے ہی ایک فوجی طالع آزما جنرل کو ’’ڈیڈی‘‘ کہہ کر بھی پکارتے رہے۔ جب اس جمہوری لیڈر کو بعض وجوہات کی بناء پر فارغ کر دیا گیا تو کئی ہفتے انہوں نے روتے ہوئے منت سماجت میں گزارے لیکن بھلا ہو اس امریکا کا‘ ایسے مشکل حالات میں آنسو پونچھنے کے لئے وہ آگے بڑھ کر اپنا دستِ شفقت رکھتا ہے اور پھر قوم نے انہی اشک بھری آنکھوں میں ایسی رعونت اور تکبر بھی دیکھا کہ قوم کو جبراً ایک دفعہ پھر کسی اور فوجی حکمران کو اپنا مسیحا مان کر سب کچھ اس کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ ہے ہمارے ملک کا جمہوری ڈھانچہ !

پاکستان کی باسٹھ سالہ جمہوری تاریخ میں اس قوم نے بے شمار بریف کیس‘ جوڑ توڑ‘ ہارس ٹریڈنگ‘ اغوبرائے ووٹ‘ مری بھوربن کی یخ بستہ عیاشیاں اور پنجاب ہاوس کے بڑے شرمناک کردار دیکھے۔ اس تاریخ میں سینکڑوں لوٹے اِدھر سے اُدھر لڑھکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک رکن اسمبلی کی صبح پیپلز پارٹی میں طلوع ہوتی ہے تو شام مسلم لیگ کے سائے تلے گزرتی ہے۔ اقتدار کے قریب پہنچ کر ہر جماعت کے بطن سے کوئی نہ کوئی گروپ جنم لے لیتا ہے ۔ ہمارے ملک کی مسلم لیگ بھی ایسی مطلقہ ہے کہ ہر آنے والے فوجی حکمران سے نکاح کے لئے تیار بیٹھی رہتی ہے۔ اس منکوحہ کی پہلی اولاد جن پر ہر حکومت میں کرپشن کا الزام لگتا ہے‘ ہر آنے والا طالع آزما ان تمام افراد کو گود لیکر ایک نئی حکومت ترتیب دیکر اگلے کئی سالوں کے لئے ان کی کفالت کی ذمہ داری کا منصب نبھاتا ہے۔ یہ ہے ہمارے ملک کا جمہوری ڈھانچہ !

پاکستان کی باسٹھ سالہ جمہوری تاریخ میں آئین نام کی کوئی چیز تھی اور نہ ہی کوئی قانون‘ سیاسی انتقام کو احتساب کا نام دیا گیا۔ سیاسی مخالفین کو سڑکوں پر گھسیٹا گیا‘ تھانے کچہریاں اور عدالتیں حکمرانوں کے ڈنڈے بن گئے ں‘ چوروں اور ڈکیٹوں کو تھانیدار لگایا گیا اور سیاسی منظورِ نظر کو جج۔ ہر حکمران نے اپنے ناجائز کاموں کو عدالتوں کے ذریعے جائز قرار دلایا۔ وزرائے اعظم فون کر کے فیصلے کراتے رہے‘ عدالتوں کو جھکانے کے لئے ان پر حملوں سے بھی گریز

نہیں کیا گیا‘ضرورت کو نظریہ اور نظریئے کو قانون بنایا گیا۔ سیاستدانوں کو ترقیاتی فنڈز کے نام پر رشوت بانٹی گئی‘ سائیکلوں اور رکشوں پر اسمبلی آنے والے ہیلی کاپٹر اور مرسیڈیز پر سواری کرنے لگے‘ کروڑوں اربوں روپے لوٹے گئے‘ مالی اسکینڈل میں ملوث لوگ اسمبلیوں اور وزارتوں تک پہنچے‘ اربوں روپوں کی آمدنی کے مالک برسوں چند سو روپے ٹیکس دیتے رہے اور سرکاری جہازوں پر کروڑوں ڈالر باہر منتقل کرتے رہے۔ یہ ہے ہمارے ملک کا جمہوری ڈھانچہ!

پاکستان کی باسٹھ سالہ جمہوری تاریخ میں ہر اپوزیشن ملک دشمن اور ہر حکومت محب وطن کہلائی۔ اس جمہوری تاریخ میں بالآخر یہ وقت بھی آیا کہ ایک غاصب نے اپنی حکومت کو بچانے کے لئے اپنے بیرونی آقاؤں کے حکم پر ان کو این آر او جاری کیا‘ جن کے خلاف اربوں روپے کی کرپشن کے الزامات اندرون اور بیرونِ ملک دائر تھے‘ ان سب کو ان تمام مقدمات سے نہ صرف رہائی مل گئی بلکہ اس ملک کے سب سے اعلیٰ منصب پر ان کو اپنے ہاتھوں فائز بھی کرنا پڑا۔ ہمارے یہی حکمران جب کبھی اپنے آقاؤں کی قدم بوسی کے لئے واشنگٹن جاتے ہیں تو امریکی صدر اور دوسرے حکومتی ارکان ان کو تھپکی دیکر پاکستان کے جمہوری ڈھانچے کی خوب تعریف کرتے ہیں۔

بہت خوب! اگر یہ جمہوری ڈھانچہ واقعی قابل تعریف ہے تو امریکا اسے اپنے ملک میں نافذ کیوں نہیں کرلیتا‘ ملک سے اربوں ڈالر کی لوٹ کھسوٹ کر کے امریکی اور مغربی بینکوں میں محفوظ کرنے والے یہ اعلیٰ مناصب پر فائز حکمرانوں‘ وزیروں‘ مشیروں‘ سینٹروں‘ قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبران کو کیپٹل ہل میں منتقل کیوں نہیں کر لیا جاتا‘ اگر ہمارا جمہوری ڈھانچہ اتنا ہی قابل تعریف ہے تو امریکا کی کسی ریاست میں اس کا تجربہ کیوں نہیں کیا جاتا؟ ہو سکتا ہے واشنگٹن‘ ٹیکساس‘ ورجینیا اور کیلیفورنیا ان تجربہ کار لوگوں کے ہاتھوں مہینوں میں پاکستان جیسے بن جائیں!

رہے نام میرے رب کا جس نے ہر حال میں عدل کرنے کا حکم دے رکھا ہے!

خزاں کو سینچتے رہتے ہیں ہر پل
یہ کیسے باغباں رکھے ہوئے ہیں

لندن بروز جمعرات ۱۷/ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۵ نومبر ۲۰۰۹ء

جامہ صد چاک

اگرچہ یہ عام تاثر ہے کہ امریکا اور یورپ نے ۱۱ ستمبر کی ہولناک کاروئی کے سبب مسلمانوں کو دہشت اور نفرت کی علامت سمجھ لیا ہے مگر صدیوں کی تاریخ اس تاثر کی تردید کرتی ہے۔ اندلس (اسپین)، ترکی، بغداد اور دہلی میں صدیوں طاقتور اور شاندار مسلم حکمرانی نظر آتی ہے مگر پانچ برس بھی مشکل سے تلاش کئے جاسکیں گے جب غیر مسلم دنیا کو یلغار اور دشمنی سے تحفظ میسر آیا ہو۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ مسلمانوں سے خوفزدہ کیوں ہیں؟ تاریخ کے ٹھوس اور مصدقہ اوراق شاہد ہیں کہ مسلمانوں کے حکمراں ہوں یا عوام، مذہبی پیشوا، سب غیر مسلمانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی قابلِ رشک مثالیں بالعموم کثرت سے نظر آتی ہیں۔ پھر مسئلہ کیا ہے؟ دراصل ان کے نزدیک خواہ مسلم ممالک طاقتور ہو یا کمزور، مسلمانوں کا برسر اقتدار، متحد اور طاقتور ہونا ناقابلِ برداشت ہے یعنی ان کی بالادستی کے جنون کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اس صورتحال کی عکاسی میں ماضی بعید کو چھوڑیئے، ماضی قریب کے صرف تین واقعات پیش کرتا ہوں جن میں بالخصوص مسلمانوں کے اتحاد کے ہر مرکز کو منتشر اور کمزور کر کے نیا ورلڈ آرڈر بنانے کا ایجنڈہ جاری و ساری ہے۔

1914ء میں پہلی عالمگیر جنگ چھڑی اور اس کا اصل ذمہ دار جرمنی تھا مگر جنگ کے اختتام پر نزلہ گرا تو عالمِ اسلام پر یعنی فاتحین نے نیا ورلڈ آرڈر تشکیل دیتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کے طاقتور مرکز ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں بنا کر مسلم یکجہتی کے اسلامی نظریئے کو بحیرہ روم اور خلیج میں غرق کر دیا حالانکہ ترکی مردِ بیمار کی حیثیت سے دنیا میں روشناس تھا مگر وہ مسلمانوں کے علامتی مرکز اتحاد سے پریشان اور خوفزدہ تھے۔ غرض نئی چھوٹی مسلم ریاستوں میں علاقائی، نسلی اور لسانی تعصبات پروان چڑھائے گئے تاکہ مسلم اتحاد اور حتیٰ کہ غیر مسلموں کے ساتھ بے لاگ انصاف اور نیک سلوک جو ہماری طاقت اور مقبولیت کے اصل اجزاء تھے، ان سے محروم ہو کر کمزور اور بدنام ہو جائیں۔ اس صورتحال کی سنگینی کا احساس برصغیر کے مسلمانوں کو ہوا اور انہوں نے دورِ غلامی میں ہونے کے باوجود تحریکِ خلافت اتنے زور و شور اور نیک جذبے کے ساتھ چلائی کہ تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ بہرحال ایک کمزور نظامِ خلافت مسلم امہ کا نام لیوا تھا لیکن اس کو ختم کر کے مذکورہ نئے ورلڈ آرڈر کے جو تباہ کن اثرات مسلم ممالک اور ملتِ اسلامیہ میں اندرون و بیرونی طور پر رونما ہوئے، وہ نہ صرف تاریخ کا المناک اور تاریک باب ہے بلکہ اسی کے سبب ہم آج کے بدترین نتائج سے بھی دوچار ہیں۔

دوسرا واقعہ تھا 1940ء کی دوسری عالمگیر جنگ کا جس کا ذمہ دار بھی جرمنی تھا۔ اس جنگ کے فاتحین بھی نیو ورلڈ آرڈر لائے جس کا نزلہ پھر عالمِ اسلام پر ہی گرا حالانکہ چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں نے جرمنی کے خلاف اتحادی افواج کی ہی حمائت کی تھی۔ دراصل صہیونی عناصر کی آنکھوں میں مشرقِ وسطیٰ اس لئے کھٹک رہا تھا کہ اگرچہ وہاں مسلمانوں کی متحدہ سلطنت نہ رہی تھی لیکن پھر بھی وہاں مسلمانوں ہی کی ریاستیں تھیں۔ انہوں نے ماہرانہ حکمتِ عملی سے مغرب کو مسلمانوں کے خلاف مشتعل کیا اور کہا کہ اس علاقے میں جو تیل نکلنے کے سبب پورے مغرب کی اقتصادی شہ رگ بن جائے گا وہاں اپنے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ساتھی اسرائیل کی ریاست قائم کر دی جائے۔

افسوس مغرب پھر صہیونی طاقتوں کے پروپیگنڈے کا شکار ہو گیا' اس نے کروڑوں مسلمانوں سے مفاہمت کرنے کی بجائے چند لاکھ یہودیوں کے منصوبے کو عملی جامہ پہنا کر مشرقِ وسطیٰ کو آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا کر دیا۔ یعنی دوسری عالمگیر جنگ کے بعد نیا ورلڈ آرڈر اس طرح لایا گیا کہ فلسطین میں باہر دور دراز ممالک سے یہودیوں کو لا کر اسرائیل کی مملکت بالجبر قائم کر دی گئی۔ اس کا ہی نتیجہ تھا کہ مسلم ممالک بے حد و حساب وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود اسرائیل کے ہاتھوں آئے دن انسانیت سوز ظلم و بربریت اور جارحیت کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اسرئیل نہ صرف بیت المقدس اور گولان کی پہاڑیوں پر ناجائز قابض ہے بلکہ اس کے عظیم تر اسرائیل کے نقشے میں مدینہ منورہ اور مسلم ممالک کے کئی علاقے بھی شامل دکھائے جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس دوسرے ورلڈ آرڈر کا ہی دوسرا حصہ تھا کہ ''ون مین ون ووٹ'' کے عالمی اصول جمہوریت کے ذریعے اکھنڈ بھارت بنا کر برصغیر کے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے مغلوب کر لیا جاتا لیکن علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی دور اندیشی اور حکمتِ عملی سے وہ پاکستان بنانے پر تو راضی ہو گئے مگر اس کو ناکام بنانے کی خاطر پاکستان سے آدھا پنجاب اور آدھا بنگال چھین لیا گیا اور مسلم اکثریت کا علاقہ گرداسپور کو بھارت کے حوالے کر کے بھارت کے لئے یہ راہ ہموار کر دی گئی کہ وہ آسانی کے ساتھ جموں و کشمیر کی ریاست پر قبضہ کر لے اور اس طرح کشمیر کے مسلم عوام اور پاکستان کی بھارت سے خونریز جنگ ہوتی رہے اور پاکستان کی اقتصادیات تباہ ہو جائے۔

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ خلیج کی جنگ اور اس کے نتیجے میں پاکستان سمیت عالمِ اسلام کو ہی پھر ایک نئے ورلڈ آرڈر کا سامنا ہے۔ اس میں بھی مسلم ممالک کو ہدف' کمزور اور بھارت و اسرائیل کو طاقتور بنایا جا رہا ہے۔ خلیج کی مسلم ریاستوں اور پاکستان نے مغربی افواج یا تکنیکی ماہرین کو مدعو کر کے غیر معمولی مفاہمت کا مظاہرہ کیا مگر وہ پھر بھی ان مسلم ممالک سے خوفزدہ ہیں اور ان کو کمزور کرنے میں دن رات کوشاں ہیں۔ بھارت اور اسرائیل کو نہ صرف نوازا جا رہا ہے بلکہ کھلی چھٹی ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کے انبار لگاتے رہیں اور مسلم ممالک بالخصوص پاکستان پر شدید دباو ہے کہ وہ اس کیری لوگر بل کی مجوزہ شرائط کے مطابق خود اپنے وسائل بھی ایٹمی ترقی کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ دوسری جانب پاکستان اگر روسی افواج کی افغانستان آمد کے خلاف سینہ سپر نہ ہوتا تو خود مغرب کو پورا یقین تھا کہ خلیج میں ان کی اقتصادی شہ رگ سوویت یونین کے شکنجہ میں چلی جاتی اور اس طرح امریکا کی بجائے سوویت یونین بڑی سپر پاور ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ پھر بھی پاکستان پر بھارت اور اسرائیل کو ترجیح کیوں دی جا رہی ہے؟ یہ غیر متنازع اور اٹل ماحصل ہے کہ آج پورا عالمِ اسلام بالخصوص پہلی مسلم جوہری طاقت پاکستان چاروں جانب سے سنگین خطرات کی زد میں ہے۔ مشرق میں بھارت' مغرب میں افغانستان' شمال میں کشمیر اور جنوب میں مشرقِ وسطیٰ کی دھماکہ خیز صورتحال کا سامنا ہے۔

اس جائزے کے بعد سوال یہ ہے کہ ہم خود کو اس کالی آندھی سے کس طرح بچا کر لیجائیں؟ اب عالمِ اسلام اور وطنِ عزیز کے لئے مسئلہ نشاطِ ثانیہ کا نہیں بلکہ اپنے وجود کی بقاء کا ہے۔ ہمیں اس چیلنج کے جواب میں دشمنی اور نفرت سے نہیں بلکہ اس گمشدہ طاقت ''خلافت'' کو بحال کرنا ہو گا جو پہلے ورلڈ آرڈر

میں ہماری نااتفاقی کے سبب چھین لی گئی تھی۔ مسلم تاریخ کا باریک بینی سے جائزہ لیں تو ہمارے زوال کا بنیادی سبب ایک ہی نظر آتا ہے کہ حکمتِ عملی کی راہ سے قطعی ناواقفیت تھی یا سادہ لوحی میں عمل نہیں کیا۔ ربّ کریم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ ''دشمن اپنی چالیں چل رہے ہیں اور اللہ اپنی چال' اور اللہ کی چال سب سے بہتر ہے۔'' اسلامی تاریخ میں اسلحہ اور افراد کی کمی یا برتری کوئی فیصلہ کن سبب نہیں رہا ہے بلکہ بہتر حکمتِ عملی ہاری ہوئی بازی بھی پلٹ سکتی ہے۔

افسوس! ہم سازگار وقت پر خاموش رہے اور دشمنوں پر اعتماد کیا جبکہ ناسازگار حالات میں مقابلہ کیا۔ ہمارے قائدین سادہ لوحی یا ناسمجھی میں ڈھیل دیتے چلے آرہے ہیں۔ جب دباؤ کیلئے ناسازگار وقت ہوتا ہے 'میدان میں کود پڑتے ہیں' اس طرح مقابلے کا 90 فیصد فیصلہ اسی وقت ہو جاتا ہے۔ قائدِاعظم کی تاریخ ساز کامیابی کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ وقت اور حکمتِ عملی کے بہترین نبّاض تھے 'وہ سطحی سیاست کے ذریعے کرۂ ارض کی بالکل نئی پانچویں بڑی مملکت کے بانی نہیں بنے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہر فرد اور ہر قوم کو سازگار موقع فراہم کرتا ہے اور موقع کا بروقت استعمال یا ضائع کرنا ہی فتح و شکست ہے۔

اسلام کا اصول یہ ہے کہ پہلے خود اور پھر اپنے گھر کو درست کرو تو پھر بعد میں تمہاری دعوت اور جدوجہد کو عالمگیر سطح پر قبولیت حاصل ہوتی ہے لہٰذا اہلِ پاکستان کا اوّلیں اور فوری ہدف قومی یکجہتی کا حصول ہونا چاہئے جس کے بغیر ہماری تمام دیگر صفات' وسائل اور کاوشوں کی کامیابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حکمراں اور دیگر تمام سیاسی جماعتیں سمجھ لیں کہ ان کے تمام ایجنڈے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے جب تک وہ اس کیری لوگر بل اور این آر او سے جان نہیں چھڑا لیتے۔ کیری لوگر بل کے ذریعے نیو ورلڈ آرڈر کا ایجنڈا مسلط کیا جارہا ہے۔ ہماری موجودہ حکومت نے کیری لوگر بل کو کابینہ میں منظور کر کے گویا قوم سے اپنا ناطہ قطعی توڑ لیا ہے اور اب اس پر مستزاد این آر او کو منظور کروانے کے لئے اپنے تمام اراکین اسمبلی کو ملک کے اندر رہنے کا حکم صادر اس لئے کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی نئی آئینی ترامیم لانے کی تیاری میں مصروف تھے لیکن پانسہ پلٹنے پر اس ارادہ کو موخر کرنا پڑا۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کا سبق نہ تو نیو ورلڈ آرڈر مسلط کرنے والوں کو یاد ہے اور نہ ہی ان کی کاسہ لیس حکومتوں کو کہ جس ملک میں امریکا کا اثر و نفوذ قلعوں کی تعمیر اور پرائیویٹ سیکورٹی عسکری ایجنسیوں (بلیک واٹر) کی موجودگی تک آن پہنچے وہاں اس کی موجودگی کے دن گنے جا چکے ہوتے ہیں۔ ان کے ذلیل و رسوا ہو کر نکلنے کا موسم قریب آجاتا ہے اور پھر وہ قلعہ نما عمارتیں ہی ان کا آخری مدفن بن جاتی ہیں اور کاسہ لیس غلام تو ایسی عمارتوں کی دھول کے نیچے ہی عبرت کا نشان بن جاتے ہیں۔ پاکستان اور عالم اسلام اس وقت سنگین چیلنجوں سے دوچار ہیں ان سے نمٹنے کے لئے ہمیں اپنے اندر ان ایجنڈوں سے نجات حاصل کرنا ہوگی جو نیو ورلڈ آرڈر کے تحت ہم پر مسلط کئے گئے ہیں۔ ہمیں مغرب کے ان صاف ذہن' انسانیت دوست اور امن پسند دانشوروں کو بھی ان خطرات سے آگاہ کرنا ہوگا جو اس دنیا کو کسی بڑے خطرے میں مبتلا نہیں دیکھنا چاہتے اور انہیں اس بات کا یقین دلانا ہوگا کہ ہمارا ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔ جس طرح ہم ان کے کسی بھی اندرونی معاملات میں مداخلت کے حق میں نہیں اسی طرح ہم بھی ان سے یہی خواہش اور امید رکھتے ہیں۔ وہ اپنے ملک اور عوام کے لئے جس نظامِ زندگی کو بہتر سمجھتے ہیں' یہ ضروری نہیں کہ وہ کسی دوسرے ملک یا معاشرے کے لئے اتنا ہی فائدہ مند ہو۔ ہمیں ان کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ ماضی میں ہم نے ان کا ہمیشہ ساتھ دیا ہے اور آئندہ بھی ان کو ہم سے کوئی خطرہ نہیں لیکن اس کے لئے ان مغربی ممالک اور امریکا کو بھی عملی یقین دہانی کے طور پر فوری عراق اور افغانستان سے اپنی افواج کو نکالنا ہوگا اور ان تمام مسلمان ملکوں کو ان جنگوں میں جو نقصان ہوا ہے اس کی بھی

تلافی کرنا ہو گی۔

عالمِ اسلام کو فوری طور پر ''او آئی سی'' کا اجلاس بلا کر اپنے اسی کھوئے ہوئے ''نظامِ خلافت'' کو قائم کرنے کے اعلان کے ساتھ ایک خلیفہ مقرر کرنا چاہئے۔ ضروری نہیں کہ وہ لمبی داڑھی اور عباوالے ہوں' آخر قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی شکل ولباس اپنی جگہ لیکن ان کے کردار نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو متحد کرنے کا کارنامہ تو انجام دیا تھا۔

یہ جامہ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا
مہلت ہی نہ دی فیض کبھی بخیہ گری نے

بروز ہفتہ ۱۹ ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۷ نومبر ۲۰۰۹ء

اقبالؒ کی یاد رسم یا وسیلہ فکر

اسلام کو علامہ اقبالؒ نے دورِ حاضر میں ایک ایسے ضابطہ حیات کی حیثیت سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے جس میں فکری، علمی اور عملی ہر حیثیت سے ہر دور میں انسان کی ہدائت کی صلاحیت اور توانائی موجود ہے۔ انہوں نے اسلام کو ایک زندہ نظامِ حیات کی حیثیت سے پہلے خود از روئے ایمان و علم سمجھا اور پھر اسی فکر کو اپنے فن کے وسیلے سے عام کرنے کی جہدِ مسلسل میں مصروف ہو گئے۔ شعرا کے افکار کے بارے میں عام طور پر ایک تاثر یہ ہوتا ہے کہ ان میں کشش تو ہوتی ہے لیکن زندگی کے حقائق کا مقابلہ کرنے کی تاب و توانائی عطا کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اس کلئے کو غلط ثابت کر دیا۔ وہ بہت بڑے شاعر تھے، اسی سطح کے مفکر بھی تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی عطا کہ انہوں نے اپنے فکر و فن کو کلیتاً اپنے ایمان کی توانائی کے تابع کر لیا تھا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں پاکستان کے قیام کا واقعہ غیر معمولی اہمیت کا واقعہ ہے اور قیامِ پاکستان میں فکرِ اقبال کی توانائی اور قائدِ اعظمؒ کی قیادت کی صداقت اور دیانت نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کو آزمائشوں سے گزرنا پڑا لیکن وہ آزمائشیں ان کے لئے پست ہمتی کا نہیں بلکہ عزمِ تازہ پیدا کرنے کا وسیلہ بنتی چلی گئیں۔ مسلمانوں میں دینی شعور بیدار رکھنے میں علماء، اہل علم و دانش اور سیاسی رہنماوں سمیت موثر اور مثبت کردار سب نے ادا کیا ہے لیکن منزل کا تعین کرنے اور پھر جذبہ ایمان کے تحت وحدت فکر و عمل کے وسیلے سے اسے حاصل کر لینے میں فکرِ اقبالؒ کا بڑا کلیدی کردار ہے۔ اقبالؒ بہت بڑے شاعر اور اسی سطح کے مفکر بھی تھے۔ ان کے خطبات نے خصوصاً خطباتِ مدارس نے ہماری فکری بیداری کی تاریخ میں بہت موثر کردار ادا کیا ہے، اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اقبالؒ کی قلبی بے قراری کا ان کے فکر و فن میں بھرپور اظہار موجود ہے!

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

ان کی بے چینی محدود نوعیت کی نہیں تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے بھرپور مادی ارتقاء کے مراحل طے کرنے والا انسان اس حقیقی روشنی سے محروم ہے جو اسے رازِ حیات سے آشنا کرتی ہے۔

ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
انہی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

دورِ حاضر کے انسان کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ

ہو فکر اگر خام تو آزاد یا فکار انساں کو حیران بنانے کا طریقہ

ایمانی توانائی نے اقبالؒ کو ساری انسانیت کے لئے فوز و فلاح کا اندازِ فکر عطا کیا تھا لیکن اس کے لئے ایک عملی مثال کی بھی ضرورت تھی اور وہ از روئے ایمان یہ سمجھتے تھے کہ انسانیت کو اسلام کے سوا کہیں اور امن و سلامتی نہیں مل سکتی' اسی لئے دورِ حاضر میں ایک ایسے نظامِ اجتماعی کے قیام کے آرزومند تھے جو بلا مذہب و ملت ساری انسانیت کے لئے امن و سلامتی کا وسیلہ بن جائے اور اس مقصد کے لئے برصغیر میں مسلمانوں کی ایک آزاد و خود مختار حکومت کے قیام کی آرزو ان کا مقصد بنی کیونکہ انہیں اس حقیقت کا ادراک تھا۔ لیکن اسلام کی وحدت خیر قوت کا بہترین اظہار برصغیر میں ہوا ہے۔ اقبالؒ کی فکر و فن کی بنیاد کیونکہ ایمانی توانائی پر تھی اس لئے اس میں بڑا گہرا داخلی ربط پایا جاتا ہے۔ وہ احترامِ آدمیت کے علمبردار ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امکانی طور پر ہر پیدا کیا۔ اس اصول کے تحت وحدتِ نسلِ انسانی پر ایمان ضروری ہو جاتا ہے اور مردہ فکر و عمل جو اس وحدت کے ''قابلِ تکریم'' انسان کو محض آزاد ہی برعکس ہیں وہ باطل طاقتوں کے مقاصد کی تکمیل کا وسیلہ بن جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ محض جذباتی بنیاد پر اسلام سے وابستہ نہیں' وہ وابستگی گہرے علم اور تاریخی شعور کی بنیادوں پر ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بالکل درست کہا ہے کہ اسلام مذہب نہیں ہے بلکہ ایک ریاست ہے اور غور کیا جائے تو یہ بنیادی اہمیت کی بات ہے۔ دنیا کے دیگر مذاہب کے ماننے والے زندگی کے سارے معاملات کو اپنے مذہبی عقائد سے الگ رکھتے ہیں' یہ ان کی مجبوری ہے۔ ان افکار و اعمال سے جن کو وہ مذہب کی بنیاد سمجھتے ہیں' ان لوگوں کو زندگی کے معاملات اور مسائل میں کوئی رہنمائی نہیں ملتی' اس لئے انہوں نے زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا ہے' مذہب الگ اور ریاست الگ! یہ روش غیر مسلمانوں کے لئے درست ہو سکتی ہے لیکن مسلمانوں کے لئے ہرگز درست نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہادی برحق رسول کریم ﷺ نے اسلام کو ایک مکمل ریاستی نظام کی صورت میں عطا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں پیشوائیت نہیں ہے کیونکہ جہاں پیشوائیت ہو گی وہاں سیکولرازم لازمی طور پر آئے گا۔

معاشرتی زندگی نظامِ حکومت کے بغیر بسر نہیں ہو سکتی۔ قائدِ اعظمؒ نے جب یہ کہا تھا (اسلام میں کوئی پیشوائیت نہیں ہے) تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اسلام میں مذہبی پیشوائیت کا الگ کوئی تصور نہیں ہے بلکہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہونے کی حیثیت سے ایک نظامِ ریاست بھی ہے۔ یہ حقیقت اسلام کے نظام کی تفہیم پر مبنی ہے اور اقبالؒ کے خطبات اور ان کی شاعری دونوں میں اس کی بھرپور جھلک موجود ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے علامہ اقبالؒ کے لئے (مائی فرینڈ، گائیڈ اینڈ فلاسفر) "میرے دوست رہنما اور فلاسفر" کے جو الفاظ استعمال کئے تھے وہ حقیقی مفہوم رکھتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہم سب پر چند خصوصی ذمہ داریاں عائد ہو گئیں ہیں۔ قیامِ پاکستان کوئی تاریخ کا ''حادثہ یا اتفاق'' نہیں ہے۔ اس ملک کا قیام دورِ حاضر میں حقیقی معنوں میں عالمگیر سطح اسلام کے احیاء کی علامت ہے۔

یہی ہماری توانائی بھی ہے اور یہی ہمارے مسائل کا سبب بھی۔ ہمیں اس حقیقت کو اور اس کے پس منظر میں اپنی ذمہ داریوں کو نہ صرف سمجھنا بلکہ ہمہ وقت ہر سطح پر اپنے پیشِ نظر بھی رکھنا چاہئے۔ ہمارے فکری' علمی اور تاریخی اثاثے بہت ہیں۔ ایسی دولت دنیا میں کسی دوسری قوم کو میسر نہیں اور اس

دولت کی خصوصیت میں ہے کہ وہ تاریخ کا حصہ نہیں، ہر دور میں ہمارے فکر و عمل کیلئے مہمیز کا کام کر سکتی ہے۔ خود پاکستان کا قیام، اس کا استحکام اور اس کی علاقائی اور جغرافیائی اہمیت اس حقیقت کا سب سے بڑا واضح ثبوت ہے۔

علامہ اقبالؒ کا یومِ پیدائش یا یومِ وفات ہمارے لئے ایک محض رسم کی ادائیگی کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ رسم بھی اہم ہوتی ہے کیونکہ وہ حقیقت تک پہنچنے میں وسیلہ بنتی ہے لیکن یہ بات ہمارے لئے توجہ کا سبب بننی چاہئے کہ قائداعظمؒ، علامہ اقبالؒ اور دیگر زعماء کی یادیں رسم کیوں بن رہی ہیں۔ جس طرح ہم اپنی جسمانی صحت کا خیال رکھتے ہیں ہمہ وقت اسی طرح ہمیں اپنی ''ایمانی صحت'' کا خیال بھی رکھنا چاہئے، کیونکہ ایمان کے بغیر انسان اور حیوان کے جسدِ خاکی ایک جیسے ہوتے ہیں۔

رہے نام میرے رب کا جس نے عزت کا معیار تقویٰ میں رکھا ہے!

یہ افسردہ اور پریشان بابا اقبال کہاں یاد آ گئے!

آزاد کی رگ سخت ہے مانند رگ سنگ　　محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگ تاک

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید　　آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طرب ناک

کاروانِ فکر لندن کی دعوت پر ''فکرِ اقبال'' کے عنوان سے یومِ اقبال پر خصوصی لیکچر

بروز سوموار ۲۱/ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۹ نومبر ۲۰۰۹ء

آزادی رخصت ہو چکی؟

باباجی بلند پایہ استاد ہیں' ان کی شہرت صرف تقریر و تحریر پر ہی موقوف نہیں بلکہ وہ دانشوروں' قانون دانوں اور ادیبوں میں بھی ایک خاص عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان سے جب بھی ٹیلیفون پر یا کسی پروگرام میں ملاقات ہوتی ہے وہ ذہن میں کسی نہ کسی نئی سوچ کا بیج بو دیتے ہیں اور یہ بیج آہستہ آہستہ ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔ آج ان کا ٹیلیفون آیا تو پہلی مرتبہ مجھے کچھ آزردہ اور پریشان محسوس ہوئے۔ فرمانے لگے ''میں ہر روز ارضِ پاکستان میں سچ اور آزادی تلاش کرتا ہوں لیکن مجھے آزادی ملتی ہے نہ ہی سچ'' میں نے بڑی حیرت سے ان سے سوال کیا کہ آپ اس سے پہلے کبھی بھی اس قدر دل گرفتہ نہیں ہوئے تو آج اس کی کیا وجہ ہے؟ دوبارہ گویا ہوئے کہ ''سچ کسی نہ کسی کونے' کسی نہ کسی تہہ خانے میں پڑا ہوگا' زخموں سے چور' لہولہان' آخری سانسیں لیتا ہوا لیکن پاکستانی معاشرے میں کسی جگہ نظر نہیں آتا۔'' میں نے دوبارہ عرض کیا ''اور آزادی؟'' فرمانے لگے ''وہ رخصت ہو چکی ہے!'' ٹیلیفون کسی وجہ سے بند ہو گیا اور میں اپنے بے چین دل کے ساتھ ہزاروں وسوں میں گھر گیا۔

باباجی کے الفاظ مسلسل میرا تعاقب کر رہے تھے' ایک ہتھوڑے کی طرح بری طرح دل و دماغ پر برس رہے تھے۔ ان کے الفاظ سے جڑیں اور کونپلیں نکلنا شروع ہو گئیں۔ حقیقتاً میری ارضِ پاک پر مروّجہ معاشرے میں سچ ختم ہو چکا ہے۔ آپ ڈاکٹر کے لہجے پر غور کریں' کیا اس میں سچ ہے' آپ دوا کے اجزاء کا پمفلٹ پڑھیں' کیا اس گولی یا کیپسول میں وہ تمام عناصر موجود ہیں؟ آپ مولوی کی تقریر سنیں' کیا اس تلقین اس دعوت کا پرتو اس کی اپنی ذات میں باقی ہے؟ آپ استاد کے فرمودات کا تجزیہ کریں' کیا اس کا فرمایا ہوا سچ ہے؟ آپ درسی کتب اور اخلاقی کتابوں کا لیبارٹری ٹیسٹ کریں' کیا یہ اخلاقیات' کیا درس و تدریس معاشرے میں نظر آتی ہے؟ آپ دانشوروں' ادیبوں' شاعروں اور صحافیوں کی تحریریں دیکھیں اور پھر ان کی ذات پر نظر ڈالیں' کیا ان کی گفتگو' ان کی نشست و برخاست میں ان کی تحریروں کے رنگ موجود ہیں؟

آپ سیاستدانوں کو دیکھیں' کیا جمہوریت کے نام پر منتخب ہونے والوں لوگوں کے انداز میں جمہوریت ہے؟ آپ کورٹ کچہری کو لے لیں' کیا لوگ انصاف کے منبر پر بیٹھ کر انصاف کر رہے ہیں؟ کیا لوگ سچ کا حلف اٹھا کر سچ بول رہے ہیں؟ آپ دوکانوں منڈیوں اور بازاروں میں جھانک کر دیکھیں' کیا بوریوں لفافوں اور تھیلوں میں وہی مال ہے جو بیوپاری گاہکوں کو دکھاتے ہیں؟ تو پھر سچ کہاں ہے؟ کوئی ہے جو ناپ تول اور بات میں کھرا ہو' جو حق کی گواہی دے سکے' جو جھوٹ کو جھوٹ کہہ سکے؟ یقین کیجئے میرے ملک پاکستان کا سچ کہیں گم ہو چکا ہے' اور رہی آزادی تو وہ پیدائشی حق جو میرا خدا ماں کے پیٹ میں مجھے عنائت کرتا ہے' وہ میری پہلی سانس' میری پہلی چیخ کے ساتھ ہی سلب ہو جاتا ہے۔ میں ایک آزاد' خود مختار اسلامی ملک کا باشندہ کہلاتا ہوں لیکن میری زندگی میں آزادی کا کوئی لمحہ کوئی لحظہ نہیں۔

اس ملک کا کوئی بھی باشندہ اب بھی کسی وقت غائب ہو سکتا ہے۔ اسے پاکستان کے کسی آزاد و خود مختار ائیر پورٹ سے جہاز میں ڈال کر مہربانوں کے حوالے اب بھی کر دیا جاتا ہے۔ کیا پاکستان کا آئین' کوئی قانون اور کوئی ضابطہ اس آزاد شہری کی حفاظت نہیں کر سکتا؟ کیا تعجب ہے کہ ایک ملک کی آزاد اور خود

مختار سرحدوں کے اندر ایک جابر فرعون داخل ہو کر ڈرون میزائل حملوں میں سینکڑوں معصوم اور بے گناہ شہریوں کے پرخچے اڑا دے لیکن اس ملک کا کوئی عہدیدار، کوئی شخصیت ان شہریوں کا خوں بہا تک نہ مانگ سکے!

میں پاکستان کے تمام عہدیداروں کو چیلنج کرتا ہوں، میں ابن فلاں، ابن فلاں، ذات کا موچی، نائی، تیلی، مصلی، لوہار، جولاہا، ترکھان، میرے ساتھ اس ملک میں ظلم ہو رہا ہے۔ وہ سارے حق حقوق جس کی گواہی میرا دین، جس کی ضمانت میرے ملک کا آئین، میرا قانون اور میرا معاشرہ دیتا ہے، وہ مجھے نہیں مل رہے؟ مجھے کوئی اتنا بتا دے میں ان حقوق کے لئے کس کے پاس جاوں۔ وہ عدالت، وہ شعبہ اور وہ محکمہ کہاں ہے جو میری بات سن لے اور مجھے کم از کم انصاف دلا سکے؟ یہ اس ملک کا المیہ ہے کہ اس ملک میں نلکے ہیں مگر پانی نہیں، اسکول تو ہیں مگر تعلیم نہیں، ہسپتال تو ہیں مگر ادویات نہیں اور صحیح علاج کی کوئی ضمانت نہیں، عدالتیں تو ہیں مگر انصاف نہیں، پارلیمنٹ تو ہے مگر جمہوریت نہیں، حکومت تو ہے مگر اختیار نہیں، آزادی تو ہے مگر آزاد لوگ نہیں!

پتھر کے زمانے میں بھی لوگ ایک غار، ایک کھوہ ایسی ضرور بناتے تھے جہاں دکھی، پریشان اور غم زدہ لوگ چھپ کر رو سکیں۔ بت پرستوں کے مندروں میں بھی انصاف اور عدل کا ایک بت ضرور ہوتا تھا، جنگل کے قانون میں بھی تھوڑی سی آزادی و خود مختاری ہوتی ہے لیکن یہ کیا معاشرہ، یہ کیا سماج ہے جس میں رونے کا کوئی غار اور انصاف کا کوئی دیوتا نہیں۔ جنگل میں شیر چوبیس گھنٹوں میں ایک بار شکار کرتا ہے اور ایک شکار کے بعد تمام جانور اطمینان سے پھرتے اور سکون کے ساتھ سوتے ہیں لیکن یہ کیسا جنگل ہے کہ خونخوار بھیڑیئے تو قوم کے دیئے ہوئے ٹیکس سے تعمیر محلات میں عیش کر رہے ہیں اور پوری قوم خوفزدہ بھیڑوں اور بکریوں کی طرح دن رات خوفزدہ ہے۔

اس قوم نے بڑی مشکل میں اپنا پیٹ کاٹ کر بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ گھاس کھا کر جوہری طاقت حاصل کی، سرحد پار سے آیا ہوا قصر سفید کا فرعون صہیونی اور مکار بنئے کو خوش کرنے کے لئے میرے ملک کو اس جوہری طاقت سے محروم کرنے کے لئے کھل کر میدان میں کود چکا ہے۔ وہ اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ کس طرح پاکستان کی حساس تنصیبات کے قریب کوئی دہشتگردی کی کوئی ایسی واردات ظاہر کر دی جائے جس کی ساری ذمہ داری حسبِ معمول فوری طور پر رحمان ملک طالبان پر ڈال دیں تاکہ امریکا کو ان تنصیبات کی محافظ افوجِ پاکستان کا بازو مروڑنے کا موقع مل جائے۔ اسی سلسلے میں دو ہفتے قبل کہوٹہ کی سیکورٹی پر مامور افراد نے چار یا پانچ ایسے لوگوں کو پکڑا جو ممنوعہ علاقے میں ایک گاڑی میں انتہائی حساس آلات کے ساتھ کسی بہت بڑی واردات کی نیت سے گھوم رہے تھے۔ ان کے پاس انتہائی حساس قسم کا اسلحہ اور گرینیڈ بم کی ایک بھاری تعداد موجود تھی۔ وہ آپس میں پشتو میں بات کر رہے تھے مگر گرفتاری کے بعد معلوم ہوا کہ وہ سب امریکی تھے، جو اپنی اس مشکوک سرگرمی کا کوئی جواز نہ بتا سکے۔

اس سارے واقعے میں سب سے زیادہ افسوس ناک اور دل دہلا دینے والی بات یہ ہے کہ جب تھانہ مارگلہ کے علاقے سے طالبان کے روپ میں پکڑے

جانے والے یہ سارے امریکی گرفتار کر کے ابھی تھانے میں پہنچے ہی تھے کہ وہاں ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر ایک بہت بڑے حکومتی عہدیدار کی سفارش پر ان سب کو چھڑا کر لے گیا۔ تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا کہ یہ تمام امریکی افراد میرے ملک میں نہ صرف غیر قانونی طور پر قیام پذیر ہیں بلکہ اس قدر طاقتور بھی ہیں کہ اس ملک کے حکمران بھی ان کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتے۔ کیا ان حکمرانوں کو اسی لئے ملک میں این آر او کے تحت درآمد کیا گیا تھا کہ یہ طاغوتی طاقتیں میرے ملک کی سلامتی کو اپنے منحوس ہتھکنڈوں سے ختم کر دیں؟ کیا واقعی ہم اپنی آزادی کھو چکے ہیں؟ خاکم بدہن! کیا بابا جی نے درست فرمایا کہ ہماری آزادی رخصت ہو چکی ہے!

رہے نام میرے رب کا جو ان شیاطین کے مقابلے میں بہترین چالوں کا مالک ہے!

افتاد شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا پُر دم ہے اگر تُو، تو نہیں خطرہ

بروز بدھ ۳۲ ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۱۱ نومبر ۲۰۰۹ء

نام و نسب کی گالیاں

ایک ہزار ایک راتوں تک کہانی کہنے کا فن عربوں نے ایجاد کیا۔ وہ فن جس کی معراج الف لیلیٰ کی داستان ہے۔ کہانی میں سے کہانی نکلتی ہے اور کردار سے کردار جنم لیتے ہیں' ایسے کردار جو آج بھی زندہ ہیں اور پوری دنیا کی ضرب المثل اور کہاوتوں میں نظر آتے ہیں۔ الف لیلیٰ کا یہ داستانی ادب اس تہذیب کا عکاس ہے جو اپنے زمانے کے سب سے متمدّن شہر بغداد میں جلوہ گر تھی' عباسیوں کے سنہرے دور کی یادگار۔ الف لیلیٰ کی یہ کہانیاں ایک بادشاہ شہریار کے ایک فیصلے سے جنم لیتی ہیں شہریار کا یہ خیال تھا کہ دنیا کی تمام عورتیں بے وفا اور ناقابل اعتبار ہیں۔ یوں وہ اپنی شادی کی پہلی رات ہی اپنی بیوی کو قتل کر دیتا' یہ سلسلہ تین سال تک چلتا رہتا ہے۔ بادشاہ کا ایک وزیر ہے جو اس کے لئے لڑکیاں ڈھونڈتا ہے تاکہ وہ ان سے شادی کر سکے۔

لیکن ایک دن وہ بے بس ہو جاتا ہے اور اسے اس ظالمانہ کاروائی کے لئے کوئی لڑکی نہیں ملتی۔ اپنی اس پریشانی کا ذکر وہ اپنی بیٹی شہرزار سے کرتا ہے۔ شہرزار اپنے باپ کو اس پریشانی سے بچانے کے لئے کہانی سنانے پر رضامند ہو جاتی ہے اور پھر پہلی رات وہ ایک بیل اور گدھے کی کہانی شروع کرتی ہے اور اس میں سے دوسری کہانی جنم لیتی ہے اور صبح کی اذان ہو جاتی ہے اور اس کی جان بچ جاتی ہے۔ یوں وہ ایک ہزار ایک راتوں تک کہانی سے کہانی نکال کر سناتی رہتی ہے جن میں علی بابا چالیس چور سے لیکر چہار درویش' سوتے جاگنے کی کہانی سے لیکر الہ دین اور طلسماتی چراغ تک سب کا ذکر آتا ہے۔ کردار جنم لیتے ہیں اور پھر دنیا کے ہر معاشرے' تہذیب و تمدّن تک پھیل جاتے ہیں۔ ان کہانیوں کے کرداروں میں سے ایک کردار سند باد کا بھی ہے۔

ایک غریب لکڑہارا جو اپنے اللہ کی مہربانیوں سے بہت بڑا تاجر بن جاتا ہے جس کے جہاز سات سمندر ہر وقت سفر میں رہتے ہیں۔ جو اپنے معرکوں اور کارناموں کی وجہ سے پورے بغداد میں مشہور ہے۔ سند باد کے سفر کی کہانیاں دنیا بھر کے ادب کا نچوڑ ہیں۔ دنیا کی شائد ہی کوئی ایسی زبان ہو جس میں ان کہانیوں کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ سند باد کے کردار پر ہالی وڈ میں فلمیں بننے کا آغاز ۱۹۴۰ء میں ہوا جب اس پر پہلی فلم ''بغداد کا چور'' بنی اور پھر اس پر طرح طرح کی کردار نگاریاں کی گئیں۔ کارٹون فلمیں بنیں۔ بچوں کے لئے بے شمار کہانیاں تخلیق اور ری گئیں' اسے ''پوپائی دی سیلر'' سے ملایا گیا۔ جادوئی قالین پر اڑایا گیا' اسے ملکوں ملکوں پھرایا گیا' لیکن ان تمام فلموں' کہانیوں' کارٹونوں میں کبھی بھی اس سے اس کا شہر بغداد' اس کا مذہب اسلام' اس کا رسول ﷺ اور اس کا خلیفہ ہارون الرشید اس سے نہیں چھینا گیا' اسے وضع و قطع میں عرب ہی رہنے دیا گیا اور اسے مسلمان ہی بتایا گیا۔

لیکن گزشتہ کئی سالوں سے ہالی وڈ اور دوسرے مغربی ممالک بچوں کے لئے جو فلمیں بنا رہے ہیں ' ان فلموں میں مسلمانوں سے ان کی شناخت اور پہچان کے ہر حوالے کو چھیننے والوں نے ان فلموں میں سند باد کو یونان کے شہر سارائیکورس کا رہنے والا بتایا ہے' جو وہاں کے دیوی دیوتاؤں کو مانتا ہے اور اسی شہر کے حاکموں اور رئیس گھرانوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ جن لوگوں کی مسلمانوں سے نفرت کا یہ عالم ہو کہ وہ قصے کہانیوں میں' خیالی اور ماورائی کرداروں میں جو صدیوں سے لوگوں کے گھروں

میں نسل در نسل چلے آرہے ہوں، مسلمان کا نام، ان کے شہروں کا تذکرہ، ان کی بتائی ہوئی حمد اور شکر کا ذکر سننا برداشت نہ کریں، جن کی پوری توانائی اس بات پر خرچ ہو رہی ہو کہ مسلمانوں کے نصابِ تعلیم سے، ان کے کھیل کود سے، ان کی زندگی کے خوابوں سے وہ تمام ہیرو کھرچ کر پھینک دیں، جو انہیں ایک ملتِ اسلامیہ کے رشتے میں پروتے ہیں، وہ کیسے برداشت کر سکتے تھے کہ علی بابا چالیس چور، الہ دین یا سند باد اس بغداد کا ذکر کرے جہاں ہر روز ان کے فوجیوں کو خاک چاٹنا پڑ رہی ہے اور امریکا اور مغرب کے کسی ہوائی اڈے پر رات کے سناٹے میں خاموشی کے ساتھ ان فوجیوں کے تابوت اتار کر ان کے لواحقین کو اس شرط کے ساتھ حوالے کئے جاتے ہیں کہ اس کی کوئی تشہیر نہ ہونے پائے۔

وہ کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ لوگ اس امن و سلامتی کے ضامن دین کی بات کریں جسے وہ پچھلے سو سال کے پروپیگنڈے سے دہشتگرد ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس سب کے باوجود بھی مجھے بالکل کوئی حیرت نہیں ہوتی، اس لئے کہ یورپ اور امریکا نے تو ایسا کرنا ہی تھا۔ مجھے حیرت صرف اپنے لوگوں پر ہے جو گنگ ہیں، چپ ہیں۔ سند باد ہماری تاریخ تھی، اس کا نام و نسب بدل دیا گیا۔ غیرت مند قومیں نام و نسب کی گالیاں نہیں سنا کرتیں لیکن کمال ہے ہمارے حکمرانوں کی غیرت نجانے کہاں کھو گئی ہے کہ جو ہمارے ساتھ یہ سلوک کرتا ہے ہم اسی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اپنی وفاداریوں کا اعلان کرتے ہیں اور دنیا بھر کے میڈیا کے سامنے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتے کہ ہمیں پاکستان میں جمہوریت کی مضبوطی کے لئے امریکا کی مدد درکار ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کل تک ہم یہ بھی کہہ دیں کہ الف لیلیٰ کا خالق توشکا گو میں پیدا ہوا تھا۔ ہیرو وارث شاہ کے رومانوی کردار تو اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے تھے اور اس کی تاریخ آکسفورڈ یونیورسٹی میں لکھی گئی، سسی پنوں ایریزونا کے صحراؤں کی داستان ہے جو ہارورڈ یونیورسٹی کے کسی پروفیسر کی تخلیق ہے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ بادشاہ شہریار تو ایک ہزار رات کہانی سنانے پر شہزادی شہرزار کی جان بخش دیتا ہے لیکن ہم دس ہزار رات بھی ان لوگوں کو اپنی وفاداری کی کہانی سنائیں، ہماری جان نہیں بخشی جائے گی۔ غیرت ہے تو اس حجلہ عروسی سے بھاگ جاؤ ورنہ صبح تک جلاد کی تلوار ہو گی اور آپ کا سر۔ لیکن شائد یہ تاریخ کا جبر ہے کہ انسان وقت سے سبق حاصل نہیں کرتا کیونکہ اس میں وقت بہت درکار ہوتا ہے۔ جب کمپنی کا سی ای او خود مارکیٹ میں اپنی پراڈکٹ فروخت کرنے کے لئے نکل آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی کا نمائندہ یا سیلز مین نالائق ہے اور کمپنی کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہوتا کہ ایسے نالائق سیلز مین کو فارغ کر دیا جائے۔ امریکی سفارتی تاریخ میں ہلری کلنٹن پہلی سیکرٹری خارجہ ہیں جو پاکستان کی مارکیٹ میں خود بہ نفسِ نفیس اپنی پراڈکٹ کی مقبولیت کے لئے میدان میں اتریں اور اپنی کمپنی ''امریکا'' اور اپنی خصوصی پراڈکٹ ''کیری لوگر بل'' کے بارے میں براہِ راست آگاہی حاصل کی۔ مارکیٹ نے ان کی کمپنی اور ان کے سیلز مینوں کے بارے میں اپنی رائے سے ان کو بڑے بہتر طریقے سے سمجھا دیا کہ اب ان ''شوگر کوٹڈ'' ری ایکشن "زہر کاری ایکشن" انہیں بھی بہر حال برداشت کرنا پڑے گا!

رہے نام میرے رب کا جو حی القیوم ہے!

بروز جمعۃ المبارک ۲۵ ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۱۳ نومبر ۲۰۰۹ء

قوّتِ عمل کی کمزوری

مسلمان افغان حکمران محمود غزنوی ۹۹۸ء میں تخت نشین ہوا تو ٹھیک ایک سال بعد ۹۹۹ء میں اس نے ہندوستان پر حملے کا فیصلہ کیا' اس نے اپنے سپہ سالار کو بلایا اور کہا کہ ہندوستان میں کفر کی حکومت ہے' افغانوں کے خلاف سازشوں کی خبریں بھی موصول ہو رہی ہیں' وہاں مال و دولت بھی ہے اور سرسبز شاداب میدان بھی ہیں' آپ کا کیا خیال ہے کہ ہمیں اس پر حملہ کرنا چاہئے۔ سپہ سالار نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر عرض کیا "سلطان! ہندوستانی بڑے خونخوار لوگ ہیں' مذہب کے نام پر کروڑوں جمع ہو جاتے ہیں' ہمارے ملکی حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں' کاشغر سے حملوں کی اطلاعات بھی موصول ہو رہی ہیں' چنانچہ ان حالات میں ہندوستان پر حملہ بے وقوفی اور نادانی ہو گی۔ سلطان آرزردہ ہو گیا اور حرم میں چلا گیا۔

اسی شام جب ایاز حاضر ہوا' سلطان کو اداس دیکھا تو کچھ عرض کرنے کی جسارت چاہی' سلطان نے اشارہ چشم سے اجازت دے دی' ایاز نے عرض کیا "حضور بادشاہ حکم کیا کرتے ہیں مشورے نہیں" سلطان کے چہرے پر حیرت پھیل گئی' ایاز نے بات جاری رکھی "سلطان! آپ صحیح اور غلط فیصلہ کریں اور یہ فیصلہ سنا دیں۔ فوجوں' سالاروں اور کارندوں کا کام حکم لینا ہے مشورے دینا نہیں' جب بادشاہ خادموں' کارندوں اور سالاروں کو مشورے دے گا تو اس کا مطلب ہے اس کی قوت عمل کمزور ہے' وہ تذبذب یا غیر سنجیدہ ہے۔" محمود کو ایاز کی بات میں وزن دکھائی دیا لہٰذا اس بار کمانڈروں کو طلب کیا اور ہندوستان پر حملے کا حکم دے دیا۔ ۱۰۰۰ء میں اس حکم پر عملدرآمد ہوا اور پھر محمود غزنوی ۱۰۲۶ء تک ہندوستان کو روندتا چلا گیا' وہ ہر کامیابی کے بعد ایاز کو تھپکی دیتا تھا اور کہتا تھا "اگر تم مجھے اس وقت سیدھی راہ نہ دکھاتے تو میں آج تک مشوروں میں الجھ رہا ہوتا"۔

کالا باغ کا مقام محمود غزنوی کے راستے میں پڑتا تھا' وہ یقیناً اپنی سپاہ کے ساتھ یہاں سے سترہ مرتبہ گزرا ہو گا لیکن اس نے کبھی یہ نہیں سوچا ہو گا کہ ایک ہزار سال کے بعد اس علاقے پر ایسے لوگوں کی حکومت ہو گی جو فیصلے کم اور مشورے زیادہ کریں گے' ایک طرف بھوک اور پیاس سے بلکتے رہیں گے اور دوسری طرف ملک میں قحط پیدا کر کے خود نفع بخش کاروباروں اور ڈیل کے ذریعے کمیشن حاصل کر کے غیر ملکوں میں اپنے خزانوں کے منہ بھرتے رہیں گے۔ ان ملکوں کے سربراہ صرف ایک آبدوز کی خریداری میں ۴۹ ملین ڈالر کمیشن وصول کریں گے اور ان کمیشن لینے والوں میں ملک کے صدر آصف زرداری کا نام بھی سرِفہرست ہو گا جن کے اکاونٹ میں لبنانی نژاد تاجر عبدالرحمان العصیر ۴۳ لاکھ ڈالر کی خطیر رقم بطور کمیشن سوئس اکاونٹ میں جمع کروائے گا۔ کالا ڈیم حقیقتاً ایک بدقسمت منصوبہ ہے۔ ایک ایسا منصوبہ جس پر پہنچ کر مضبوط سے مضبوط حکمران بھی مشوروں میں الجھ جاتا ہے اور پھر کالا باغ ڈیم جیسی حقیقت خوابوں کی دھند میں گم ہو جاتی ہے۔

آپ جنرل ضیاء الحق سے شروع ہو جائیں' انہوں نے پاکستان کے ایک منتخب حکمران ذوالفقار بھٹو کو معزول کرنے کے بعد ۹۰ دن کا قوم سے وعدہ کر کے بارہ سال گزار دیئے' آئین کا چہرہ بدلنے اور جمہوریت کی بکری پر آمریت کی سونڈ لگاتے وقت ایک لمحے کے لئے نہیں سوچا اور نہ ہی کسی سے رائے لی' فقط احکامات جاری کرتے رہے لیکن جب کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے فیصلے کا وقت آیا تو انہوں نے فرمایا "یہ مسئلہ قومی افہام و تفہیم سے حل ہو گا۔" اس منصوبے

کا پھر کیا حال ہوا ساری دنیا جانتی ہے۔ کالا باغ ڈیم جیسا ملکی مفاد کا بہترین منصوبہ پنجاب، سندھ اور سرحد کی عصبیتوں کے بھنور میں غرق کر دیا گیا اور ملکی افہام و تفہیم کے مشوروں کی سولی پر لٹکا دیا گیا۔

بے نظیر بھٹو اور ان کے شوہر نامدار آصف علی زرداری نے پورے ملک کی بجلی غیر ملکی کمپنیوں کے حوالے کر دی، کسی سے نہ پوچھا، کشمیر کے مسئلے کو بوری میں بند کر دیا، بھارت کے ساتھ انڈر گراونڈ تعلقات استوار کر لئے، کسی کو اعتماد میں نہیں لیا اور نہ ہی کسی سے مشورہ کیا لیکن جب کالا باغ ڈیم کا مرحلہ آیا تو وہ قوم کی عدالت میں چلی گئیں، عوامی رائے کے لئے مشورے کا جہنم سجا لیا۔

میاں نواز شریف کی ہیوی مینڈیٹ حکومت تھی، انہوں نے ملک کی ترقی کے نام پر موٹروے بنانا چاہی، باوجود لاکھ مخالفت کے موٹروے بن گئی، ایٹمی دھماکے کا فیصلہ کیا دنیا کی مخالفت اور شدید دباو کے باوجود دھماکے ہو گئے جس کا وہ آج تک بڑے تفاخر سے سینہ پھلا کر اپنی اس بہادری کا اعلان کرتے رہتے ہیں، واجپائی کو لاہور آنے کی دعوت دی، اس روز جو بھی شخص لاہور کی کسی سڑک، کسی گلی میں نظر آیا اسے پولیس نے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا، انہوں نے ان تمام فیصلوں کے لئے ریفرنڈم کروایا اور نہ کسی سے مشورہ کیا لیکن جب کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے فیصلے کا وقت آیا تو وہ بھی اسے قومی فورم پر لے گئے، انہوں نے اس مسئلے پر صوبائی موقف جمع کرنا شروع کر دیا اور اپنے ہیوی منڈیٹ کو ان مشوروں کی آگ میں جھونک دیا۔

کمانڈو جنرل مشرف کی باری آئی تو اس نے بھی اپنے پیش رو حکمرانوں کی طرح ویسی ہی منافقت سے کام لیا۔ صوبہ سندھ اور سرحد کے سیاسی قائدین سے فوجی وردی زیبِ تن کئے ہوئے اپیل کرتا ہوا یہ جنرل پنجاب کے لوگوں کے دل جیتنے کی اداکاری کرتا رہا۔ اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے قوم کو ہر آئے دن یہ مشورہ دیتا رہا کہ ''ہمیں ۵۰ سال کی آبی ضروریات پوری کرنے کے لئے ۴ آبی ذخائر کالا باغ، بھاشا، اسکردو اور اکوڑی ڈیم بنانا ہونگے، اگر ایسا نہ کیا گیا تو نہ صرف پاکستان کی معیشت متاثر اور برباد ہو جائے گی بلکہ غربت میں بھی بے پناہ اضافہ ہو جائے گا"۔

سوچنے کی بات ہے اگر ایک حکم سے ہیوی مینڈیٹ حکومت ختم ہو سکتی تھی، نواز شریف فیملی جلاوطن ہو سکتی تھی، نام نہاد ریفرنڈم ہو سکتا تھا، آئین میں ایل ایف او آ سکتے تھے، بغیر کسی مشورے کے ملک کے تمام ہوائی اڈے اور ملک کے تمام سیکورٹی ادارے امریکا کی چاکری میں دیئے جا سکتے تھے، اپنے ہی لوگوں کو امریکا کے ہاتھوں کروڑوں ڈالر کے عوض فروخت کیا جا سکتا تھا، خفیہ طور پر کشمیر کو اپنے آقاوں کے حکم کی تعمیل میں مکار بنئے کے حوالے کرنے کی سازش ہو سکتی تھی، امریکا کے حکم پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کے تعلیمی نصاب سے جہاد کے عنوان کو ختم کیا جا سکتا تھا، برسوں سے قائم نظام کے ڈپٹی کمشنر کے عہدے ختم ہو سکتے تھے، ناظم جیسی بلائیں جنم لے سکتی تھیں، اسمبلی کی نشستیں بڑھ سکتیں تھیں، الیکشن ہو سکتے تھے، احتساب ہو سکتا تھا، ایک حکم پر آئین معطل کر کے ملک کی ساری عدلیہ کو فارغ کر کے ان کو گھروں میں نظر بند کیا جا سکتا تھا، ایک آرڈیننس کے زریعے بدنام زمانہ این آر او جاری کر کے انصاف اور عدل کے منہ پر کالک تھوپی جا سکتی تھی تو پھر کالا باغ ڈیم کی تعمیر کے لئے مشوروں کی کیا ضرورت باقی رہ گئی تھی؟

جب اتنے بڑے بڑے فیصلوں پر قوم خاموش رہی، سرحد، سندھ اور پنجاب میں کوئی طوفان نہیں اٹھا تو کالا باغ ڈیم بننے پر کون سا زلزلہ آجاتا۔ جب ان فیصلوں پر قوم سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تو پھر کالا باغ ڈیم پر افہام و تفہیم کی کون سی ضرورت ان کا راستہ روکے کھڑی ہو گئی تھی۔ موجودہ حکومت نے تو کالا باغ ڈیم کی تعمیر کو منسوخ کر کے ایک قیامت ڈھادی اور اپنے اس فیصلے کے حق میں یہ دلیل دی کہ قوم اس متنازعہ ڈیم پر متفق نہیں اس لئے اس کو سرے سے ہی ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اب تک اس کالا باغ ڈیم پر جو اربوں روپے کے اخراجات اٹھے تھے اس کی پرواہ کئے بغیر کالا باغ ڈیم کی منسوخی کا حکم جاری کر دیا گیا۔

پی آئی اے میں بغیر کسی مشورے کے چھ ہزار سے زائد لوگوں کو ان کے پچھلے کئی برسوں کے واجبات کے ساتھ بحال کر کے اس کو دیوالیہ کر دیا گیا، پاکستان اسٹیل مل کو اپنے من پسند لوگوں کے حوالے کر کے لوٹ کھسوٹ کا ایسا بازار گرم کیا کہ اب کسی بھی دن اس کے دیوالیے کی خبر جاری ہو سکتی ہے۔ کیری لوگر بل کو پارلیمنٹ سے منظور کروانے کی بجائے عجلت میں کابینہ میں پیش کر کے قوم کو اس کی مکروہ شرائط کے ساتھ باندھ دیا گیا لیکن کالا باغ ڈیم بنانے کی بجائے ''کرائے کے بجلی گھروں'' کی منظوری دیکر ملک کے اربوں روپے ایک دفعہ پھر لوٹ لئے گئے اور قوم کو ایک دفعہ پھر آٹے چینی کی لائنوں میں کھڑا کر کے ملک کے اہم مسائل کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو گئے۔

لیکن کیا کیجئے ہم جب کالا باغ ڈیم کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ حکومت جنرل ضیاء الحق کی ہو یا ان کے بعد کسی بی بی، بابو یا کسی جنرل کی، ہر وہ کام جس میں حکومت یا حکمران طبقے کا مفاد ہو وہ تو چراغ رگڑنے سے پورا ہو جاتا ہے لیکن وہ منصوبے، وہ پراجیکٹ اور وہ کام جن میں عوام کی فلاح ہوتی ہے، جو ملکی سلامتی اور استحکام کے لئے ضروری ہوتے ہیں، ان پر مشورے اور اپیلیں ہی چلتی رہتی ہیں۔ وہ قومی فورموں اور افہام و تفہیم کے بازاروں میں دھکے ہی کھاتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ میرے اس خیال سے اتفاق نہ کریں لیکن ان سے میری اتنی درخواست ہے کہ وہ قومی اسمبلی کا ریکارڈ دیکھیں اور صرف اتنا بتائیں جب بھی اسمبلی کی مراعات اور تنخواہوں کی قرارداد پیش ہوئی، کوئی رکن اس کی مخالفت میں کھڑا ہوا؟ کوئی نہیں، وہ بھی نہیں جو ڈیم کے مسئلے پر ملک توڑنے کی دھمکی دیتے ہیں۔

بات اب سے بھی آگے بڑھ چکی ہے۔ امریکی نامور صحافی سیمور ش ہرش نے اپنے تازہ آرٹیکل میں جن خطرناک انکشافات سے ہمیں خبردار کیا ہے کہ کس طرح ہماری جوہری طاقت کو ختم کرنے کے لئے امریکی کمانڈو فورس پاکستان میں پہنچ چکی ہے اور اس معاملے میں پاکستان کی حکومت این آر او کے عوض امریکا کے ساتھ جوہری طاقت کو ختم کرنے اور امریکا کے ساتھ مکمل تعاون کا عندیہ دے چکی ہے۔ کیا آنے والے دنوں میں کالا باغ ڈیم کو ختم کرنے والی حکومت یہ مجرمانہ کالا کام کرنے کی سکت رکھتی ہے؟

بات صرف اتنی ہے، سومنات ہو یا کالا باغ ڈیم، دنیا کی ساری کامیابیاں حکمرانوں کے ایک فیصلے کی منتظر رہتی ہیں۔ سلطان محمود غزنوی نے کہا تھا ''اگر میں مشورے یا درخواستیں کرتا رہتا تو میری سلطنت غزنی تک محدود رہتی اور جب میں مرتا تو تاریخ کو یہ خبر تک نہ ہوتی کہ پہاڑوں کے دامن میں ایک ایسا شخص سو رہا ہے جسے قدرت نے فاتح عالم بننے کی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں۔'' آج سے ایک ہزار سال پہلے اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا، واقعی درخواستوں

اور ابابیلوں سے سومنات ٹوٹا کرتے ہیں اور نہ ڈیم بنا کرتے ہیں۔

رہے نام میرے رب کا جس کے فیصلے اٹل ہیں!

بروز اتوار ۲۷ ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۱۵ نومبر ۲۰۰۹ء

راستوں کی دھول

بچہ جب سمجھدار ہو گیا تو اس نے اپنے باپ سے سوال کیا" بابا! میرے نام کے ساتھ محمد کیوں ہے؟" وہ یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ "ہمارے گرد و پیش میں ہندو سکھ عیسائی اور پارسی رہتے ہیں، ہم ان سے مختلف کیوں ہیں؟" باپ آئے دن جب ان سوالات کا جواب دیتے دیتے تھک گیا تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کو کسی ایسی درسگاہ یا مدرسے میں داخل کرایا جائے جہاں ان تمام سوالوں کے تسلی بخش جوابات موجود ہوں۔ بالآخر باپ نے بچے کا چھوٹا سا بستہ خود ایک ہاتھ میں تھاما اور دوسرے ہاتھ میں اپنے بچے کی انگلی پکڑی اور اسے بولٹن مارکیٹ کے قریب ایک پسماندہ عمارت میں چھوڑ آیا کہ یہاں اس بچے کو سوالات کے جوابات ملنے کی امید ہی نہیں بلکہ یقین تھا۔ بچہ تھوڑی مدت تک اس عمارت کے باسیوں سے اپنے سوالات کے جوابات ڈھونڈتا رہا اور پھر اس کے بعد وہ دوسری عمارتوں میں بھی ان جوابات پر غور فکر کرتا رہا۔ ایک دن وہ لندن پہنچ گیا اور اس درسگاہ کے باہر کھڑا تھا جس کی پیشانی پر دنیا کے سب سے بڑے انسان "محمد ﷺ" کا نام کندہ تھا۔

قانون کی تعلیم دینے والا یہ دنیا کا سب سے بڑا ادارہ "لنکن کالج" جسے آج بھی اپنے اس ہونہار طالب علم پر فخر ہے۔ اس نے اس کالج سے تعلیم حاصل کی، وہ بیرسٹر بنا، پھر سیاستدان اور آخر میں دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کا بانی بنا لیکن وہ عمارت آخری سانس تک اس کے ذہن، اس کے دماغ میں رہی ۔جب وصیت کا وقت آیا تو اس نے اپنی جائیداد کا ایک حصہ اس عمارت اور اس عمارت میں قائم ایک درس گاہ کے نام کر دیا۔ قارئین! آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ یہ بچہ کون تھا؟ یہ میرا اور آپ کا محبوب قائد محمد علی جناحؒ تھا اور اس عمارت اور اس میں قائم درس گاہ کا نام "سندھ مدرسۃ الاسلام" ہے۔ یہ درس گاہ بھی ایک مدرسہ تھا جو عام مولویوں جیسے ایک فارغ التحصیل شخص نے قائم کیا تھا جس نے آگے چل کر قائدِ اعظم جیسے بے شمار مسلمان بچوں کے سوالات کا جواب دیئے اور یہ وہی جواب تھے جو انہیں بالآخر پاکستان کے قیام تک لے گئے۔

شہاب الدین غوری اور محمود غزنوی افغانستان کے وہ جرنیل تھے جو ہندوستان میں داخل ہوئے تو مسلم تہذیب، اسلامی رویات اور اسلامی تعلیمات کے زرّیں اصول ان کے ساتھ تھے۔ یہ اسلامی تعلیمات حضرت بہاوالدینؒ، حضرت علی بخشؒ ہجویری (عرف داتا گنج بخش) اور خواجہ محمد نقشبندؒ کی شکل میں ان کے سینوں میں محفوظ تھیں۔ ان صوفیاء کرام کی تعلیمات کے ساتھ ان مسلم فاتحین نے درہ خیبر کو عبور کر کے ہندوستان میں قدم رکھا۔ ان مسلم فاتحین کے ساتھ وہ داناو بینا حضرات بھی ہندوستان میں چلے آئے جنہوں نے ہندوستان میں اسلامی درس گاہوں کی داغ بیل رکھی۔ یہ درس گاہیں اس خطے کے پہلے مدرسے تھے۔ ان مدرسوں سے نکلنے والے طالب علم ہندوستان بھر میں پھیل گئے۔ انہوں نے مسجدیں بنوائیں، لوگوں کو دین اسلام کا تعارف کروایا اور دین اسلام کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم عام کی، یوں مدرسوں کا کلچر شہر شہر، گلی گلی اور محلے محلے میں پھیل گیا جس کی بدولت آج آج برصغیر پاک و ہند میں پچاس کروڑ مسلمان موجود ہیں۔

ہم اگر ان نصف ارب مسلمانوں کا شجرہ نسب دیکھیں تو ان میں بے شمار مقامات پر کوئی نہ کوئی مدرسہ ضرور ملے گا۔ ہندوستان کی پچھلی ہزار سالہ مسلم

تاریخ میں مدرسوں کے بعد فارسی دوسرا ناقابل فراموش نقش ہے۔لوگ سمجھتے ہیں اس فارسی کا باعث ایرانی اثر ورسوخ ہے لیکن یہ ایک بہت بڑا تاریخی مغالطہ ہے۔ہندوستان میں فارسی افغان لیکر آئے تھے اور اس فارسی اور ایرانی فارسی میں وہی فرق ہے جو ہندو اور پنجابی میں ہے۔دوسرا اگر آپ افغانستان اور ہندوستان اور بعد ازاں افغانستان اور پاکستان کا تہذیبی جائزہ لیں تو ان میں صرف ایک ہی قدر مشترک ہے اور اس کا نام ہے ''مدرسہ''۔افغانستان میں مدرسہ کلچر کی تاریخ تقریباً تیرہ صدیوں سے بھی کہیں زیادہ عرصے پر محیط ہے اور ہوا اور پانی کی طرح یہ روایت بھی درہ خیبر ہی کے ذریعے اس خطے تک پہنچی تھی۔

یہ دور خواہ بابر کا ہو' اورنگ زیب کا ہو یا پھر لارڈ ماونٹ بیٹن کا' غزنی ہرات اور قندھار کا طالب ملتان دہلی اور پانی پت تک یوں آتا جاتا تھا جیسے سائبیریا کے پرندے گرم ساحلوں تک آج بھی آزادانہ سفر کرتے ہیں۔قیامِ پاکستان کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔افغانستان میں روس کے خلاف جہاد بھی مدرسوں سے ہی شروع ہوا' پھر وہاں سے محلوں گلیوں' بازاروں اور گھروں تک اس نے رسائی حاصل کی۔یہ عمل اچھا تھا یا برا' میں اس بحث میں الجھے بغیر یہ دیکھتا ہوں کہ یہ شروع کہاں سے ہوا؟ اس کا ایک ہی ماخذ اور ایک ہی اور یجن تھا اور اس کا نام ہے افغانستان۔یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔اس وقت پاکستان میں ۶ ہزار ۹ سو ۹۵ مدارس ہیں جن میں دس لاکھ کے لگ بھگ طالبعلم پڑھ رہے ہیں۔

صرف پنجاب کے ۸ شہروں میں قائم مدرسوں میں ۲ لاکھ ۸۳ ہزار ایک سو ۶۸ طالب علم ہیں۔ان مدرسوں میں ۷۵٪ دارالعلوم سرکاری امداد کے بغیر چل رہے ہیں جبکہ یہ مدارس ہر سال ملک کو لاکھوں کی تعداد میں پڑھے لکھے نوجوان دیتے ہیں' اس کے مقابلے میں پورے ملک میں ۹۲۵ مردانہ' ۳۸۴ زنانہ کالج اور ۷ ہزار ۵ سو ہائی اسکول ہیں۔ان پر حکومت ہر سال ۹۳ ارب ۹۰ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے خرچ کرتی ہے لیکن یہ تمام تعلیمی ادارے ان مدرسوں سے آدھے طالب علم پیدا کرتے ہیں۔خود سابقہ صدر مشرف نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ دنیا میں ان مدرسوں جیسا کوئی دوسرا تعلیمی نیٹ ورک نہیں ۔یہ اس نیٹ ورک کی کامیابی ہے کہ اس وقت امریکا جیسے ملک میں ۱۷۵/ مدارس ہیں جنہیں مسلمانوں کی ۴۲۶ تنظیمیں چلا رہی ہیں اور ۱۳۰ سے زائد مدارس برطانیہ میں چل رہے ہیں۔

ماضی کے ان مدارس نے حضرت مجدّد الف ثانی سے سر سیّد احمد خان اور ان مدارس کی ذرا سی جدید شکل نے علامہ اقبالؒ سے لیکر قائداعظمؒ تک بے شمار مشاہیر' رہنماء اور سیاستدان پیدا کئے اور اب بھی یہ مدارس کسی نہ کسی شکل میں اسلام کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔اب ایک دفعہ پھر موجودہ حکومت نے کیری لوگر بل قبول کر کے امریکی حکومت کو ان مدارس پر پابندی لگانے کی جو یقین دہانی کروائی ہے اس کے مضمرات سے یہ حکومت ابھی واقف نہیں ۔ان مدارس پر جو بے آسرا' غریب و نادار بچوں کو کھانے کے لئے روٹی' پہننے کے لئے کپڑے' سر چھپانے کے لئے چھت' علم بھی اور حلم بھی دیتے ہیں' جو لوگوں کو اس غربت جس کے بارے میں ہمارے ہادی اکرم محمد ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہ انسان کو کفر تک لیجاتی ہے' اس سے نکال کر اللہ کے حضور لا کھڑا کرتے ہیں۔

ایک طرف تو امریکی مشیر برائے قومی سلامتی جنرل جیمز اپنے ملک کی سیکرٹری خارجہ کے حکم پر فوری طور پر پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل کیانی اور حکومت کے دوسرے اعلیٰ اہلکاروں کو اس فیصلے سے آگاہ کرنے آئے ہیں کہ ہم نے افغانستان سے نکلنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے اسی فوج سے مدد طلب کی ہے جس پر کچھ دن پہلے وہ طالبان اور القاعدہ کی خفیہ مدد کا الزام لگا رہے تھے۔ گزشتہ دنوں سی آئی اے کی اطلاع پر تقریباً پچاس مرتبہ پاکستانی اداروں نے امریکیوں کو ساتھ لیکر کاروائی کی لیکن تمام غلط اطلاعات کے بعد پاکستان کے سیکورٹی کے اداروں نے ان الزامات کا سختی سے نوٹس لیتے ہوئے آئندہ کے لئے اپنے تعاون کو ختم کرنے کا عندیہ دیا تھا۔

دوسری طرف امریکا سعودی شاہی خاندان کے ایک اہم فرد ''ابو نعیم'' جس کے ماضی میں طالبان اور القاعدہ قیادت کے ساتھ گہرے مراسم رہے ہیں کے توسط سے طالبان، حکمت یار گروپ اور حقانی گروپ کے ساتھ براہِ راست بات چیت میں مصروف ہے اور طالبان نے باقاعدہ مذاکرات شروع کرنے سے قبل جو تین شرائط رکھیں تھیں، امریکا نے ان تمام شرائط پر اپنی آمادگی کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ اطلاع کے مطابق ڈی جی آئی ایس آئی کا دورہ سعودی عرب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

اس سلسلے میں امریکا اور مغربی حکومتوں کے بعض افراد صیہونی اور مکار بنئے کو خوش کرنے کے لئے پاکستان میں ان مدارس پر پابندی کی خواہاں ہیں اسی لئے کیری لوگر بل میں اس مکروہ شرط کو شامل کیا گیا ہے۔ ٹھیک ہے لگا دیں پابندی کہ اس عہد میں سچ وہی ہے جس کے پیندے پر میڈ ان یو ایس اے کی مہر لگی ہے لیکن بس اتنی عرض ہے اس پابندی کا آغاز بجویر، غزنی، ہرات اور قندھار کے ان محلوں سے ہونا چاہئے جس کی خاک میں آج بھی سینکڑوں نہیں ہزاروں مدرسے تڑپ رہے ہیں۔ جس کے ہر فرد کے پاوں پر ان رستوں کی دھول ہے جن میں کوئی نہ کوئی مدرسہ، کوئی نہ کوئی خانقاہ پڑتی ہے۔ عجیب بات نہیں جہاں سے یہ دریا نکلتا ہے وہاں ان صہیونی طاقتوں کا ایجنٹ چغہ پوش مسخرہ کرزئی تو ایک پتھر تک نہیں رکھ سکا، وہاں تو ملا عمر کا مدرسہ قائم ہے لیکن جہاں اس کے پاٹ پھیل جاتے ہیں وہاں پابندی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، آخر کیوں؟

شائد اس لئے تو نہیں کہ پچیس تیس پچاس برس کے بعد جب کوئی پاکستانی بچہ اپنے والد سے پوچھے، میرے نام کے ساتھ محمد کیوں آتا ہے تو اس کے والد کو اس ملک میں کوئی ایسی جگہ نہ ملے جہاں بچے کے سوالوں کا جواب موجود ہو!

رہے نام میرے رب کا جو ارض و سما کا مالک ہے!

بروز منگل ۲۹ ذیقعد ۱۴۳۰ھ ۱۷ نومبر ۲۰۰۹ء

فروزاں مشعل

ایک دفعہ پھر اس بزرگ مگر بہادر سید کا شکریہ جنہوں نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ ایک عرصے کے بعد پھوٹتی سحر اچھی لگی، صبح نور کی تازگی دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی، رغبت سے کھانا کھایا اور سجدہ شکر ادا کیا۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ روح کا سارا آلام دھل گیا ہے اور روٹھے ہوئے الفاظ ایک دفعہ پھر ایک قطار میں مسکراتے کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں، پھر سے ہمدم، ہمدرد اور غمگسار، بڑھ کر گلے ملنے کے لئے متمنی، جونہی میں نے محبت سے بازو پھیلائے فوراً بغیر کسی تاخیر کے سینے میں اتر گئے!

یہ سب ایک بوڑھے، بیمار و علیل اور ایک سفید ریش کے حامل بزرگ کی وجہ سے ہوا جن سے ملاقات کی آرزو برسوں سے دل کو بے چین کئے ہوئے ہے۔ میں نہیں جانتا کب یہ دل کی مراد بر آئے گی اور نہ ہی اس بات سے واقف ہوں کہ کبھی ان کو دیکھ بھی سکوں گا کہ نہیں۔ سید علی گیلانی جنہوں نے اپنی زندگی کے بیشتر قیمتی سال بھارتی مکار ہندو بنئے کی بنائی ہوئی جیلوں میں گزار دیئے، جس کی اولاد پر بھی زندگی تنگ کر دی گئی۔ کم از کم پانچ مرتبہ جس کے مکان پر راکٹ برسائے گئے، جسے خلقِ خدا کے قلب و دماغ سے اتارنے کی ان گنت سازشیں کی گئیں لیکن وہ اتنا ہی زیادہ قلب و روح کی جان بنتا جا رہا ہے۔ جسے تھکا ڈالنے، دھمکانے اور خریدنے کا ہر حربہ آزمایا گیا لیکن وہ ہر دفعہ تازہ دم، کسی خوف سے عاری اور کسی بھی خطرے کی پرواہ کئے بغیر مایوسی کو دھتکارتے ہوئے منزل کی طرف بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے اور آج وہ اسی مظلوم شہر سرینگر میں اس شان سے کھڑا ہے کہ عظمت اس پر ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہی ہے۔

دوسروں کا ذکر ہی کیا، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مقبوضہ کشمیر کی جماعت اسلامی نے بھی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور حریت کانفرنس سے مطالبہ کیا گیا کہ اس کو الگ کر کے جماعت کے کسی اور لیڈر کو نمائندگی کا اختیار دیا جائے۔ کمالِ جرات لیکن نہائت صبر و تحمل کے ساتھ وہ اپنی راہ پر گامزن رہا۔ سرینگر کے ایک مزدور کا بیٹا، جس نے اپنی بھرپور جوانی میں اپنے لئے ایک راہ چن لی تھی اور پھر عمر بھر ناک کی سیدھ میں اس راہ پر چلتا رہا اور کبھی کسی موقع پر اس کے قدم نہیں ڈگمگائے، جسے دیکھ کر تو حیرت ہوتی ہے، جس کے بارے میں سنو تو دل سے بے اختیار اس کی درازی عمر کی دعا نکلتی ہے اور غور کرو تو "اھدنا الصراط المستقیم" کا مفہوم سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ عمر بھر اس نے جھوٹ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور عمر بھر اس کو کوئی مشتعل بھی نہیں کر سکا۔

وہ جانتا ہے کہ راہ کٹھن بھی ہے اور طویل بھی، لیکن وہ پھر بھی اپنی ترجیحات اور مقاصد پر یکسو ہے۔ وہ راز اس پر آشکار ہے کہ جس سے مسلم دنیا کے اکثر رہنما بے خبر ہیں کہ عرصہ گیر امتحان میں اصل اہمیت کامیابی اور ناکامی کی نہیں، حسنِ نیت اور حسنِ عمل کی ہوتی ہے۔ آدمی نتائج کا نہیں جدوجہد کا مکلف ہے، نتیجہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ پہلے تو وہ خود اپنی پارٹی قیادت کے خلاف صف آراء ہوا، جدجہد کے طویل برسوں اور ان گنت قربانیوں نے جسے تھکا دیا تھا، پارٹی کے کارکنوں کو آواز دی جو ہمیشہ کی طرح اس پر اعتماد کرتے ہیں کہ زندگی کی کتاب میں جاہ پسندی، ریا اور مفاد کا کوئی باب نہیں۔ اپنا سارا اخلاقی

دباوڈال کراس نے جماعت کی قیادت کو بدل ڈالا' پھر وہ حریت کانفرنس کی مصلحت کا شکار ہونے والی قیادت کے خلاف اٹھا ایک آدمی' متعدد لیڈروں اور گروہوں کے خلاف جو پاکستان کو بھول کر بھارت سے مذاکرات پر آمادہ ہیں' جانتے کہ کن لوگوں نے انہیں آمادہ کیا تھا۔

اندلس کا جلیل القدر حکمران درباریوں کے ساتھ نو تعمیر محل میں نمودار ہوا جس میں سونے کا قبہ جگمگا رہا تھا۔ جب دوسرے داد دے چکے تو قاضی سعید کی طرف متوجہ ہوا" بادشاہ تم پر شیطان سوار ہے" قاضی نے کہا کہ "سونے سے عمارتیں نہیں بنائی جاتی" آسمان اور زمین کے درمیان ایک سناٹا تھا اور دل "! تھے جو خوف اور اندیشوں سے دھڑک رہے تھے۔ جب بادشاہ کی آواز ابھری "سعید کو لوگ بے سبب ہسپانیہ کا ضمیر نہیں کہتے' قبہ گرادیا جائے کبھی کبھی ایک تنہا آدمی اٹھتا ہے اور منظر کو بدل ڈالتا ہے۔ علی گیلانی فرشتہ نہیں ہے' اس کے اپنے تعصبات ہو سکتے ہیں اور ناقص فیصلے بھی' اس کی ہر رائے اور ہر اقدام سے اتفاق ضروری نہیں' نہ اس سے اختلاف کرنے والوں کی نیت پر شبہ کرنے کا کوئی جواز ہے' ہو سکتا ہے ان کی عقلیں وہی کہتی ہوں جس پر وہ عمل پیرا ہیں؟ دنیا کے بدلے ہوئے ناساز گار حالات اور پہاڑ جیسی رکاوٹیں' لیکن علی گیلانی ان سے مختلف ہے۔ وہ ایک صاحبِ یقین ہے اور صاحبِ یقین کبھی مرجھاتا اور مایوس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات سے اوپر اٹھ جاتا ہے اور ایک برتر مقصد کے لئے ہر چیز کو تیاگ دیتا ہے۔ معاشروں کو ایسے لوگ انعام کے طور پر عطا کئے جاتے ہیں اور کوئی الٹا لٹک جائے ان کی راہ کھوٹی نہیں کر سکتا۔ ایسے لوگوں کو جیسا کہ اس نادر روزگار نے کہا تھا کہ' خود ان کے سوا کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی وہ خود ہی حماقت کر بیٹھیں' اگر خلق کی بے پناہ محبت کو اپنا ہنر گردانے لگیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے پرنسپل سیکرٹری ایم او متھائی نے اپنی یادداشتوں میں بھارتی کابینہ کے اجلاس کی روداد لکھی ہے' جب اسرائیل کو تسلیم کرنے کا مسئلہ زیرِ غور تھا' کابینہ مائل تھی لیکن ایک شخص ان سب کی راہ میں حائل ہو گیا اور اس کا نام ابوالکلام آزاد تھا۔ کیا کبھی غور کرنے والوں نے غور کیا ہے کہ ایک تنہا آدمی بھارت اسرائیل مفاہمت کے پچاس سال چھین لے گیا۔ جرات و جسارت اور حکمت و تدبر آمیز ہو جائیں تو ایسے ہی معجزے رونما ہوتے ہیں۔

سید علی گیلانی نے حریت کانفرنس کی درماندہ قیادت اور اس کے عقب میں سازشیں کرنے والے بھارتیوں اور شاطر امریکیوں کو ہرا دیا ہے۔ جب استعمار سارا زور کشمیریوں کو تنہا کرنے کے لئے صرف کر رہا ہے' جب پاکستانی حکومت بھی تھک چکی ہے اور پاک فوج بھی راستہ بھول چکی ہے' جب کشمیریوں کی حلیف جماعت اسلامی پاکستان نے حزب المجاہدین کو بھی بتا دیا ہے کہ وہ اب مزید جماعت کے دفاتر اور وسائل استعمال نہیں کر سکتے جناب قاضی حسین احمد صاحب اور محترم منور حسن صاحب پاکستانی عوام کے جمہوری حقوق کی جنگ لڑنے پر تو آمادہ ہیں" "گو امریکا گو" کی تحریک میں دن رات صرف کر رہے ہیں لیکن کشمیر کے معاملے پر کوئی احتجاج سامنے نہیں آ رہا۔

اب ایک دفعہ پھر اس مردِ مجاہد نے دہائی دی ہے کہ وزیرِ خارجہ شاہ محمود قریشی نے امریکی ایماء پر کشمیر کی بندر بانٹ کرنے کے لئے میر واعظ عمر فاروق

کے ساتھ ساز باز کرنا شروع کر دیا ہے اسی لئے خصوصی طور پر واشنگٹن میں آصف زرداری کی ملاقات میر واعظ عمر فاروق سے کروائی گئی ہے لیکن ہمیشہ کی طرح اب بھی کشمیری اس مذموم منصوبے کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ دوسری طرف سید علی گیلانی نے پاکستانی حکمرانوں کو بھارت کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھانے پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ ممبئی میں دہشت گردی کا شور مچانے والا بھارت اب بلوچستان، سرحد، سوات اور پاکستان کے دیگر دوسرے بڑے شہروں میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے دہشت گردی کا ارتکاب کرتے ہوئے پاکستان کی سلامتی کے لئے ایک مستقل سنگین خطرات پیدا کر رہا ہے اور پاکستانی حکومت اپنے اس مکار دشمن کے ساتھ دوستی کے لئے مرتی جا رہی ہے۔

سید علی گیلانی کو میرا، ایک عام پاکستانی کا سلام پہنچے۔ انہوں نے ہماری ساری مایوسی دھو ڈالی ہے۔ ہمارے لئے انہوں نے ایک تابہ فلک ایک مشعل فروزاں کر دی ہے اور ہمیں یاد دلایا ہے کہ انسانیت کا مستقبل ابلیس اور مایوسی پھیلانے والے اس کے کارندوں کے پاس نہیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ جو امید کا رب ہے اور جس کی کتاب برملا یہ کہتی ہے کہ "أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ" کیا اللہ اپنے بندوں کے لئے کافی نہیں)۔

جناب سید صاحب! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا!
رہے نام میرے رب کا جس نے ظالم کی رسی ڈھیلی کر رکھی ہے تاکہ اس کے بدترین انجام تک پہنچایا جا سکے!

جو بھی حالات ہوں پیچھے نہیں ہٹنے والے
ہم ہیں عشاق تری آن پہ کٹنے والے
چڑھتے سورج کو بھلا روک سکا ہے
کوئی کون کہتا ہے یہ بادل نہیں چھٹنے والے
تیرے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کی قسم
عمر بھر ایک سبق ہم نہیں رٹنے والے
ٹوٹ بھی جائیں تو دریا میں رہیں گے اکبر
ہم وہ دھارے ہیں جو لہروں میں نہیں بٹنے والے

بروز جمعرات ۲ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۱۹ نومبر ۲۰۰۹ء

وہ پچھتاوا، جس کا نہیں کوئی مداوا؟

اس کے کپڑے میلے کچیلے تھے، جوتوں پر پالش نام کو نہیں تھی لیکن پھر بھی اس نے انہیں تھوڑا سا صاف کر رکھا تھا جس سے اس کے عیب زیادہ نمایاں ہو گئے تھے۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے میرے سامنے ایک فائل رکھ دی جس میں اس کی ڈگریاں، درخوستوں کی کاپیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے سب کو ایک طرف کیا، چند چھوٹے چھوٹے رسید نما کاغذات کا ڈھیر ایک سمت اکٹھا ہونے لگا۔ اس نے وہ ڈھیر سمیٹا اور پھر اسے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے پوچھا، یہ کیا ہے؟ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ خود دیکھ لیں۔ عجیب رسیدیں تھیں۔ کوئی ڈاکخانے کی، کوئی کوریئر سروس کی، لیکن ان کے علاوہ بہت سی ایسی رسیدیں تھیں جو یا تو منی آرڈر تھے یا پے آرڈر یا پھر نقد جمع کرائی گئی رقم کی رسیدیں۔

میں نے سوال کیا "یہ سب کیا ہے؟" تو اس کی آنکھ میں رکے ہوئے آنسو اچانک ڈھلک پڑے اور اس کی بے ہنگم بڑھی ہوئی داڑھی اور مونچھوں کو بھگونے لگے۔ میں اس نوجوان کو کئی سالوں سے جانتا تھا۔ اس نے اپنی تعلیم کے اخراجات بھی اپنی دن رات کی محنت و مزدوری سے پورے کئے تھے۔ یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس نے تلاشِ رزق کا آغاز کیا۔ کبھی کسی جگہ مل جاتا تو میں اس کی نوکری کے بارے میں سوال کرتا تو مسکرا کر کہتا کہ تلاش اور کوشش جاری ہے۔ پھر وہ کتنے سال غائب ہو گیا، غالباً پورے پانچ سال، لیکن آیا تو کیا عجیب کہانی ساتھ لئے ہوئے۔ ان پانچ سالوں میں اس کے والدین چل بسے، بہن بھائی غربت کے ہاتھوں مجبور گھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے، اس کو دور کے رشتے داروں نے اسے اپنے ہوٹل پر ملازم رکھ لیا جس سے اس کے گھر کا چولہا کبھی آباد ہو جاتا اور کبھی اسی چولہے کی راکھ ان سب کا مذاق اڑاتی ہوئی ان کے چہروں پر بسیرا کر لیتی۔

لیکن ایم اے اور وہ بھی فرسٹ کلاس میں پاس کرنے والے کے تو خواب ہی اور ہوتے ہیں۔ دفتر گاڑی چپڑاسی، پی اے اور اگر نہیں تو ڈسٹرچاک اور طالب علم۔ اس نے درخواستوں کا آغاز کر رکھا تھا، اب تھوڑا سہارا ملا تو تلاش تیز کر دی اور ہر اس جگہ درخواست دینے لگا جہاں سے تھوڑی سی بھی امید ہوتی، اور آج اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ اس پورے سال میں اپنی ہر ماہ کی تنخواہ ان درخواستوں پر خرچ کر چکا تھا اور اس کے ہاتھ پھر بھی خالی تھے۔ نہ نوکری نہ کھانے کو پیسے، نہ سفر خرچ اور نہ ہی مزید درخواست جمع کروانے کی ہمت۔ میرے پاس بھی اس وقت سوائے تسلی کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن آج میں نے بھائی کو عیدالاضحیٰ کے دن قربانی کی رسم ادا کرنے کے لئے جب فون پر اس نوجوان کا نام لیکر کہا کہ اس کو آج ہی بلا کر یہ ساری رقم اس کے حوالے کر دینا تو اس کے جواب نے میرے ہوش اڑا دیئے۔

اس نوجوان نے بیروزگاری سے تنگ آکر خودکشی کر لی تھی اور اپنی لاش کے پاس ایک پیغام چھوڑ گیا تھا کہ "میں پاکستان کی خدمت اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا کہ اپنا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھاتا ہوا اپنے رب کے پاس چلا جاوں۔" میں باوجود ضبط کے اسی طرح رونے لگ پڑا جس طرح وہ کبھی میرے پاس آکر بلک بلک کر رو رہا تھا اور اس کی چھلکتی آنکھوں کے بے اختیار آنسو اس کے چہرے پر مختلف خوفناک لکیریں بنا رہے تھے۔ میں اس وقت سے اسی خیال میں گم ہوں کہ گزشتہ چند سالوں سے جب سے ہم نے ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور نام نہاد سیکھا ہے ہم نے ایسے کتنے لوگوں کو خودکشی پر مجبور کر دیا

ہو گا یا پھر این جی اوز کے اسکالروں سے ایک لفظ زندگی سے متنفر اور بیزار۔ آیئے میں آپ کو ان چند مفلوک الحال، غریب و بے یار و مددگار لوگوں کے ساتھ ایک سفر پر لئے چلتا ہوں۔

اس بیمار کے ساتھ جسے بیروزگاری اور غربت نے بھوک کے دروازے پر کھڑا کیا ہے جب وہ سرکار کے ہسپتال میں جاتا ہے تو ڈاکٹر کی پرچی کے پیسے دینے کے بعد کبھی ایکسرے کی پرچی کبھی کسی ٹیسٹ کی پرچی کبھی سستی دوائی کی پرچی بنواتا ہے اور اس کے باوجود بھی تندرستی نہیں بلکہ قرض کا بوجھ اٹھا کر باہر نکلتا ہے۔ آیئے اس انصاف مانگنے والے مظلوم کے پاس لئے چلتا ہوں جو چند سال پہلے بڑے سے بڑے مجسٹریت کے سامنے بھی سادہ کاغذ پر درخواست لے کر جاتا تھا تو اور کچھ ہو نہ ہو ایک تسلی ضرور لے کر آتا تھا اور اگر مجسٹریٹ ایماندار ہوتا تو شائد اسے اس سادہ کاغذ پر انصاف مل جاتا لیکن اب اسے عرائض نویس سے لیکر کورٹ فیس تک، وکیل کے خرچے سے لے کر منشی کے پیسوں تک سب ادا کرنے کے لئے پہلے قرض لینا پڑتا ہے اور پھر اس عدل کی زنجیر لہرائی جاسکتی ہے۔

اس طالب علم کے پاس لئے چلتا ہوں جو کچے مکان کی ایک لالٹین کی مدھم روشنی میں علم حاصل کر کے اعلیٰ ترین نمبر حاصل کرتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ اسے کسی بہترین کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ مل جائے گا لیکن داخلہ فارموں کے ساتھ ان ٹیکس نما منی آرڈروں یا پے آرڈروں کا خرچہ تو اس کے پاس ہے نہیں، زکوٰۃ کا وظیفہ تو بہت بعد کی بات ہے، جب اسے داخلہ مل جائے گا تو پھر دھکے کھانے کے بعد اپنا حق لے سکے گا۔ اور اب ہم نے بیروزگاروں سے بھی وہی غنڈہ ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا ہے۔ ظاہر بات ہے جتنی بیروزگاری بڑھے گی اتنے درخواست دینے والے بڑھیں گے اور اتنے ہی لوگ پبلک سروس کمیشن کو، کسی وزارت کو، کسی محکمے کو زیادہ نذرانہ اپنی درخواستوں کے ساتھ پیش کریں گے اور یوں میرے ملک کے معاشی شعبدہ باز یہ سمجھتے ہیں کہ عدالتوں کا خرچہ ان بے آسرا مظلوموں کی کورٹ فیس سے نکلے گا، ہسپتال مفلوک الحال مریضوں کی پرچیوں کے پیسوں سے چلنے لگیں گے اور پبلک سروس کمیشن بیروزگاروں کی درخواستوں سے ہونے والی آمدنی سے اپنے پاوں پر کھڑے ہو جائیں گے۔

میں صرف تیس سال پہلے نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ ہم بہتر تھے کہ ہم نے ایسی معاشی منصوبہ بندیاں نہیں سیکھی تھیں۔ ہمارے محکمے سادہ کاغذ پر درخواستیں وصول کرتے تھے اور نہ کوریئر کے پیسے ہوتے نہ درخواست کی کوئی فیس۔ ہمارے ہسپتال ایک آنہ یا دس پیسے سے زیادہ کی پرچی فیس وصول کرنے کے قطعاً حقدار نہیں تھے۔ ہمارے مظلوم، وکیلوں اور کورٹ فیسوں کے محتاج نہیں ہوا کرتے تھے لیکن شائد کسی کو علم نہیں ان ساری تھوڑی تھوڑی رقوم سے جو ہم نے ان مظلوموں سے اب اکھٹے کرنا شروع کر دی ہیں ان سے تو شائد ایک ہسپتال کی بجلی کا ایک دن کا بل بھی ادا نہ ہو سکے، شائد ایک اعلیٰ افسر کی گاڑی کے ایک دن کے پٹرول کا بل بھی پورا نہ ہو، عدالت کے ایک اہلکار کی تنخواہ بھی نہ نکل سکے۔ ایوانِ صدر، ایوانِ ہائے وزیر اعظم، وزیرِ اعلیٰ اور گورنروں کے مہمان خانوں میں پکنے والے ایک دن کے کھانوں کی قیمت ادا نہ ہو سکے!

مگر ہم یہ فیس ضرور لیں گے ‘اس طرح ہمارے آقاوں کی نظر میں ہم محترم ہو جائیں گے اور بتائیں گے کہ اس طرح لوگوں میں احساس پیدا ہوتا ہے اور اونرشپ جنم لیتی ہے ‘کسی سہولت کی قدر آتی ہے ‘ادارے اپنے پاوں پر کھڑے ہوتے ہیں لیکن ان پاوں کے کھڑے کرنے کے عمل میں کتنے ایسے مظلوم ‘مجبور ‘بیروزگار رسیوں پر جھول جاتے ہیں اور ان کے پاوں کے نیچے رکھی کرسی مایوسی کی ٹھوکر سے لڑھک جاتی ہے ! کیا ہمارے آئین میں ایسی کوئی شق ہے جو ان مجبور و بیکس اور حالات سے دلبرداشتہ خودکشی پر مجبور لوگوں کے ذمہ داروں کا تعین کر کے ان کو سزا دے سکے ؟ کیا ایوانِ صدر اور ایوانِ ہائے وزیراعظم کے مکین ان اموات کے ذمہ دار ہیں کہ نہیں ؟

خدارا آگے بڑھیے ‘اپنے اڑوس پڑوس میں آج ہی ان افراد کو اپنی اس عید کی خوشیوں میں شریک کیجیے ‘کہیں ایسا نہ ہو کہ بکرے کو لٹکانے والی رسی میں کسی ایسے مایوس کی گردن لٹکتی ہوئی ملے ‘آپ کو ایسے میلے کچیلے کپڑوں والوں کو ڈھونڈنے میں دیر نہیں لگے گی !

رہے نام میرے رب کا جو مظلوموں کی آہوں کو بہت قریب سے سنتا ہے !

بروز ہفتہ ۴ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۲۱ نومبر ۲۰۰۹ء

تمہارا میرا رشتہ

کوئی نہیں جانتا کہ وہ عبدالجلیل اب کہاں ہوگا اور کس حال میں ہوگا؟ آج سے گیارہ سال پہلے غالباً ۱۹۹۸ء میں رمضان المبارک کے آخری عشرے کی بات ہے، فجر کی نماز کے تھوڑی دیر کے بعد میں مسجدِ نبوی بلکہ روضہ رسول کی بغلی گلی میں کھڑا زیارتوں پر جانے کے لئے کسی ایسے ٹیکسی ڈرائیور کی تلاش میں تھا جو اردو جانتا ہو حالانکہ ایک طویل عرصہ ان علاقوں میں گزارنے کے بعد عربی زبان بولنا اور سمجھنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں رہا تھا۔ اس زمانے میں ابھی غیر ملکی ٹیکسی چلانے والے مل جاتے تھے۔ قریب ہی ایک سانولے سے ادھیڑ عمر آدمی نے میری حیرت کو بھانپ کر اردو میں مجھے زیارتوں پر جانے کے لئے پکارا، میں فوری طور پر اس کی طرف بڑھا اور اس کی ٹیکسی میں جا بیٹھا۔

مدینہ منورہ کی مقدس سرزمین میں گھومتے ہوئے میں نے اس سے تعارف کے طور پر پہلا سوال کیا کہ پاکستان میں تمہارا تعلق کس شہر یا علاقے سے ہے؟ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے مجھے بتایا کہ میں مشرقی پاکستان کے شہر سلہٹ کا رہنا والا ہوں۔ مجھے اس قدر نفیس اور شائستہ اردو سننے کے بعد یہ گمان بھی نہ ہو سکا کہ کوئی بنگالی ایسی اردو نستعلیق زبان میں بات کر سکتا ہے۔ میں نے جب وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ میری ساری تعلیم کراچی کی ایک مشہور دینی مدرسے میں ہوئی۔ یہ خوبصورت زبان تو میرے اساتذہ کرام اور میرے ساتھی طالب علموں کی محبت کی زبان ہے، میرے بچے جو میرے ساتھ یہاں مقیم ہیں اردو زبان ہی بولتے ہیں۔ استاد اور اس مدرسے کے دوسرے ساتھیوں کی زبان اور پھر اس شہر سے اس کی محبت نے اسے اس قدر بدل دیا، مجھے اس کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

گزشتہ کئی سالوں سے دنیا کے جس ملک میں مجھے کسی بنگالی نوجوان سے ملنے کا اتفاق ہوا، اس کی زبان پر شکوے شکائتیں اور مزاج میں ایک واضح تلخی نظر آتی تھی اور ان میں کچھ اردو جانتے ہوئے بھی اردو نہیں بولتے تھے لیکن یہ عجیب شخص ہے، نہ اس نے مجھ سے ۱۹۷۱ء کے کشت وخون کا ذکر کیا اور نہ یہ بتایا کہ میرے سامنے کیسے فوجی گھروں میں گھستے تھے اور کیسے نوجوانوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیتے تھے حالانکہ یہ الزامات وہ بچے بھی بڑے یقین کے ساتھ دہراتے تھے جو اس سانحے کے بعد پیدا ہوئے۔ مجھے ایک دم لندن کے کالج کی ایک بنگالی استاد یاد آ گئی جو ایک کانفرنس میں میرے ساتھ تھی لیکن اس نے مجھ سے محض اس لئے بات کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ میرا تعلق اس خطے سے تھا جہاں کے سپاہیوں نے اس کی دو بہنوں کی آبروریزی کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا، اور مشرقی پاکستان کی یونیورسٹی کے ایک مشہور بنگالی مورخ ڈاکٹر مومن چودھری کی ان تمام جھوٹے الزامات کے بارے میں بڑی معرکتہ الآرا کتاب (ایتھینٹک وائس آف ساتھ ایشاء) جب پڑھنے کو دی تو اس نے نہ صرف معذرت کی بلکہ آج خود ایسے افراد کے سامنے سینہ سپر ہے۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اس نے مجھے جنت البقیع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اندر جانے کو کہا۔ میں نے اسے جب یہ کہا کہ میں نماز فجر کے بعد اور بہت سے نمازیوں کے ساتھ یہاں سے ہو کر گیا ہوں تو وہ تھوڑی دیر تک خاموش نظریں جھکائے کسی گہری سوچ میں گم جنت البقیع کی طرف دیکھتا رہا، اس

کے ہونٹ ہلتے رہے لیکن میں صرف ہلکی سی بھنبھناہٹ کے سوا کچھ نہ سن سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک کھلی سڑک پر آ گیا تو میں نے اچانک کہا کہ یہاں گاڑی چلانے میں تو بہت مزا آتا ہو گا۔ اس نے فوراً اپنی گاڑی روک لی اور بڑے احترام سے مجھ سے فرمائش کرنے لگا کہ اگر آپ چلانا چاہتے ہیں تو بسم اللہ! میری سمجھ میں فوری طور پر کچھ نہیں آیا اور شکریہ کے ساتھ ہی میں نے اس سے سوال کیا کہ کہ تم ۱۹۷۱ء میں کہاں تھے اور تمہاری کیا عمر تھی؟؟

میں اس وقت سلہٹ شہر میں تھا اور ایف ایس سی کا طالب علم تھا۔ میں اردو زبان سے بالکل نابلد تھا بلکہ اپنے اسکول اور کالج کے ہندو اساتذہ کی زبانی مغربی پاکستان کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ اور مشرقی پاکستان کے ساتھ زیادتیوں کے ان گنت واقعات نے میرے دل میں ایک شدید نفرت پیدا کر دی تھی لیکن ایک واقعے نے میری سوچ کا دھارا بدل دیا جب مکتی باہنی کے کچھ افراد پاکستانی فوجیوں کی وردی میں ملبوس میرے گھر میں گھس گئے اور ان مکتی باہنی کے کچھ لوگوں کو میں نے پہچان لیا جو میرے کالج کے ساتھی تھے۔ میرے پہچاننے پر انہوں نے مجھ پر گولی چلا دی لیکن میں وہاں سے زخمی حالت میں بھاگ نکلا اور قریب ہی ایک پاکستانی فوج کا ایک گروہ جو گشت پر معمور تھا اس ساری صورتحال سے نمٹنے کے لئے جب میرے گھر پہنچا تو وہاں میری تین نوجوان بہنوں کو عصمت دری کے بعد گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا اور میرا بوڑھا باپ اس صدمے سے ذہنی توازن کھو چکا تھا۔

مجھے دوسرے زخمی فوجیوں کے ساتھ علاج کے لئے کراچی بھیج دیا گیا اور یہی مجھے معلوم ہوا کہ میرا بد قسمت باپ بھی چند دنوں کے بعد اپنی مجبور و مقہور بیٹیوں کے پاس پہنچا دیا گیا ہے۔ علاج معالجہ کے بعد میں نے وہاں ہی ایک دینی درسگاہ میں داخلہ لے لیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسی درسگاہ میں استاد کے فرائض سرانجام دیتا رہا اور بالآخر اعلیٰ تعلیم کے لئے مدینہ یونیورسٹی میں مجھے داخلہ مل گیا اور اب یہاں تعلیم مکمل کر کے اسی یونیورسٹی میں ملازمت کر رہا ہوں کیونکہ مجھے کراچی سے میرے اساتذہ اور دوسرے ساتھیوں نے پاکستان نہ آنے کا مشورہ دیا ہے کہ یہاں بنگالی ہونے کے سبب مجھے دہشت گردی کے شبے میں گرفتار بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ میرا تو کوئی ملک ہی نہیں، بنگلہ دیش جانا نہیں چاہتا اور پاکستان اب مجھے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ اس لئے یہی سوچا ہے کہ اس نبی ﷺ کے قدموں میں باقی زندگی گزار دوں جو ہم جیسے بے سہاروں کے ملجا و ماویٰ ہیں۔

میں نے پوچھا ''تم نے مجھ سے کوئی گلہ کیوں نہیں کیا؟'' اس نے جواب دیا کہ میں نے بھی ظلم دیکھے ہیں، زیادتیاں برداشت کی تھیں لیکن میرا اور آپ کا رشتہ تو کلمہ طیبہ سے بندھا ہوا ہے۔ اس رشتے کو دنیا کی کسی زبان بولنے والے کا ظلم اور زیادتی ختم نہیں کر سکتی۔ مجھے جتنی محبت کراچی میں ملی شائد ہی کہیں ملی ہو۔ میں اور میرے جیسے اور بھی ساتھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم لڑے نہیں لڑوائے گئے تھے۔ ہمارے دلوں میں نفاق پیدا کیا گیا تھا، ہم جو ایک کلمہ طیبہ کی لڑی میں پروئے گئے تھے اسے رنگ و نسل اور زبان کی بنیاد پر آمریت اور ان کی پشت پناہ طاقتوں نے کاٹ کر رکھ دیا لیکن قدرت کا انتقام تو دیکھئے کہ اس سازش میں ملوث تمام کرداروں کو کیسی عبرتناک موت سے ہمکنار ہونا پڑا۔

مجیب الرحمان کو اس کے گھر کی سیڑھیوں پر انہی بنگالی فوجیوں نے قتل کیا جو بنگلہ دیش بنانے میں پیش پیش تھے، اندرا گاندھی جس نے بڑے تکبر کے

ساتھ اس بات کا اعلان کیا تھا کہ آج ہم نے ایک ہزار سال غلامی کا بدلہ لے لیا اور دو قومی نظریہ کو خلیج بنگال میں ڈبو دیا' اسی کے باڈی گارڈ نے گولیوں سے بھون دیا' اور پھر یحییٰ خان قولنج جیسی خطرناک بیماری میں مبتلا ایڑیاں رگڑتے رگڑتے بستر پر ایک شام مردہ حالت میں پایا گیا اور اس سانحے کا آخری کردار ذوالفقار علی بھٹو اپنے ہی مقرر کردہ فوجی جرنیل کے ہاتھوں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ان تمام کرداروں کے اہل خانہ پر بھی نظر دوڑائیں تو تاریخ اور جبر کے انتقام کی بے شمار داستانیں مل جائیں گی۔ میرا ایمان و ایقان اب بھی یہ گواہی دیتے ہیں کہ پاکستان کے خلاف سازشوں میں ملوث لوگ اب بھی ایسے ہی عبرتناک و شرمناک انجام کو پہنچیں گے بلکہ وہ طاقتیں جو اس کو کمزور کر کے اس کو غلام بنانے کا خواب دیکھ رہے ہیں ان کا وجود اس دنیا سے مٹ جائے گا۔

وہ جذباتی انداز میں بولے چلا جا رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس کے دل میں میرے لئے اتنی محبت کہاں سے آ گئی کہ وہ سارے زخم بھول کر مجھے بھائیوں سے زیادہ پیار دے رہا ہے۔ یقیناً اس تربیت کے پیچھے وہ استاد بیٹھا ہوا ہے جو مسجد کی ایک چٹائی پر بیٹھا اپنے بوسیدہ پھٹے پرانے لباس سے اپنے تن کو ڈھانپے ہوئے اپنے تمام طالب علموں کو یہ سکھاتا ہو گا کہ تمام مسلمان ایسے ہیں جیسے عمارت کی اینٹیں' یہ تو ایک جسم ہیں۔ اگر ایک کو تکلیف ہو جائے تو دوسرا بے چین، معاف کرنے والوں کو اللہ محبوب رکھتا ہے۔ ایسا اسلام کا درس جب کسی طالب علم کو ملے گا تو وہ پھر کیسے ایک مسلمان سے نفرت کر سکتا ہے؟

میرے ملک کی یہ درسگاہیں اور یہ مدرسے نصف صدی سے بھی زائد امتِ مسلمہ کے نوجوانوں کو تعلیم دے رہے تھے جہاں دنیا کے ہر ملک سے نوجوان انہیں اسلامی تعلیمات کی آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی سمجھ کر یہاں آتے تھے اور پھر میرے ملک پاکستان سے ایک محبت کا رشتہ لے کر جاتے تھے لیکن آج اس رشتہ محبت کی تعلیم دینے والی ان درسگاہوں پر پوری دنیا کے مسلمانوں کے دروازے بند کئے جا چکے ہیں۔ وہ طلباء جو دنیا بھر کے ممالک سے کشاں کشاں یہاں آتے تھے اب ہندوستان اور جنوبی افریقہ میں قائم مدارس میں جا رہے ہیں کہ میرے دین کا علم سکھانے والے تو ہر جگہ موجود ہیں۔ انہیں کوئی علاقہ یا حکومت محدود نہیں کر سکتی۔ فاسق کمانڈو مشرف نے اپنے امریکی آقا کے حکم پر پاکستانی وزارتِ خارجہ اور دوسرے اداروں کو ان مدارس کا آپریشن کرنے کا حکم دیا اور تمام غیر ملکی طلباء کو مختلف حیلوں بہانوں سے ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ تین ہزار سے زائد طلباء بھارت اور یورپ اور عرب ممالک کے دس ہزار سے زائد طلباء جنوبی افریقہ کے مدارس میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لئے داخلہ لے چکے ہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ جو تعلیم مشرقی پاکستان کے ظلم و ستم کی داستان کا دکھ بھلا کر محبت کے بیج بو سکتی ہے' بھلا ہم نے نفرت کے بیج بونے والی تعلیم کو اس پر مقدم کیوں کر لیا؟ آج میرے ملک کے عیسائی مشنری کالجوں میں پرنسپل سے لیکر وارڈن تک اور طالبعلموں سے لیکر ان کالجز کے دوسرے ملازمین تک کتنی آسانی سے پاکستانی ویزہ لیکر آ جاتے ہیں اور میرے ملک کے نوجوانوں کو اپنی مخصوص مغربی تعلیم سے آگاہ کر رہے ہیں۔ پاکستان کے بیشتر ایسے اداروں میں کتنے ایسے اساتذہ ہیں جو لندن' امریکا' آسٹریلیا اور دوسرے مغربی ممالک سے یہاں آ کر ان پاکستانی طلباء کو تعلیم کے ساتھ بڑے تفاخر کے ساتھ ان ملکوں کا کلچر بھی سکھا رہے ہیں جو میرے ملک کے نوجوانوں کو اپنے ہی ماحول سے متنفر کر کے ان کے دل سے اس ملک کی محبت کو بھی کھرچ کر باہر نکال پھینکنے پر آمادہ کر دیا ہے۔

ہم اس بدنصیب دور میں زندہ ہیں جہاں او لیول یا اے لیول پاس کر لینے کے بعد ایک طالب علم کو اپنے شہر کی گلیوں سے بو آنے لگتی ہے اور ایسے دینی

مدارس سے ان کو نفرت ہونے لگتی ہے لیکن ایسی ہی درسگاہوں میں پڑھنے والے ہمارے ظلم، ہماری زیادتیوں اور ہماری ناانصافیوں کو بھول کر صرف ایک بات کہتا ہے کہ تمہارا میرا رشتہ تو کلمہ طیبہ ہے، تم تو میرے جسم کا حصہ ہو، تمہیں تکلیف ہو گی تو میری آنکھیں نیل تو ضرور بہائیں گی۔ نائن الیون سے پہلے میرا پاکستان یہ افتخار رکھتا تھا کہ دین کی تعلیم حاصل کرنے والے غیر ملکیوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی اب این آر او کی پیداوار وزیرِ داخلہ رحمان ملک نے ایک تازہ بیان جاری کیا ہے کہ تمام غیر ملکی طلباء اور ائمہ کرام کو پاکستان سے نکال دیا جائے گا! کہاں ہو تم عبدالجلیل؟ روضہ رسول پر جا کر اپنی اشک بار آنکھوں سے یہ دعا تو کرنا کہ پاکستان پر اک عجب مشکل وقت آن پڑا ہے۔ رہے نام میرے رب کا جو فیصلوں کی بڑی مضبوط طاقت کا مالک ہے!

بروز سوموار ۶ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۲۳ نومبر ۲۰۰۹ء

ماڈریٹ اسلام

وہ ابھی بچہ تھا کہ اس کا باپ یونان سے بہتر مستقبل کی تلاش میں امریکا چلا گیا۔ اس بچہ کی پیدائش بھی یونان میں ہوئی تھی لیکن اس کے باپ نے ان سب کو اپنے پاس امریکا میں بلا لیا۔ دنیا کے کسی بھی قانون اور کسی بھی ملک کے رہنے والوں کی نظر میں وہ اور اس کا باپ غیر ملکی تھے کیونکہ وہ اپنا ملک یونان چھوڑ کر امریکا میں آباد ہوئے تھے۔ پھر یہ بچہ محنت اور لگن کی منزلیں طے کرتا ہوا ایک ایسے مقام پر پہنچا کہ اس نے کئی سال پہلے اپنے انٹرویو میں مسکراتے ہوئے پوچھا کہ مجھے دنیا کا کوئی بھی ایسا ملک دکھاؤ جس کی سب سے زیادہ طاقتور اور اہم خفیہ ایجنسی کا سربراہ کسی دوسرے ملک سے آکر آباد ہونے والا ہو؟ یہ سوال پوچھنے والا امریکا کی سب سے زیادہ متنازع اور امریکی حکومت کی سب سے زیادہ طاقتور خفیہ ایجنسی کا سربراہ جارج ٹینٹ تھا۔

یہ وہ شخص تھا جس نے اپنے پیشرو جان ڈچ کے زمانے کی ناکامیوں کو ایک چیلنج کے طور پر لیا اور امریکا کو ایسی جنگ میں جھونکا جس کی آگ کے شعلوں نے دنیا کے امن کو خاکستر کر کے رکھ دیا ہے اور میں نہیں جانتا کہ امریکا کو اس جنگ سے نکلنے میں اور کتنے برس لگیں گے۔ یوں سرد جنگ کے بعد جس خفیہ ایجنسی کے خلاف امریکا کے دانشوروں، صحافیوں اور کانگریس کے ارکان کی انگلیاں اٹھنے لگ گئی تھیں، جسے امریکا کی معیشت پر ناقابل برداشت بوجھ تصور کیا جا رہا تھا اس ادارہ کو اس نے نئے انداز میں زندہ کر دکھایا اور امریکی سیاست میں یہ خفیہ ایجنسی اس قدر طاقتور ہو گئی کہ سابقہ صدر جارج بش کو اس کے ہیڈ کوارٹر میں جا کر یہ بیان دینا پڑا کہ میں اس کے کام اور اس کی منصوبہ بندیوں کا احسان مند ہوں اور پوری امریکی قوم کو ان کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

میں یہاں سی آئی اے کی گزشتہ کہانیوں کا نہیں بلکہ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد کے اس نعرے ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' سے جنم لینے والی حکمتِ عملی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کے تحت روس اور کیمونزم کے مرنے کے بعد سی آئی اے کو زندہ رکھنے کے لئے ایک نیا دشمن پیدا کیا گیا اور وہ دشمن تھا مسلمان اور اسلام، اسے دشمن بنانا آسان بھی تھا۔ کیونکہ کئی سو سالوں کی میڈیا وار، کتب، اخبار، ریڈیو اور ٹیلیویژن کی کوششیں اس نفرت کو سلگا رہی تھیں۔ بس سی آئی اے کے پالیسی سازوں کو ایک دیا سلائی دکھانے کی دیر تھی اور پوری دنیا اس آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔ لیکن اصل حیرت اس بات کی ہے کہ پچاس سالہ کیمونزم کے خلاف سرد جنگ میں سی آئی اے کے کسی ڈائریکٹر نے اتنے اعتماد کے ساتھ اور اتنے کھلے لفظوں میں اپنے ارادوں اور منصوبوں کا ذکر نہیں کیا جیسے جارج ٹینٹ نے کیا تھا۔ اس کے پیشرو نہ تو کسی ٹی وی پر آتے اور نہ ہی کسی اخبار یا میگزین سے ان کا کوئی رابطہ ہوتا۔

لیکن جارج ٹینٹ نے نیویارک ٹائمز کے ایک صحافی کو جو اپنی تفتیشی صحافت کی وجہ سے بہت مشہور تھا اسے سی آئی اے کی اس جنگ پر کتاب لکھنے کے لئے اپنی تنظیم کے دروازے کھول دیئے۔ رونالڈ کیسلر نے پچاس سے زائد بڑے عہدیداروں سے ملاقاتیں کیں اور پھر انکشافات سے بھرپور ایک کتاب ''سی آئی اے ایٹ وار'' تحریر کی۔ یہ ضخیم کتاب جہاں اس راز سے پردہ اٹھاتی ہے کہ کیسے افغانستان میں ڈالروں کے ساتھ امریکی کمانڈو بھیجے گئے تاکہ قبائلی سرداروں کو خریدا جائے۔ کون سے طریقے تھے جن سے اسامہ بن لادن اور اس کے ساتھیوں کے ٹیلیفون ٹیپ ہوئے اور پھر ان پر چھاپہ مارا جاتا۔

کیسے تمام اقوامِ متحدہ اسلحہ انسپکٹروں، عرب رہنماؤں اور دنیا کے مختلف ممالک کے سربراہوں کے کمرے اور فون پر گفتگو ریکارڈ ہوتی۔ کیسے سینسر لگا کر امریکا کو ٹارگٹ بتائے جاتے۔ کیسے خالد شیخ محمد کو ایف بی آئی کے ہیڈ کوارٹر سے اٹھالیا گیا کہ وہ مزید معلومات نہ بتا سکے۔ کیسے صدر کلنٹن کو مجبور کیا گیا کہ عراق سے سیٹلائٹ دور لے جائے جائیں جو تباہ کن ہتھیاروں کا سراغ لگا رہے تھے اور کس طرح اپنے ہی دوست ممالک کے سفارت خانوں میں گھس کر ان کے کوڈ چوری کئے گئے (اور یہ معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ اس ادارے نے جاسوسی کے ان حساس آلات پر اب بھی کروڑوں ڈالر کا بجٹ مختص کر رکھا ہے اور یہ ادارہ کی مستقل پالیسی کا لازمی حصہ ہے۔) اس طرح یہ کتاب سی آئی اے کی اس جنگ کی ایک سب سے اہم پالیسی اور سب سے اہم حکمتِ عملی کی نشاندہی کرتی ہے۔

یہ حکمتِ عملی آج سے کئی سو سال پہلے بھی استعمال کی گئی تھی لیکن آج اس کا راستہ اور طریقہ ذرا سا مختلف کر دیا گیا ہے۔ جارج ٹینٹ نے اس ادارے کی پالیسی تیار کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ مسلمانوں کو ان کے اندر ہی سے شکست دی جا سکتی ہے۔ ہم مسلمانوں کے درمیان ایسے ملّاؤں کو تیار کر کے بھیجیں گے جو ان میں ماڈریٹ اسلام کی ترویج کریں گے۔ ہم اب ملّا خریدیں گے نہیں کہ یہ طریقہ اب پرانا ہو چکا ہے۔ ہم اب اپنے ملا خود بنائیں گے، وہ ہمارے آدمی ہوں گے۔ ان کو ہم مسلمانوں کے مدرسوں میں داخل کروا کے پوری مذہبی تعلیم دلوائیں گے اور پھر ان کی حیثیت اتنی اہم ہو جائے گی کہ ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ وہاں کے مسلمانوں کو قرآن و سنت کی تعبیر لگے گا۔ یہ لوگ ایک ماڈریٹ اسلام لوگوں کے سامنے پیش کریں گے۔

یہ ماڈریٹ اسلام ان مسلمانوں کو بہت اچھا لگے گا جو ڈانس کلب سے لیکر مخلوط پارٹیوں تک، حجروں سے لیکر جوئے خانوں تک زندگی گزارنے کے بعد ایک سجدہ کرنے سے یہ سمجھ لیں گے کہ اب ہمارا رب ہم سے راضی ہو گیا خواہ ہم نے سارا دن اس سے بغاوت کی ہو۔ بغیر آستین کے ملبوسات زیبِ تن کئے ہوئے خواتین اور لوگوں کی نظروں پر حسن کی بجلیاں گراتی ہوئی عورتوں کو اس خواب کی تعبیر مل جائے گی کہ پردہ تو نظر کا ہوتا ہے، ذہن کا ہوتا ہے، دل کا ہوتا ہے، عریانی سے کیا ہوتا ہے؟ دوسری طرف ان مدارس میں بھی اپنے ان منظورِ نظر لوگوں کو پروان چڑھایا جائے گا جو ایسے ماڈریٹ اسلام کو ماننے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہوئے ان کے خلاف ہر وقت جہاد کو ضروری سمجھیں گے اور ان کو گردن زنی سمجھتے ہوئے خودکش حملوں کو جنت میں جانے کا آسان راستہ اپنائیں گے۔

لیکن اس سارے معاملے میں جو خوف اور پریشانی مجھے سونے نہیں دیتی وہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے اس وقت ہمارے بعض مدارس، درس گاہوں اور مسجدوں میں کتنے ایسے سی آئی اے کے ایجنٹ چوری چھپے تعلیم حاصل کر رہے ہوں جو ایک دن لارنس آف عریبیا کی طرح استاد بن کر نکلیں گے یا اب تک نکل چکے ہوں گے اور اپنا حقِ نمک اور اپنے ''آقا'' سے وفاداری کا حق ادا کرنے میں مستعد ہوں گے۔ میرے دین کی تعلیمات کو مسخ کرتے ہوئے کتنے ایسے ہوں گے جو آج بھی ہیں اور نفرت کا بیج بو رہے ہیں۔ صرف ایک اشارے پر گولیوں اور بموں کی بوچھاڑ سے آئے دن بے گناہ اور معصوم مسلمانوں کو اپنا شکار بنا رہے ہیں اور اس عمل کو جہاد کا نام دیکر درپردہ اس تکفیری گروہ کے نظریات کو تقویت دے رہے ہیں جو درپردہ سی آئی اے کے ایجنڈے پر عمل پیرا ہیں۔

سی آئی اے نے اپنے سابقہ سربراہ جارج ٹینٹ کی پالیسیوں کی تکمیل کے لئے اب مسلمانوں کے ابھرتے ہوئے میڈیا پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر رکھی ہے جہاں ان کی پالیسیوں کے مطابق ماڈریٹ اسلام کی ترویج کرنے والے چینلز بھی اتنی ہی تندہی سے کام کر رہے ہیں جہاں تکفیری خیالات کے لوگ بھی اسی میڈیا کو شب و روز استعمال کر رہے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے جارج ٹینٹ نے مسلمانوں کے اندر ہی سے جو دشمن تلاش کرنے کی پالیسی وضع کی تھی ہمارے ارد گرد اسی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے اور اب امت مسلمہ یہ سوچ رہی ہے کہ دیکھو نفرت کا بیج بونے والے تو مسجدوں میں رہتے ہیں' امام بارگاہوں میں پلتے ہیں' ان سے بہتر تو وہ لوگ ہیں جو مسلمان بھی ہیں اور ماڈریٹ بھی ! اور یوں جارج ٹینٹ کا وہ خواب پورا ہوتا رہے گا' مسلمان خون میں نہاتے بھی رہیں اور پہچان بھی نہ سکیں کہ ان کے درمیان آستین کے سانپ کون چھوڑ گیا ہے۔ چنگاری سلگانے والے ہاتھ کسی کو نظر نہیں آئیں گے لیکن جلتا ہوا گھر سب کے لئے تماشہ بن جائے گا۔

مجھے اس بات کا بھی شدید خوف اور ڈر ہے کہ ان آئے دنوں کے خود کش حملوں اور خونریزی کو بہانہ بنا کر ان ماڈریٹ اسلام پسندوں کا اگلا شکار میرے ملک کے ان تمام مدارس کو نہ بنا دیا جائے جہاں میرے ملک کے پندرہ لاکھ سے زائد غریب' یتیم اور بے سہارا بچے سر چھپائے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آخر کا کیری لوگر بل کی شرائط پوری کر کے ہی راتب نصیب ہو گا !

رہے نام میرے رب کا جس نے دین اسلام کو سلامتی کا مذہب قرار دیا ہے !

تم اور اتنی کشادہ دلی سے پیش آؤ
میں سوچتا ہوں' ستم ہے کہ مہربانی ہے

بروز منگل ۷ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۲۴ نومبر ۲۰۰۹ء

خود کش: جواز یا عدمِ جواز کی کشمکش

لکھنے اور پوچھنے کی ہمت نہیں ہو رہی لیکن کب تک؟ حقیقت سے آخر کب تک نظریں چراتے رہیں گے، کم از کم لکھنے اور پوچھنے سے بحث کا باب تو کھلے گا اور یقیناً کوئی اہل علم اور دانشور اس معاملے میں پوری امت مسلمہ کی رہنمائی فرمائیں گے، ورق محدود ہے اور سوال تفصیل طلب لیکن سوال ایسا ہے کہ اسے اب ہم نظر انداز بالکل نہیں کر سکتے۔ پہلے بھی بار بار پوچھا گیا اور اب تو بہت اصرار کے ساتھ پوچھا جا رہا ہے کہ ''کیا خود کش حملے جائز ہیں؟'' غیر مسلم اسکالر اور سیاستدان تو خیر اس پر متفق ہیں کہ نہ صرف ناجائز اور ناروا ہیں بلکہ یہ دہشتگردی ہے۔ ایک گھناؤنا جرم، جس کی سزا مرتکب کے ورثاء، اہل محلہ، صاحبانِ دیار بلکہ اس کی پوری قوم کو دینی چاہیئے۔ خود کش حملوں کا ارتکاب زیادہ تر مسلمان کرتے اور اکثر اسلامی سرزمینوں پر قابض غیر مسلم افواج ہدف ہیں۔ ایک سبب یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لئے، خاص طور پر خود کش حملے کا ارتکاب کرنے والے مسلمان کے لئے تو اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہی دنیا ہے لیکن کافر کے لئے آخری سانس کے ساتھ زندگی کا اختتام ہے۔

پھر اہلِ ایمان میں بھی ایسے لوگ ہیں جو خود کشی تک جا پہنچنے والوں کے لئے ٹھیک وہی جذبات رکھتے ہیں اور اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے بخدا میں رتی بھر مبالغہ نہیں کر رہا۔ پچھلے دنوں لاہور میں ایک کانفرنس کے ایک مقرر، امت مسلمہ کے درد میں بھیگی آنکھوں سے حالات رقم کرنے والے ایک دانشور نے مجھے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ جنت محض ایک بہلاوہ ہے اور جہنم محض ایک دھمکی۔ خیر کہنے کو تو ان صاحبِ دلنواز نے اور بھی بہت کچھ کہا لیکن ملخص یہی تھا کہ انسان کو اب مذہب کی کوئی ضرورت نہیں۔ حیرت اور ملال کے عالم میں، میں ان کا خطبہ سنتا رہا لیکن میرے اس سوال پر کہ اگر ان کا یہی اعتقاد ہے تو اپنے اس کمرے میں چیخنے اور چلانے کی بجائے وہ برملا اس کا ذکر کسی چوراہے میں کیوں نہیں کرتے۔ اب تو باقاعدہ ٹیلیویژن پر ملک کے غریب و بیکس لوگوں کی قسمت بدلنے اور ان پر ہونے والی زیادتیوں کے سدباب کے لئے اپنی دانش کا مظاہرہ بھی اس طرح کرتے ہیں کہ گویا مہمانوں کو اسی لئے مدعو کیا گیا ہے کہ اس مجلس سے فیض یاب ہو کر اٹھیں۔ حالانکہ یہ وہی مفکر ہیں جو کابل کی ترقی کا راز بنکاک کی تقلید میں دیکھ رہے تھے اور اب بھی امریکا سے اس سلسلے میں بہت سی توقعات وابستہ کئے ہوئے ہیں۔

خیر انہیں ان کے حال پر چھوڑتے ہیں لیکن یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ ایک بھاری پتھر کی طرح پڑا ہوا ہے کہ کیا خود کش حملے جائز ہیں؟ خاص طور پر اس وقت جب بے گناہ شہری ہدف بنتے ہیں۔ سوال مسلم اور غیر مسلم کا نہیں، بے گناہ اور مجرم کا ہے۔ ایک غیر مسلم کا خون بھی اتنا ہی محترم ہے جتنا صاحبِ ایمان کا، صرف خون ہی نہیں، اس کے سارے حقوق۔ جب ہم اپنے محبوب سرورِ عالم ﷺ کے آخری ایام پر نگاہ کرتے ہیں تو یہ نگاہ نہائت ادب سے کرنی چاہیئے، تو ہم انہیں نماز، محروموں اور بے بسوں کی بہبود اور غیر مسلموں کی نگہداشت پر اصرار کرتے ہوا دیکھتے ہیں۔

ایک دوسرے حوالے سے یہ سوال اور بھی نازک ہو جاتا ہے اور یہ کتاب کا حوالہ ہے جس میں آج تک کوئی کمی ہوئی نہ اضافہ، جس کا ایک نقطہ اور ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود کتاب نازل کرنے والے نے اٹھا رکھا ہے، جس کے ایک حرف سے انکار بھی کفر

کا ارتکاب ہے اور کتاب ہم سے کہتی ہے کہ فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے' قتل کے بارے میں یہ واضح ہے کہ اس دنیا میں اس کی سزا موت' دوسری دنیا میں جہنم اور اللہ کا دائمی عذاب ہے۔ دوسرا پیمانہ سرکارِ دوعالم ﷺ کی سیرت ہے اور دراصل یہ وہی قرآن کا پیمانہ ہے کہ کتاب کی عملی تفسیر وہی تھے۔ ایک موقع پر جب ایک گستاخ نے یہ کہا: محمد ﷺ انصاف کیجئے تو قلق سے پاکیزہ چہرے کی سرخی میں سیاہی اتر آئی تھی اور رنج کے ساتھ فرمایا تھا کہ: محمد انصاف نہ کرے گا تو اور کون کرے گا۔

اب جنگ کے سلسلے میں آپ کی جو ہدایات ہیں وہ بالکل واضح ہیں۔ جنگ کا اعلان کیا جائے گا' ایسے کسی شخص پر تلوار نہ اٹھائی جائے گی جو اس میں شریک نہیں' فصل جلائی جائے گی اور نہ کوئی درخت کاٹے جائیں گے' کارخانے میں کام کرتے مزدور اور کھیت میں پسینہ بہاتے کسان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا۔ تو جناب! خودکش حملہ کرنے والا بے گناہ مسلمانوں کے لہو سے کس طرح ہولی کھیل سکتا ہے؟ مقبوضہ کشمیر میں شانتی کے نام لیوا بھارتی ہولی کھیل سکتے ہیں' دنیا کے اقتصادی' ابلاغی اور سیاسی ذرائع پر مسلط قابض یہودی کھیل سکتے ہیں' عراق اور افغانستان میں ہماری پیاری این جی اوز کا سرپرست اور مربی امریکا کھیل سکتا ہے' چیچنیا میں کل کے اشتراکی اور آج کے جمہوریت پسند کھیل سکتے ہیں۔ ہمارے ترقی پسندوں کے مذہب میں جن کے خلاف ایک لفظ لکھنا بھی گناہِ کبیرہ ہے لیکن ایک مسلمان کیسے کھیل سکتا ہے کہ مسلمان کے لئے تو قرآنِ کریم اور رحمت العالمین ﷺ ہی سب کچھ ہیں' اگر وہ نہیں تو پھر کہاں کا اسلام اور کیسا ایمان؟

نہائت سوچ سمجھ کر ہم نے ایک نتیجہ اخذ کر لیا ہے اور جب ایسا کر لیا جائے تو اطاعت کے سو اسب دروازے بند ہو جاتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک سوال پھر بھی باقی رہ جاتا ہے اور اس کا جواب تلاش کئے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے' اس کے سوا کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتے کہ ۱۹۴۲ء کے بعد فرڈیننڈ اور ازابیلا کے اسپین میں بسنے والے مسلمانوں کی طرح کفر کے سامنے سربسجود ہو جائیں' اللہ کی بجائے بھارت' اسرائیل' امریکا اور روس کے سامنے' کم از کم فلسطین' کشمیر' افغانستان' چیچنیا اور عراق کے مسلمان۔ دوسروں کا تو کیا ذکر' کل اگر امریکی یہ مطالبہ کریں کہ ہم کلمہ پڑھنا چھوڑ دیں تو کیا ہم ان کی بات مان لیں گے؟

ہرگز ہرگز یہ کوئی مبالغہ آمیز بیان نہیں' صرف اسرائیل ہی نہیں' امریکا کا مطالبہ بھی یہی ہے کہ فلسطین کے اسکولوں میں سورۃ البقرہ اور کچھ دوسری قرآنی سورتوں کی تعلیم ختم کر دی جائے جس طرح سابقہ فاسق کمانڈو جنرل پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں ان کی کابینہ میں سابقہ ساتھی فوجی جرنیل قاضی اشرف جس کے پاس وزارتِ تعلیم کا قلمدان تھا' جہاد کے متعلق قرآنی آیات کو اسکولوں کے نصاب سے حذف کرنے کی عملی کوشش کرنے کا مرتکب ہوا تھا۔ امریکا اور مغربی ممالک صہیونی دباو کے تحت دبے لفظوں میں سعودی عرب اور مصر سے بھی ایسا مطالبہ کر چکے ہیں۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے' نصاب میں تغیر و تبدل ایک بنیادی امریکی شرط ہے جو ایک دفعہ پھر موجودہ حکومت سے کیری لوگر بل کی آڑ میں پوری کروائی جائے گی اور کیری لوگر بل کو کابینہ سے منظور کرانے کے بعد امریکا کو تابعداری کا واضح پیغام پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔

لیکن آج کا سوال دوسرا ہے اور میں اس موضوع سے ہٹنا نہیں چاہتا' کیا اسلام میں خود کش حملے جائز ہیں؟ ورق محدود ہے اور سوال تفصیل طلب' لیکن اس کا جواب سنجیدگی اور دلیل سے آنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم واضح ہے اور جو اپنی مرضی سے قرآن کی تعبیر کرے گا اور وہ جو اللہ کے رسول سے منسوب کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ ایسے کذب سے خدا کی پناہ' ایسے کذب سے خدا کی پناہ! ورق تمام ہوا' میں بھی آپ کی طرح انتظار کرتا ہوں کہ اس معاملے پر کیا کہتے ہیں مفتیانِ دین؟

رہے نام میرے رب کا جو میرے لئے کافی ہے!

بروز بدھ ۸ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۲۵ نومبر ۲۰۰۹ء

اپنی دہکائی آگ

آج مجھے آپ کو عید کی ڈھیر ساری مبارکباد دینا ہے۔اللہ آپ کی قربانیوں کو قبول فرمائے‘آپ کو آسانیاں عطا فرمائے‘آپ کو اپنے تمام خوابوں کی بہترین تعبیر عنائت فرمائے‘اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہانوں کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے‘ڈھیر ساری دعائیں دل سے نکل کر عرش کی طرف اٹھتی جارہی ہیں لیکن !آپ کو آج پھر اس خوشی کے موقع پر میرے ’’لیکن‘‘کا سامنا کرنا ہوگا اور عید کی خوشی میں کشادہ دلی‘کشادہ ظرفی اور وسیع النظری سے میرے ’’لیکن‘‘کا جواب دینا ہوگا۔اگر آپ کا پیمانہ صبر لبریز ہو جائے تو میں آپ کے لئے دعا ہی کر سکتا ہوں لیکن اپنی اس عادت سے باز نہیں رہ سکتا!

یہ عیدِ قرباں آخر ہمارے لئے کیا پیغام لیکر آتی ہے ؟اگر عید قرباں کا پیغام یہ ہے کہ ہم اپنی متاعِ عزیز کی قربانی کے لئے ہمہ وقت تیار رہیں تو ہم اس کو کھانے پکانے‘تکہ بوٹی اور روسٹ کرانے کی نذر کیوں کر دیتے ہیں؟اپنے دوستوں عزیزوں کی خوب خاطر مدارت کیجئے‘مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیونکہ یہ بھی ایک محبت کا اظہار ہے‘اور ان دعوتوں سے محبت کا شجر اور قد آور بھی ہوتا ہے لیکن کیا وہ محبت جوان دنوں ہم سے روٹھ کر اپنا بسیرا کہیں اور بنا چکی ہے ؟

لیکن یہ عیدِ قرباں جو آجکل ایک میلے کی شکل اختیار کر چکی ہے‘جو تمام احباب ورشتہ داروں پر اپنی مارات کا رعب ڈالنے کا سالانہ تہوار ہے حالانکہ عیدِ قرباں ہمیں ربِّ کعبہ کے حضور اپنی جان تک قربان کر دینے کا درس دیتی ہے لیکن یہ جان جو ہمیں بہت عزیز ہے اور اس پر اپنا حقِ ملکیت کا اختیار بھی صرف ہمارا ہے لیکن کیا ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ جان ہم نے کہاں اور کس اسٹور یا کسی ڈیپارٹمنٹل سٹور سے خریدی ہے ؟یہ جو ہماری جان ہے‘زندگی ہے ‘ہم نے آنکھ کان ناک اور یہ حسین ترین چہرہ کی کیا قیمت ادا کی ہے ؟یہ سب کچھ تو ہمارے رب نے ہمیں دیا ہے بغیر کسی قیمت کے اور بغیر کسی خواہش کے

لَقَدْ خَلَقْنَاالْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ’’ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے‘‘یہ میرا رب فرما رہا ہے‘سنئے میرا رب یہ بھی فرماتا ہے کہ ’’ہم نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ جانتا ہی نہیں تھا‘‘تو پھر ہم کس بات پر اتراتے پھر رہے ہیں۔ہم صرف اچھے کھانے پینے اور شاہی رہن سہن کو رزق سمجھتے ہیں لیکن آنکھوں کی بینائی‘کانوں کی قوت سماعت‘یہ چلنا پھرنا‘یہ اچھی صحت‘یہ خوبصورتی اگر رزق نہیں تو پھر کیا ہے ؟؟؟؟یہ زندگی رزق نہیں ہے کیا؟یہ موسموں کی خوبصورتی‘یہ بارش ہم کتنی قیمت ادا کرتے ہیں؟آپ بہترین بستر اور آرام دہ فوم تو خرید سکتے ہیں لیکن نیند کی کیا قیمت ادا کرتے ہیں؟عالی شان محلات تو جیسے تیسے تعمیر کر لئے ہم نے !راحت وسکوں کے کیا دام لگائیں گے ہم؟چپ ہو گئے ناں‘کیونکہ یہ کسی دوکان پر نہیں ملتے۔اچھا دل کی کلی‘خوشی کتنے کی ملتی ہے اور کس دوکان سے‘ذرا یہ بتا دیجئے‘نہیں بتا سکیں گے آپ!

لیکن اس کے باوجود بڑے تفاخر سے اپنا حق جتاتے رہتے ہیں کہ یہ میرا ہے‘وہ میرا ہے‘لیکن اگر کوئی یہ پوچھ لے جس زمین پر آپ کھڑے اکڑ رہے ہیں یہ کتنے کی خریدی ہے‘یہ تو میرے رب کی ہے‘ہم کب سے اس کے مالک وخود مختار ہم بن گئے ہیں۔یہ بھی نہیں سوچتے کہ یہ تمام مال واسباب تو ایک امتحان

ہے‘انسان کے لئے یہ تمام چیزیں بنائی گئی ہیں‘انسان توان اشیاء کے لئے نہیں بنایا گیا۔انسان تواپنے رب کا نائب ہے‘اس زمین پراس کو خلیفہ کا منصب عطا کر کے بھیجا گیا ہے لیکن وہ اتنے بڑے منصب کی توقیر کو سمجھ ہی نہیں سکا اور وہ اپنے رب کی نیابت چھوڑ کر نفس کا پجاری بن بیٹھا ہے اور یہ نفس اس کو ہر ‘جگہ رذیل کر رہا ہے لیکن اس کی عقل پر ایسا پردہ پڑ گیا ہے کہ وہ اسی غلامی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ہم نے اپنے رب کی طرف سے عطا کردہ نظام زندگی چھوڑ کر بندوں کی غلامی کو ترجیح دے ڈالی اور ان کو اپنی روح تک بیچ ڈالی۔چندر سومات کو اسلام کا نام دیکر اپنے رب کو دھوکہ دینے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں حالانکہ ہم سب کا رب تو ہمیں حکم دیتا ہے ”ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً“سارے دین کو اپنانا ہوگا‘قسطوں میں بات نہیں چلے گی‘اپنی ذات پر سارا رنگ اسی کا چڑھانا ہوگا تو بات بنے گی۔یہ نمائشی حج اور نام ونمود کے لئے عمروں کی برسات اور اب قربانی کے لئے ایک مقابلہ بالکل اسلام نہیں ہے۔بھلا مجھے یہ بتایئے یہ پانچ لاکھ کا بیل‘دس لاکھ کی گائے‘پندرہ لاکھ کا سندھی یا بلوچی اونٹ‘پانچ لاکھ کا بکرا کہاں کا اسلام ہے؟مجھے آج کہنے دیجئے!کیا میرے ملک سے نادار اور فاقہ کش خاندان ختم ہو گئے ہیں‘کیا غربت کے ہاتھوں اب خودکشیاں ختم ہو گئی ہیں؟؟

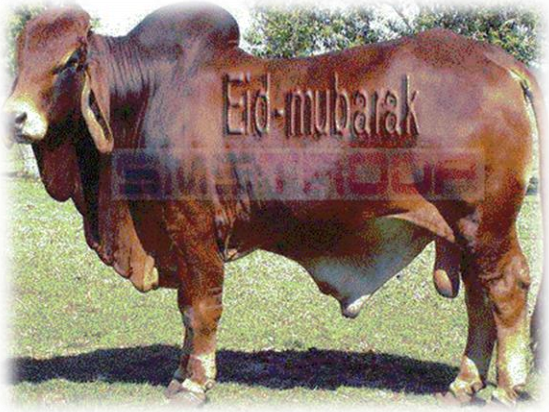

کیا نادار خاندان کے افراد اور خصوصاً ان کے بچے یہ کروفر دیکھ کر اپنے ماں باپ سے عید کے لئے فرمائشیں نہیں کریں گے؟اور اس کے جواب میں ہمیشہ کی طرح اخباروں میں خودکشیوں کی یہ سرخیاں کچھ دنوں کے لئے ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑیں گی اور ہم اس کو بھی اللہ کی مرضی قرار دیتے ہوئے اپنے کاموں میں مشغول ہو جائیں گے۔لیکن اس عید پر ہوگا کیا؟قربانی کا گوشت‘عید کے اچھے اچھے پکوان آپ کے اور آپ کے دوستوں کا دل بہلائیں گے اور جو بچے گا وہ آپ کے فریزر کے جہنم میں داخل کر دیا جائے گا اور غریب اور نادار کے حصے میں اس قربانی کے گوشت کی ہڈیاں اور آپ کی بے نقط جھڑکیاں ہونگی۔محروم تو پھر محروم رہ جائے گا اور رعونت سے تنی گردن والا ان لاچاروں اور بیکسوں کو دھتکارتے ہوئے گھر کا گیٹ بند کر کے اندر بیٹھ جائے گا عید کے دن کہ ان لوگوں کے منہ لگنا ویسے بھی نیک شگون نہیں۔قربان جاوں آپ کی قربانی کے ہم اپنے تئیں عاشقِ رسول بھی ہیں اور اپنی اس دولت کو اللہ کی طرف سے ایک نعمت بھی سمجھتے ہیں لیکن آپ کیا جانیں عشق کس بلا کا نام ہے؟عشق تو زندگی بھر اطاعتِ الہیٰ اور اپنے نبی کے اسوہ حسنہ کی محبت کی آگ میں جلنے کا نام ہے‘خود کردہ آگ‘اپنی دہکائی ہوئی آگ ہے عشق‘لیکن ہم توان چندرسموں کو عشق کہتے ہیں‘گویا رب پر کوئی احسان کر رہے ہیں۔آپ قربانی ضرور کیجئے‘عمرہ اور حج کی سعادت بھی ضرور اپنے نامہ اعمال میں شامل کر لیجئے‘ماتھے پر سجدے کا داغ بھی ضرور سجائیں لیکن اگر آپ کے پڑوس میں کوئی ایک بھی بھوکا سو گیا تو پھر اپنے رب کو کیسے منائیں گے؟

اگر اس نے پوچھ لیا اور یقیناً وہ یہ سوال تو کرے گا کہ میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا کیوں نہیں کھلایا‘مجھے تن ڈھانپنے کے لئے کپڑوں کی ضرورت تھی جبکہ تمہارے پاس درجنوں ایسے قیمتی لباس بھی تھے جن کو تم ابھی استعمال بھی نہ کر پائے تھے‘تو مارے حیرت کے آپ کا منہ تو کھلا رہ جائے گا کہ میرے پالنہار!آپ تو رب ہیں‘آپ تو تمام خزانوں کے مالک ہیں تو پھر بھلا آپ کو ان چیزوں کی کیا محتاجی؟تو پھر یہی میلے کچیلے لباسوں میں ملبوس آپ کے

گرد و پیش میں رہنے والے آپ کی جھڑکیوں کے بعد دھتکار دیئے جانے والے افراد کی ایک لمبی قطار نمودار ہو جائے گی کہ پہچان ان افراد کو جو تمہارے پاس میرے نام کا واسطہ دیکر تم سے مانگنے آئے تھے تو پھر جان لیجئے کہ معاملہ کیا ہو گا' آپ تو بڑے سمجھدار ہیں' نفع نقصان کے کھاتوں میں ساری زندگی گزاری تھی لیکن اب کیا! اب بھی وقت ہے بندوں کو منایئے تب خالق راضی ہو گا۔ اتنی سی بات ہے اگر سمجھ میں آجائے تو!

رہے نام میرے رب کا جو اپنے عہد کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا!

زمیں پہ ڈال رہے ہیں نظر حقارت سے کہ جیسے چاند ستاروں سے آئے ہیں یہ لوگ

بروز جمعرات ۹ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۲۶ نومبر ۲۰۰۹ء

ان سے ملئے!

کیا آپ کو معلوم ہے کہ مملکتِ خداداد میں جرنیلوں اور سیاستدانوں کے علاوہ ۴۹ بڑے ارب پتی خاندان اس ملک کے اصل مالک بن گئے ہیں جن کی کل دولت نو کھرب سے زیادہ ہے جو پاکستان کے سالانہ وفاقی بجٹ سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ کس کو اقتدار کے ایوانوں میں بٹھانا ہے، کسے حکم عدولی پر ان ایوانوں سے رخصت کرنا ہے، اس کا فیصلہ یہ ارب پتی مافیا کرتا ہے جو پسِ پردہ رہ کر ان حکمرانوں کو اپنے اشاروں پر نچاتے ہیں۔ یہ ارب پتی خاندان مجموعی طور پر ۱۴۰ ٹیکسٹائل ملوں، ۳۵ شوگر ملوں، ۱۴ سیمنٹ پلانٹ، ۱۲۰/انشورنس کمپنیوں، ۱۲ بینکوں، ۲۴ مضاربہ کمپنیوں، ۲۵ لیزنگ کمپنیوں اور ۸ پاور پلانٹس کے علاوہ ہزاروں رجسٹرڈ اور غیر رجسٹرڈ کمپنیوں کے مالک ہیں۔ سیاستدانوں کی اکثریت انہی ارب پتی خاندانوں کی دولت کے بل بوتے پر اقتدار کے ایوانوں تک پہنچتی ہے۔ ان ارب پتی خاندانوں میں سے ۲۴ کا تعلق کراچی، ۱۸ کا پنجاب، ۴ کا میمن برادری اور ۳ کا اسماعیلی فرقے سے ہے۔

ان تمام کھرب پتی خاندانوں کے بارے میں دلچسپ معلومات، ان کی رجسٹرڈ اور غیر رجسٹرڈ صنعتی یونٹوں اور ان کی مذکورہ کمپنیوں کے علاوہ ان کے منافع اور ٹرن اوور سمیت کی فہرست اگر پڑھیں تو حیرت سے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں لیکن کھربوں کی دولت اور اربوں روپیہ سالانہ منافع کمانے والے ان تمام خاندانوں اور گروپوں کی اکثریت مقروض اور نادہندہ ہے۔ جنرل پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں بیشتر ارب پتی خاندانوں نے ۱۸/ارب کے قرضے معاف کروالئے۔ سہگل خاندان نے ایک ارب ۴۷ کروڑ ۷۹ ہزار، رفیق سہگل نے ایک کروڑ ۵۳ لاکھ ۴۷ ہزار، بھوانی گروپ نے ۷ کروڑ ۴ لاکھ ۸۳ ہزار، آدم جی خاندان نے ۴۴ کروڑ ۸۸ لاکھ ۴۴ ہزار اور چوہدری خاندان نے ۳ کروڑ ۷۹ لاکھ کا قرضہ معاف کروایا۔

اس کے علاوہ نشاط، سہگل، پیکجز، کریسنٹ، آدم جی، حبیب، بھوانی، النور، توکل، یونائیٹڈ، فتح، سرگودھا اور کالونی گروپ کے خلاف جتنے بھی دھوکہ دہی اور قرض نادہندگی کے جو مقدمات زیرِ سماعت ہیں ان کا کیا بنا ہے اس کی کسی کو ابھی تک خبر نہیں۔ میاں منشاء کے خلاف ۵۰ کروڑ کے قرضے کا مقدمہ بینکنگ کورٹ میں زیرِ سماعت تھا، چکوال گروپ پر نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ کو ۸۲ کروڑ ۸۰ لاکھ کا نقصان پہنچانے اور دھوکہ دہی کے مقدمے کا کیا بنا، اس کی تفصیلات بھی ابھی تک سامنے نہیں آئیں۔ ان قرضے معاف کروانے والے خاندانوں نے ایک ایسے ملک کو ۱۸/ارب سے محروم کر دیا جو زندگی کی بنیادی ضروریات کے لئے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ ابھی قوم اس صدمے کو برداشت نہیں کر پائی تھی کہ چند دن پہلے ملک کے وفاقی وزیرِ قانون نے اس قوم کو یہ روح فرسا خبر سنائی کہ این آر او کے مکروہ قانون کے گنگا جل میں آٹھ ہزار اکتالیس افراد نے غوطے لگا کو اپنے آپ کو اس طرح پوتر کیا جیسے کوئی بچہ مادرِ شکم سے جنم لیکر اس دنیا میں داخل ہوا ہو۔

ارض پر ایسی مثال ڈھونڈنے سے بھی شائد نہ ملے کہ کس طرح ایک آمر نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے ۵/اکتوبر ۲۰۰۷ء کو ایک کھرب ۶۵ کروڑ ارب روپے کی کرپشن یوں بیک جنبش قلم نہ صرف معاف کر دی بلکہ مستفید ہونے والوں کے قدم بوسی کے لئے سرخ قالین بچھا دیئے گئے جن پر وہ ایک دفعہ پھر شاہانہ انداز سے چلتے ہوئے اقتدار کے اعلیٰ ایوانوں میں پہنچ گئے اور اس ڈیل کے عوض اس طالع آزما ڈکٹیٹر نے اپنے صدارتی انتخاب کو معتبر

بنانے کے لئے ان کی حمائت اس طرح وصول کی کہ پیپلز پارٹی کی رہنما بے نظیر بھٹو نے اپنی پارٹی کے تمام ارکان کو اسمبلی میں موجود رہنے کا حکم دیتے ہوئے اس آمر کی مخالفت سے گریز کیا جب کہ اس وقت ساری اپوزیشن نے قومی اسمبلی میں اس صدارتی الیکشن کے بائیکاٹ کا علان کیا تھا اور اس طرح پرویز مشرف آسانی کے ساتھ قصر صدارت کے منصب پر فائز ہو گیا۔

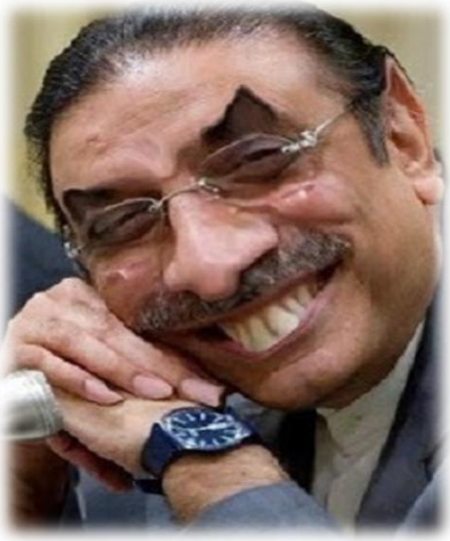

قومی مفاہمت کے نام پر اس آرڈیننس میں بدنیتی کے ان تمام پہلوؤں کو خوب سوچ سمجھ کر شامل کیا گیا جس کی بناء پر یکم جنوری ۱۹۸۶ء سے لیکر ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۹ء تک ایک کھرب ۶۵/ارب روپے کی قومی دولت لوٹنے والوں کے داغدار دامن کو نہ صرف صاف کر دیا گیا بلکہ غیر ملکی عدالتوں میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے ان تمام دائر مقدمات کو بھی واپس لے لیا گیا جن مقدمات سے بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کو سزا سنائی جا چکی تھی۔ ایک اطلاع کے مطابق ۱۶۵/ارب کی قومی دولت لوٹنے کے مقدمات صرف موجودہ صدر آصف علی زرداری پر ہیں اور باقی ماندہ لوٹی ہوئی دولت کا ۹۲ فیصد کا الزام بھی پیپلز پارٹی کے وابستگان کے کھاتے میں جاتا ہے جو مضبوط ثبوتوں کے ساتھ عدالتوں میں زیرِ سماعت تھے۔

سوئس عدالتوں میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے پندرہ ریفرنس دائر تھے جن پر ملکی خزانے کے کروڑں روپے خرچ ہوئے تھے' اسپین کی عدالتوں میں مقدمات کی سماعت مکمل ہو چکی تھی اور کسی بھی وقت سزا سنائی جانے کی امید تھی' برطانیہ میں سرے محل کی خریداری سے بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری نے اپنی مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا تھا اور الیکشن کمیشن کے دفتر میں اپنے گوشواروں میں اس کی موجودگی سے صریحاً انکار کیا گیا لیکن جب سرے محل کو فروخت کیا گیا تو آصف علی زرداری کی طرف سے حقِ ملکیت کا اعلان کرتے ہوئے سرے محل کی قیمت وصول کی گئی۔ ابھی اس این آر او کی سیاہی خشک نہیں ہونے پائی تھی کہ اسلام آباد میں ۱۰۳ ایکڑ سرکاری زمین جس کی مالیت تین ارب کے لگ بھگ تھی اس کو ذاتی اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے صرف چھ کروڑ میں اپنے بچوں کے نام پر بنائی گئی کمپنی کے نام منتقل کر دی گئی اور اس کے لئے ایک کروڑ ڈالر کا قرضہ بھی حکومتی بینکوں سے حاصل کیا گیا۔ پاکستان کا ایک بہت بڑا صنعتی ادارہ اسٹیل مل کراچی جو اربوں روپے کا منافع کما رہی تھی' الغازی نامی کمپنی جس کا تعلق بھی آصف علی زردای کے ساتھ بتایا جا رہا ہے اس کے ذریعے اربوں روپے کا نقصان پہنچا کر دیوالیہ کر دیا گیا ہے۔

این آر او سے فیضیاب ہونے والوں کی فہرست نے ملک میں ایک بھونچال پیدا کر دیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ۸۰۴۱ عالی مرتبت ملزمان میں سے قتل' اغوا برائے تاوان' ڈاکے' بلوے' جلاؤ گھیراؤ اور خوفناک کرپشن کے ۳۴۷۹ مقدمات کی فائلیں بند کر دی گئیں اور اس کرپشن کی گنگا میں اشنان کرنے والوں کی سب سے زیادہ تعداد' ۷۳۹ کا تعلق سندھ سے ہے اور باقی ۲۴۸ کا تعلق تینوں صوبوں سے ہے۔ کل ۳۴۷۹ مقدمات میں سندھی ملزمان کے خلاف ۳۳۲۰ مقدمات دائر تھے جن میں ۷۲ مقدمات تو صرف ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین جن میں سے ۳۱ قتل کے مقدمات تھے معاف کئے گئے۔ اس طرح ایم کیو ایم پر کل مقدمات میں سے ۶۸ تو قتل کے مقدمات تھے جن کو معاف کر دیا گیا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ایم کیو ایم کے قائدین

بڑے فخر سے اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ ایم کیو ایم پر کوئی کرپشن کا مقدمہ نہیں گویا قتل کا جرم وہ کرپشن سے کمتر سمجھتے ہیں۔ سندھ حکومت کے وزیرِ داخلہ ذوالفقار مرزا نے ایم کیو ایم پر قتل، اغوا انسانی جسموں پر ڈرل سے سوراخ کرنے اور آبروریزی کے ان ۳۵۰۰ مقدمات کو دوبارہ شروع کرنے کا اعلان کیا ہے جو این آر او کے تحت معاف کر دیئے گئے تھے۔

ابھی پچھلے دنوں پاکستان کے ایک بہت بڑے چینل پر ملک کے ایک بہت بڑے آئینی قوانین کے ماہر وکیل نے اس بات کا انکشاف کیا کہ اب بھی ایوانِ صدر میں آصف علی زرداری کے مقربین ملک میں جاری کاروباری اداروں سے ۵۰ کروڑ سے لیکر ۸۰ کروڑ روپے کا کمیشن وصول کر رہے ہیں اور انہوں نے تو ان کے کچھ مقربین کے نام بھی گنوائے تھے جو اس کام میں ملوث ہیں۔ اب ان تمام معاملات کی کون تحقیق کرے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی اس قوم کے سامنے آسکے؟ این آر او کے گنگا جل میں غسل کرنے والے ۳۴ سیاستدانوں میں سے بیشتر اس وقت اقتدار میں ہیں اور اس کرپشن کے سب سے بڑے مجرم تو اس ملک کے ایوانِ صدر میں ملک کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہیں جو اس بات کا اعلان کر چکے ہیں کہ پاکستانی آئین کے تحت ان کو کسی بھی عدالت میں طلب نہیں کیا جا سکتا اور یہ بھی سننے میں آرہا ہے کہ وزارتِ قانون اور نیب کے دفاتر سے تیزی کے ساتھ تقریباً ایک ہزار سے زائد شواہد پر مبنی فائلوں کو ضائع کر دیا گیا ہے۔

اب ان حالات میں حکومت کا کون سا فرد ان مقدمات کی غیر جانبدارانہ تحقیق کر کے ان بد عنوان افراد کو کیفرِ کردار پہنچانے کی جسارت کرے گا؟ پولیس کس طرح اپنے ادارے کے سربراہ کے خلاف غیر جانبداری کے ساتھ شواہد اکٹھے کرے گی، بے لاگ تفتیش کے تقاضے کس طرح پورے ہوں گے؟ غیر جانبدار گواہوں کو عدالتوں کے کٹہرے میں کون لائے گا جو اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سچی گواہی کا حق ادا کریں گے؟ سرکاری وکلاء، پبلک پراسیکیوٹر کس طرح اپنے سربراہوں کے خلاف اپنی زبان کھولیں گے؟ ان حالات میں عدلیہ بغیر ثبوتوں اور شواہد کے کس طرح ان ملزمان کو سزا سنا سکے گی جب کہ ریاست کی پوری مشینری ان ملزمان کو ان مقدمات سے رہا کروانے کا فیصلہ کر چکی ہو گی؟ نیب کا وکیل اور حکومتی اٹارنی جنرل کس طرح ملک کے سربراہ آصف علی زرداری اور دوسرے حکومتی اعلیٰ عہدیداروں کے خلاف ایمانداری کے ساتھ اپنے فرضِ منصبی ادا کر سکیں گے؟

انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ وہ تمام افراد جن پر ان سنگین الزامات عائد کئے گئے ہیں، اپنے سرکاری عہدوں سے ہٹا دیئے جائیں لیکن این آر او سے مستفیذ سرکاری عہدیدار تو پہلے ہی اس بات کا اعلان کر چکے ہیں کہ وہ اپنے انہی عہدوں پر قائم رہتے ہوئے عدالتوں کا سامنا کریں گے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ حکمران اب بھی بدلتے موسموں کے تیور پہچاننے میں بڑی فاش غلطی کر رہی ہے۔ دیکھیں اب این آر او کا بھوکا جن دوبارہ بوتل میں قید ہوتا ہے یا پھر یہ تمام بد عنوان افراد ہمیشہ کے لئے اس کی خوراک بن جائیں گے!

رہے نام میرے رب کا جو ان افراد کی چالوں کے مقابلے میں بہترین حکمت عملی کا مالک ہے!

بے حسی شہر کی جب ایک حقیقت ٹھہری　　بے سبب قصہ پندار لئے پھرتا ہوں
جب کسی خواب کی ممکن نہیں تعبیر تو پھر　　کس لئے دیدہ بیدار لئے پھرتا ہوں

بروز سوموار ۳۱ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۰۳ نومبر ۲۰۰۹ء

سارتر کا فرانس

ان دونوں کا باپ ایک یہودی ہے جو برسوں سے فرانس کے دارلخلافہ پیرس میں مقیم ہے۔ تقریباً تین دہائیاں پہلے اس کی ملاقات ایک ایسی مسلمان خاتون سے ہوئی جس کے آباواجداد الجزائر سے اپنے بہتر مستقبل کی خاطر فرانس میں منتقل ہوئے تھے۔ پیرس کا آزاد ماحول اور چاروں طرف سے مذہب کی ذہنی غلامی سے نجات اور انسانی آزادی کے نعروں نے اس خاندان کو ایسا بنادیا کہ بس ان کے نام مسلمانوں جیسے تھے ورنہ وہ لوگ اپنی عادت واطوار' رہن سہن' اپنے روزمرہ معمولات اور اپنے خیالات کے اعتبار سے مغربی تہذیب میں رچے بسے ہوئے تھے۔ اس ذہنی آزادی اور خاندانی ماحول نے اس خاتون کو یہ محسوس بھی نہ ہونے دیا کہ وہ ایک یہودی کے عشق میں بری طرح مبتلا ہو چکی ہے' اور پھر ایک دن دونوں نے شادی رچالی' نہ کوئی بڑی خبر لگی اور نہ ہی اخباروں میں کوئی ایسا مضمون چھپا۔ بس ایسے تھا جیسے یورپ میں روزانہ ہزاروں شادیاں ہوتی ہیں۔ اللہ نے اس جوڑے کو دو خوبصورت بیٹیاں عطا کیں' دونوں نے ان کے نام اس طرح رکھے کہ مسلم' یہودی اور فرانسیسی جھلک ان میں نظر آتی رہے۔ ایک کا نام لیلیٰ لیوی اور دوسری کا نام ایلما لیوی رکھا۔

کچھ سال پہلے یہ دونوں بچیاں پیرس کے گردونواح میں ایک علاقہ اوبرویلرز کے ایک ہائی اسکول ہنری ویلن لائس میں زیرِ تعلیم تھیں۔ اپنی ذہانت اور تعلیمی کارکردگی کی وجہ سے انہیں اسکول کی بہترین طالب علموں میں شمار کیا جاتا تھا۔ پھر اچانک ایک دن ان دونوں کے خلاف اسکول نے ایک ڈسپلن بورڈ قائم کیا۔ دونوں کو ان کا جرم پڑھ کر سنایا گیا۔ فردِ جرم یہ تھی کہ ان دونوں لڑکیوں نے جن کا باپ لورنٹ لیوی یہودی ہے اور ماں ایک آزاد خیال مسلمان' انہوں نے چند دنوں سے اسکول میں سکارف پہن کر آنا شروع کر دیا تھا۔ اس ڈسپلن بورڈ کی رکن نے اس فردِ جرم میں اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ میں ریمی ویلتوئن اسکول کے اساتذہ کی یہ رائے تم کو سناتی ہوں کہ تم دونوں بہنیں اس سکارف میں دہشتگرد لگتی ہو۔

لڑکیوں نے اپنی صفائی میں کہا ہم ماں کی گود سے لیکر جوانی کی دہلیز تک اسی آزادانہ ماحول میں پڑھی بڑھی ہیں۔ ہم نے ان سب تقریبات میں حصہ لیا ہے جو یہاں کے ماحول میں رائج ہے ں اور ہمیں کسی قسم کی پابندی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہم نے ایسے سارے کام کئے جو فرانس کے قانون کے مطابق بھی اچھے خیال نہیں کئے جاتے لیکن گزشتہ دو سال سے پتہ نہیں کیوں وہ اسلام کی تعلیمات میں دلچسپی لینے لگیں۔ اللہ نے ان پر ہدائت کے دروازے کھولے اور انہوں نے اس مذہب کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا جو ان کی ماں کے لئے بھی اجنبی تھا حالانکہ وہ مسلمان کہلاتی ہے اور اب ہم سب اس نتیجے پر پہنچیں ہیں کہ ہمیں گھر سے باہر حجاب میں آنا چاہئے کیونکہ وہ مسلمان ہیں۔ انہیں اس بات پر حیرت ہے کہ وہ تمام کام جو وہ چوری چھپے کرتی رہیں ان کے پتہ لگنے پر بھی اسکول نے کوئی ڈسپلن بورڈ نہیں بٹھایا جب کہ حجاب پہننے کے ایک ہفتے بعد آج وہ اس جرم کا سامنا کر رہی ہیں جو ان کا بحیثیت مسلمان اور فرانس کے شہری کے طور پر بنیادی حق ہے۔

ڈسپلن بورڈ نے انہیں حجاب اتارنے کو کہا' دونوں نے انکار کر دیا اور پھر رعائت دیتے ہوئے کہا گیا کہ کم از کم حجاب اتنا ڈھیلا کر دو کہ اس سے کان گردن اور

بالوں کا آغاز نظر آ سکے لیکن لیلیٰ اور ایلما نے ایسا کرنے سے بھی انکار کر دیا اور پھر اکتوبر ۲۰۰۳ء کی ایک صبح اسکول کی انتظامیہ نے اعلان کر دیا کہ تم دونوں کا نام اسکول سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اس فیصلے پر دونوں فریق خوش تھے' اسکول کے اربابِ اختیار بھی اور اللہ کی رضا پر لیلیٰ اور ایلما بھی۔ دونوں بچیوں نے اپنی تعلیم اپنے گھر پر رہ کر جاری رکھنے کا اعلان کر دیا اور کہا کہ ہم دیکھیں گی کہ یہ قانون ہمیں علم کے دروازے سے کس طرح باہر رکھتا ہے۔

یہ وہی فرانس ہے جس کی گلیوں نے عیسائی پادریوں کے مذہبی قبضے سے جنم لینے والے ظلم و ستم کی داستان دیکھی ہے۔ ہزاروں افراد کو بڑے بڑے چھروں' جنہیں گیلوٹین کہا جاتا ہے' کے نیچے لٹا کر ذبح کیا گیا' بہت سے لوگوں کی ٹولیوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ جان آف آرک کی جلتی ہوئی لاش آج بھی فرانس کے اس دور کی مکروہ ترین تصویر ہے۔ پھر انقلابِ فرانس آیا' بادشاہوں شہزادوں اور پادریوں کے گھر گھٹنوں تک خون میں ڈوب گئے اور فرانس کے عوام نے کہا کہ حکومت اور مذہب دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ہم سیکولر ہیں' یہاں پر ہر کسی کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہے اور سارتر کا فرانس نمودار ہوا' آزادی اظہار اور عمل کا فرانس! لیکن حیرت کی بات ہے کہ اگر آج بھی ایک یہودی اپنی چھوٹی سی کالی ٹوپی پہن کر فرانس میں گھومے تو کوئی نہیں روکتا' کوئی عورت اپنے ہیٹ کی نمائش کرتی ہو یا کوئی اپنے منہ پر صحافیوں سے چھپنے کے لئے جالی دار نقاب اوڑھ لے تو کوئی سوال نہیں کرتا' پوری دنیا میں سب سے زیادہ ایسے ساحل صرف فرانس میں ہیں جہاں کپڑوں سے آزاد ہو کر گھوما پھرا جاتا ہے' وہاں لوگ اپنے کریہہ سے کریہہ اور بے ڈھب سے بے ڈھب اور آنکھوں کے لئے غیر جاذب نظر جسم بھی دکھائیں تو پرواہ نہیں لیکن دو مسلمان لڑکیوں نے اپنا سر ڈھانپا تو ایک زلزلہ آ گیا۔

ایسا ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہئے۔ شرمندہ قوموں اور مغلوب حکمرانوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے لیکن اس سارے قصے میں ایک ایسا بیان میری نظروں سے گزرا ہے جو مجھے شرمندگی کی گہرائیوں میں لے گیا۔ وہ بیان ان لڑکیوں کی دادی کا تھا۔ ایک باعمل یہودی عورت جس نے فرانس کے سب سے مقبول اخبار ''لے موندا'' میں بیان دیتے ہوئے کہا' اصل میں ان لڑکیوں میں یہودی خون ہے جس نے انہیں مذہب کی طرف راغب کر دیا اور آج اگر وہ مسلمان ہیں تو کل یہودی ہونے کا بھی امکان ہے۔ یہ بیان ان لڑکیوں کی دادی نے چند سال پہلے ایک اخبار کو دیا تھا اور اب تک ایک ارب سے زائد مسلمانوں کی اس دنیا میں کوئی ایک شخص ایسا نہ اٹھا کہ یہ پکارتا کہ یہ صرف اس ماں کی رگوں میں مسلمان کا خون ہی نہیں بلکہ میرے مذہب کی سچائی تھی جو ان بچیوں کو اس مادر پدر آزاد معاشرے میں اتنا بہادر اور جرات مند بنا گئی۔

اپنے گھروں میں آرام' سکون اور اطمینان سے زندگی بسر کرنے والو مسلمانو! تمہارے بچے اسکول بھی جاتے ہیں اور نکالے جانے والے خوف سے بھی آزاد ہیں' تم پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے دروازے بھی کھول رکھے ہیں لیکن کوئی ہے جو قیامت کے دن اس سوال کا جواب دے سکے کہ تم میں تو اس یہودی بوڑھی عورت جتنا بھی اپنے مذہب پر فخر' غرور اور مان نہیں تھا۔ اگر تمہیں اس مذہب پر فخر نہیں تھا تو کس منہ سے اس کے رسول ﷺ کی شفاعت کے طلبگار ہو' کس حیثیت سے کوثر کے پانی کی امید لے کر آئے ہو!

رہے نام میرے رب کا جس نے اپنے نبیوں کے اس دین کے ذریعے عزت بخشی!

کیا نام کا پوچھو ہو کہ ہے ننگ میرا نام اور ننگ کا بس یہ ہے کہ دنیا ہے نہ دیں ہے
کچھ اس طرح اب شہر میں رقصاں ہیں بگولے بے چادر و بے سایہ ہر ایک پردہ نشیں ہے

بروز منگل ۱۴/ذوالحج ۱۴۳۰ھ یکم دسمبر ۲۰۰۹ء

احساس کی کھیتی

یقین جانئے کہ ان رسوائیوں اور جگ ہنسائیوں کی کڑی رت میں زندہ رہنے کے لئے پتھر کا دل مطلوب ہے۔ جگر چاک کر دینے والی ہوائیں تو گویا ہمارا مقدر بنادی گئیں ہیں اور پچھلی ایک دہائی کے دوران اتنا کچھ ہو گیا جو صدیوں میں نہیں ہوا تھا۔ ستم تو ٹوٹتے رہے، خیمے نذرِ آتش ہوتے رہے، لہو بہتا رہا، بستیاں ویران ہوتی رہیں، کڑیل جوانیاں تلواروں کا رزق ہوتی رہیں لیکن آنکھیں کبھی رونا نہیں بھولی تھیں، دلوں کی دھڑکنیں کبھی اتنی بانجھ نہیں ہوئی تھیں اور احساس کی کھیتی کبھی اتنی بنجر نہیں ہوئی تھی۔ بے حسی اور لاتعلقی کبھی اس طرح دستورِ حیات نہیں بنی تھی اور خوف نے کبھی اس طرح ہمیں اپنے چنگل میں نہیں لیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو پرسہ دینا بھی بھول جائیں۔

باباجی بغیر کسی تاخیر کے ہر ایک کالم پر اپنی محبت بھری رائے کا اظہار ضرور کرتے ہیں لیکن شائد حج کی مصروفیات کی بناء پر کچھ زیادہ ہی تاخیر ہو گئی تو میں نے عید کی مبارکباد کے بہانے ان کے موبائل ٹیلیفون پر ان کی خیریت پوچھنے کی جسارت کر ڈالی۔ مجھے اس بات کا ہمیشہ یقین رہا ہے کہ ان کی محبت بھری دعاں میں میرا نام ضرور رہتا ہے۔ مجھے اب بھی یقین تھا وہی باہمی محبت واحترام کے رشتے کی دلداری اور مروت کی مانوس رس گھولتی شیریں آواز میرا خیر مقدم کرے گی اور حسبِ معمول بہت سی دعاوں سے کلام کا آغاز ہو گا لیکن ان کی بجھی ہوئی آواز اور سوال نے میرے رگ وپے میں چنگاریاں سی بھر دیں۔ ''لندن میں تو ٹھیک ٹھاک سردی شروع ہو گئی ہو گی لیکن آپ نے تو گھروں میں تمام موسموں کی ہر قسم کی تمازت سے بچاو کا بہترین انتظام کر رکھا ہے'' لیکن یہ سرد موسم کشمیر، عراق، افغانستان، چیچنیا اور فلسطین میں ان مظلوم اور بیکس باسیوں پر کیا ستم ڈھا رہا ہو گا، بس یہ سوچ کر پریشان رہتا ہوں۔ ان کی یہ پریشانی مجھے شرمندہ کرنے کے لئے کافی تھی۔ واقعی لندن میں ٹھیک ٹھاک سردی شروع ہو چکی ہے اور یہاں گھروں اور دفاتر میں سنٹرل ہیٹنگ کی بناء پر سردی کا کوئی احساس چھو کر بھی نہیں گزرتا بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے موسم بدلا ہی نہیں، اس وقت ہم سب گرمیوں والے ہلکے پھلکے کپڑے پہنے گھوم رہے ہیں لیکن آج مجھے اس خیال نے انتہائی پریشان کر دیا ہے کہ سردیاں تو کشمیر، عراق، افغانستان، چیچنیا اور فلسطین میں بھی آگئی ہوں گی، وہاں میرے بھائی اور میری بہنیں نجانے کس حال میں ہوں گے؟ چھوٹے چھوٹے بچوں پر کیا گزر رہی ہو گی؟ یہ سوچ کر میرے اندر شدید احساسِ گناہ بڑھتا جا رہا ہے جیسے میں اپنے گھر یا دفتر کو گرم رکھنے کی تدبیر کر کے کوئی بہت بڑا جرم کر رہا ہوں۔

ان بیچاروں پر تو سردی کے علاوہ بھی بڑے ظلم ہو رہے ہیں۔ محض اس لئے کہ وہ صرف اللہ کے حضور جھکنا چاہتے ہیں۔ نجانے ایک دفعہ پھر میرے خیالات مجھے ارضِ پاک کی طرف کھینچ کر لے گئے جہاں غریبوں کے پاس تن ڈھانپنے کو بھی کپڑے میسر نہیں، وہ اپنے ٹھنڈے گھروں کو کیسے گرم کرتے ہوں گے؟ اخبارات اور ٹیلی ویژن سے دور رہنے کی کوشش بھی کرتا ہوں کہ خواہ مخواہ پریشانی میں اضافہ ہوتا رہے گا لیکن اس احساسِ گناہ کا کیا کروں جو میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا۔ اب تو گرم بستر میں احساس کی خنکی نے نیند کو میلوں دور بھگا دیا ہے۔ اللہ ہم سب کے حالات پر رحم فرمائے۔ آمین باباجی بڑے خوش بخت انسان ہیں اور گاہے بگاہے دوستوں کے دلوں پر بے حسی کا فالج نہیں گرنے دیتے، اپنے دوست احباب کے دلوں کی دھڑکنوں کو درد کی لذت سے ہر وقت آشنا رکھنے کی ذمہ داری بخوبی نبھاتے رہتے ہیں اور انہیں گرد وپیش سے بیگانہ نہیں ہونے دیتے کہ وہ گھر کی دیواروں کے باہر

دیکھنا بھول جائیں۔

موسم بڑے بے لحاظ ہوتے ہیں، جب ہڈیوں کے گودے تک کو جما دینے والی برفانی ہوائیں چکا چوند شہروں کی عالی نسب کوٹھیوں سے ٹکراتی ہیں تو ذرا دیر میں وہیں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ مقفل دروازوں، بند کھڑکیوں اور ہوا بند دریچوں سے ادھر کمروں کے اندر تک جانا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ آتشدانوں میں دہکتی چیختی لکڑیاں اور کمروں کو گرم رکھنے کے سو سو طرح کے حیلوں کے باعث زمستانی ہواوں کی ساری شوخیاں دہلیز پر ہی دم توڑ بیٹھتی ہیں لیکن جب موسم کے یہی تیور بے آب و رنگ بستیوں کے کچے گھروں تک پہنچتے ہیں تو ان کا ستم پورے جوبن پر ہوتا ہے۔ کسی کو خبر نہیں ہو پاتی کہ یہ ہوائیں ان بستیوں اور ان گھروں کا کیا کچھ لے گئیں اور کتنے معصوم بچے نامہربان رت کی بھینٹ چڑھ گئے۔

بلاشبہ سامراج کے شکنجوں میں جکڑے سبھی لوگ اسی عذابِ پیہم سے دوچار ہیں اور کوئی نہیں جو ان کی چارہ گری کا سامان کرے۔ یہ فاقہ زدہ عوام جن کے پاس نہ پیٹ بھرنے کو کچھ ہے، نہ تن ڈھانپنے کو اور نہ سر چھپانے کو کوئی چھت اور اس پر مستزاد یہ کہ قصرِ سفید کے فرعون نے ان کی زندگی پر اتنے چرکے لگائے ہیں کہ ان کی ایک ایک سانس اذیت بن کر رہ گئی ہے۔ آسودگی اور فارغ البالی تو ان سخت جانوں کی تقدیر میں پہلے بھی نہیں تھی لیکن اب تو لاتعداد نئے مسائل کے جہنم بھڑک اٹھے ہیں۔ سہراب گوٹھ کے نواح میں ایک خستہ بستی کی فاطمہ بی بی کئی سالوں کے بعد آج میرے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لئے پھر سے آ کھڑی ہوئی ہے۔ وہ اکثر اپنی گود میں رنگ برنگے کپڑے لئے سکتے کی حالت میں آسمان کو گھورتی رہتی تھی، کبھی بے ساختہ ان کپڑوں کو چومتی، سینے سے لگاتی اور پھر اپنی آنکھوں پر انہی کپڑوں کو رکھ کر اس دردناک انداز میں زار و قطار روتی تھی کہ دیکھنے والوں کے دل بھی پارہ پارہ ہو جاتے تھے۔

یہ رنگ برنگے کپڑے اس کی پانچ سالہ بیٹی عائشہ کے تھے جو اچانک اس طرح غائب کر دی گئی کہ اس کا سراغ تک ملنا محال ہو گیا۔ متحدہ عرب امارات سے ۴۲ بچے ایدھی سنٹر کراچی میں پہنچے تو سب سے پہلے فاطمہ بی بی اپنے شوہر زرگل کے ساتھ ایدھی سنٹر میں اپنی بیٹی کے ملنے کی آس میں وہاں پہنچی لیکن اس دل جلی کی آس ایک دفعہ پھر ٹوٹ گئی۔ یہ وہ بچے تھے جو گزشتہ ایک سال میں اغوا کر کے اسمگلروں کے ہاتھوں فروخت کر دیئے گئے تھے اور یہ بچے اب اونٹ ریس کے دھندے میں استعمال ہو رہے تھے۔

موجودہ حکومت کے تاسیسی اجتماع میں بہت شعلہ بار تقریریں ہوئیں لیکن کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ ان غربت کی چتا میں جلنے والوں کے لئے کسی عملی اقدامات کا ذکر کیا گیا ہو۔ کسی نے ان معصوم بچوں کا تذکرہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھا جو باقی بچ جانے والی سردیوں بھی آدھی آستینوں والی ادھڑی ہوئی قمیضوں میں گزار دیں گے یا کسی دن چپ چاپ اپنی ماوں کی آغوش میں دم توڑ دیں گے۔

ستم تو یہ ہے کہ اگر کوئی فرد یا کوئی ادارہ ان جاں بلب لوگوں کو دوا، کپڑا، کمبل یا روٹی دینا چاہے تو وہ ''القاعدہ'' کی معاونت کرنے والا دہشت گرد قرار پاتا ہے۔ان جیسے غریبوں کو پکی پکائی روٹی پہنچانے والے الرشید ٹرسٹ کی جس طرح مشکیں کسی گئی ہیں اب کون ایسی جرات کرے گا۔امریکا بہادر اب تک ۳۴۹ تنظیموں پر پابندی لگا چکا ہے جو سب کی سب مسلم تنظیمیں ہیں بلکہ ہماری حکومت نے تو خود اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے مگر دوسری طرف صرف پاکستان میں پانچ ہزار سے زائد این جی اوز امریکی مقاصد کو پروان چڑھانے کے لئے شب و روز سر گرم ہیں۔

بابا جی شائد آپ کو معلوم نہیں کہ آج کے پاکستان میں ایک کھرب ۵۶ ارب کی قومی دولت لوٹنے والے تو قومی ہیرو بن گئے ہیں اور ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہیں لیکن کسی غریب کو روٹی کھلانا، کسی آفت زدہ بستی کے لئے دوائیں بھیجنا، کسی خیراتی ادارے کو چندہ دینا اور کسی مجبور و مقہور کے زخموں پر مرہم رکھنا کبیرہ گناہوں میں شامل کر دیا گیا ہے۔ سکون چاہئے تو اپنی آنکھیں اور کان بند کر کے ہونٹوں کو سی لیں، اسی میں عافیت ہے وگرنہ!

ایک مہربان نے بڑی دلسوزی کے ساتھ ایک سوال کیا ہے کہ ان دنوں قربانی کا ایک بکرہ جس کا گوشت صرف بارہ کلو ہے، بارہ ہزار روپے میں فروخت ہوا ہے۔ گویا ایک کلو گوشت کی قیمت ہزار روپیہ ٹھہری لیکن اگر اس کے مقابلے میں بارہ ہزار کا پچاس کلو گوشت خرید کر غریبوں میں بانٹ دیا جائے تو آپ کیا کہیں گے؟

رہے نام میرے رب کا جو جزا و سزا کے دن کا مالک ہے

مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

بروز بدھ ۱۵/ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۲ دسمبر ۲۰۰۹ء

اپنا شیطان

جارج بش کے منہ سے ''کروسیڈ'' کا لفظ اس روانی اور بے ساختگی سے نکلا تھا کہ بعد میں اسے نگلنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ یہ ایک بیمار شخص کی مضمحل سوچ اور مسلمانوں کے خلاف اس کے متعفن جذبات کی ترجمانی کرنے والا ایسا خاردار لفظ تھا جس میں نفرتوں کے الاؤ بھڑک رہے تھے۔ بش نے اس پر رسمی معذرت تو کر لی لیکن افغانستان اور عراق پر ٹوٹنے والی قیامت نے جارج بش اور اس کے ساتھیوں کے قلب و دماغ میں کلبلاتی مسلم دشمنی کو پوری طرح بے نقاب کر دیا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں مسلم کشی کا معرکہ مسلسل ابھی تک جاری ہے اور ''کروسیڈ'' کا نعرہ واپس لئے جانے کے باوجود عملاً ابھی تک فضاؤں میں گونج رہا ہے۔

قصر سفید کے فرعون جارج بش کا مقرر کردہ امریکی افواج کا ڈپٹی انڈر سیکرٹری آف ڈیفنس لیفٹیننٹ جنرل ولیم بوائیکن وہذیان میں اس قدر آگے بڑھ گیا تھا کہ اس کا بیان آج تک مسلمانوں کے کانوں میں پگھلے سیسے کی طرح دوڑ جاتا ہے کہ ''مسلم انتہا پسندوں کے خلاف ہماری جنگ دراصل شیطان کے خلاف جنگ ہے' یہ لوگ امریکا کو تباہ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ عیسائیوں کا ملک ہے۔'' جنرل ولیم نے یہ بیان اس وقت جاری کیا جب وہ فوجی انٹیلی جنس شعبے کا سربراہ تھا۔ وہ ایک کٹر انتہا پسند عیسائی کی شہرت رکھتا تھا اور اکثر اپنی فوجی وردی پہن کر گرجوں اور عیسائی تقریبات میں اپنے خیالات کا وعظ کھلم کھلا کرتا تھا اور اب بھی وہ اسی مشن پر امریکا بھر میں مختلف تقریبات میں اپنے انہی مکروہ خیالات کو پھیلانے میں مصروف ہے۔

امریکا کے ایک معروف ٹی وی چینل این بی سی کو اپنے آڈیو بیان میں اس نے مسلم انتہا پسندوں کو ابلیس قرار دیا اور اس بیان کو امریکا کے تقریباً تمام میڈیا نے جلی سرخیوں کے ساتھ نشر بھی کیا اور اس کی اشاعت بھی ایک غیر معمولی انداز میں کی گئی۔ بات جب زیادہ بڑھی تو تو جنرل پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اپنا بیان واپس لے لیکن اس نے اس بیان کو واپس لینے سے صاف انکار کر دیا تھا البتہ اپنے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے اتنا ضرور کہا کہ ''میں کوئی انتہا پسند عیسائی نہیں ہوں' سیدھا سادہ سپاہی ہوں اور اپنے عقیدے پر کاربند ہوں۔ میرے خیال میں کچھ انتہا پسند امریکا پر حملے کرنے کے لئے اسلام کا نام استعمال کر رہے ہیں جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں اور یہ لوگ اسلام کے سچے پیروکار نہیں ہیں' میرے خیال میں وہ صرف دہشت گرد ہیں۔ میرے ریمارکس سے جن لوگوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں، میں ان سے معافی کا خواستگار ہوں۔

جنرل نے اگر ''دہشت گردوں کے خلاف جنگ'' کو شیطان کی جنگ قرار دیا ہوتا تو بات مختلف تھی لیکن اس نے صاف صاف ''مسلم انتہا پسندوں'' کے الفاظ استعمال کر کے انہیں شیطانی گروہ قرار دے ڈالا جس سے اس کے خبثِ باطن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گوپینٹا گون کے اعلیٰ افسر نے آگ پر پانی ڈالنے کے لئے سرکاری طور پر اعلان جاری کیا ''کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو مذہبوں کے مابین جنگ قرار دے''۔

اسی زمانے میں اے بی سی ٹیلیویژن کے ایک پروگرام میں جب نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر کنڈولیزا رائس سے پوچھا گیا ''کیا صدر بش' جنرل ولیم کے

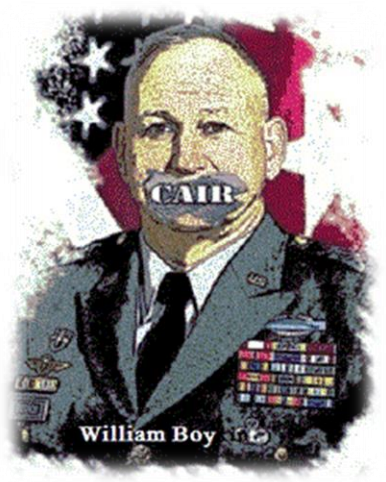

ریمارکس کی مذمت کریں گے ؟''تو کنڈولیزا رائس نے فوری جواب دیا کہ ''اس مسئلے پر صدر کے خیالات بالکل واضح ہیں' وہ اسے مذاہب کی جنگ نہیں سمجھتے' یہ چند جنونیوں اور قاتلوں کا گروہ ہے جو اسلام جیسے عظیم مذہب کی آڑ لیکر اس کی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر انسانی جانوں کے قتل کا جواز تلاش کر رہے ہیں۔اسلام ایک امن پسند مذہب ہے اور صدر بش اسلام کے پیروکاروں کا بڑا احترام کرتے ہیں۔''بش کے دورِ حکومت میں ڈیموکریٹ کے متعدد ارکان کانگرس نے یہ مطالبہ کیا کہ اعلیٰ ترین سرکاری سطح سے جنرل ولیم کے ریمارکس کی مذمت کی جائے لیکن کچھ نادیدہ قوتوں نے ایسا نہ ہونے دیا۔اس وقت کے وزیرِ دفاع ڈونالڈ رمز فیلڈ سے پوچھا گیا تو موصوف نے بھی جنرل کے ریمارکس کی مذمت کرنے کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک شاندار ملٹری ریکارڈ رکھنے والا عمدہ افسر ہے۔

یہ سارا واقعہ یہاں دہرانے کی وجہ یہ ہے کہ کیا امریکا کی موجودہ حکومت کا کردار پچھلی حکومت سے مختلف ہے ؟ جس طرح غلاظت کے ڈھیر پر عطر چھڑکنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اسی طرح دلوں کے میل' ذہنوں کی کدورت اور سوچوں کے تعفن کو خوبصورت جملوں میں چھپانے کی کوششوں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔جنرل ولیم نے دراصل اپنے زمانے کے فرعون جارج بش کے ''کروسیڈ'' کا سلیس زبان میں ترجمہ کیا تھا تاکہ ان ''غازیانِ صف شکن'' کے دلوں میں کوئی شک وشبہ نہ رہے جو جارج بش کی بھڑکائی ہوئی آگ کا ایندھن بننے پر نازاں تھے اور جو اہلِ حرم کے سینے چھلنی کرنے کو جہادِ اکبر سے تعبیر کر رہے تھے۔

امریکی سوچ اور عزائم کا مطالعہ کرنے کے لئے افلاطون کا ذہن نہیں چاہئے۔وہ ''دہشت گردی کے خاتمے'' کے نام پر اسلامی تہذیب' اسلامی ثقافت' اسلام کے نظریاتی تشخص' اسلامی حریت اور فعال تصورِ حیات' اسلام کے جہادی پہلو اور اسلام کی توانا فکر کو نشانہ بنا رہا ہے وہ کسی اسلامی مملکت کو ایٹمی قوت سے آراستہ' اقتصادی طور پر توانا' بہتر اسلحے سے لیس اور جدید ٹیکنالوجی سے بہرہ مند نہیں دیکھنا چاہتا۔وہ کسی اسلامی مملکت میں حقیقی اور مستحکم حکومت دیکھنے کا روادار بھی نہیں۔اسے بموں کی ماوں کی آزمائش کے لئے صرف گنبدوں اور میناروں والے شہر ہی دکھائی دیتے ہیں۔اس کا لشکر کابل پر ''فتوحات'' کے پرچم لہرانے کے بعد بغداد میں پڑاو کرتا ہے اور اگلے نشانے کے طور پر شام اور ایران کا نام لینے والا اب اچانک پاکستان کی طرف رخ کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اسرائیل اپنی ٹوکری میں نجانے کتنے ایٹمی انڈے لئے بیٹھا ہے لیکن امریکا عالمِ اسلام کے وجود میں کاشت کئے گئے اس سرطان کی مسلسل پرورش کر رہا ہے۔بھارت اس کے نزدیک ایک مہذب اور ذمہ دار ملک ہے جس کے ایٹم بم شریف زادوں کی طرح معصوم ہیں جبکہ سارے افسانے ہمارے لئے گھڑے جاتے ہیں۔یہ معاملہ گزشتہ آٹھ سالوں کے دوران نہ کسی اہم مسلم پلیٹ فارم پر زیرِ بحث آیا' نہ اسے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اٹھایا گیا' نہ اسلامی کانفرنس نے اسے قابل غور سمجھا' اور نہ سعودی فرمانروا شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز اور پاکستانی لیڈروں کے باہمی مذاکرات کے ایجنڈے پر آیا کہ یہ کون سی ''دہشت گردی'' ہے جس کے خلاف ہم برسرِ جہاد ہیں ؟ اگر کسی شخص' تنظیم' گروہ یا ملک کو دہشت گرد قرار دینے کا فتویٰ صرف قصرِ سفید

(وائٹ ہاوس) سے ہی جاری ہونا ہے اور ہمارا کام صرف اس قدر ہے کہ چودھری کے کارندوں کی طرح اپنی لاٹھیاں، کلہاڑیاں، برچھیاں اور بندوقیں اٹھا کر نکل کھڑے ہوں تو پھر جان لیں کہ یہ جنگ ٹھکانے ضرور بدلتی رہے گی لیکن اس کا نشانہ صرف کلمہ گو مسلمان ہی رہیں گے۔

ہم نے سوات اور وزیرستان میں اس راز کو بخوبی پالیا ہے کہ یہ جنگجو کن کی ایماء پر اور کن کے اشاروں پر لڑ رہے ہیں۔ وزیرستان کا محاذ گرم ہوا تو پھر فوری طور پر امریکا اور اس کی حلیف نیٹو فورسز نے پاک افغان سرحد پر اپنے ایجنٹوں کے لئے نہ صرف وہ چوکیاں ختم کر دیں بلکہ اپنے تین بڑے ہیلی کاپٹر بھیج کر ان کو محفوظ مقامات پر بھی پہنچا دیا۔ ہزاروں میل دور سے امریکا کا صدر اور اعلیٰ شخصیات اور نیٹو فورسز میں شامل افواج ممالک کے سربراہ تو ایک تسلسل کے ساتھ اپنے فوجیوں کا حوصلہ بڑھانے اور یکجہتی کا مظاہرہ کرنے ان کے درمیان موجود رہتے ہیں لیکن اب تک ہماری موجودہ حکومت کو یا اس کی حکومت کے کسی دوسرے عہدیدار کو عید کے روز بھی اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ان فوجیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے چند فرصت کی گھڑیاں نکال سکیں جو اپنی جانوں پر کھیل کر اس ملک کی آزادی کی حفاظت کر رہے ہیں۔

امریکا کے جو خونخوار لشکر کابل و قندھار کو نذرِ آتش کر سکتے ہیں، بصرہ اور بغداد کو خون میں نہلا سکتے ہیں، ان کے لئے عالمِ اسلام کی کوئی بستی یا کوئی قریہ مقدس نہیں۔ قصرِ سفید میں بیٹھنے والا اپنے نام اور رنگ میں مختلف ہو سکتا ہے لیکن ان کی ڈوریاں مسلسل انہی کے ہاتھوں میں ہیں جو اپنے مقاصد کی تکمیل ہیں مسلم دنیا میں کبھی بھی کسی خوفناک تباہی سے گریز نہیں کریں گے۔ اگر آج بھی ہم ''دہشت گردوں'' کو باراک اوبامہ کی آنکھ سے دیکھتے رہے اور ہلری کلنٹن کی میزان پر تولتے رہے تو ہمارا انجام اس زیاں کار قبیلے سے مختلف نہ ہو گا جس کی کمانوں سے نکلے تیر خود اسی کا سینہ چھلنی کر دیتے ہیں اور وہ اس پر بھی فتح و نصرت کے نعرے لگاتا رہتا ہے۔

امریکی صدر باراک اوبامہ نے اپنے نئے افغان منصوبے اور بھارتی ہم منصب من موہن سنگھ کے ساتھ ملاقات کے بعد اپنی مشترکہ پریس کانفرنس میں بتا دیا ہے کہ اس کی جنگ کس ''شیطان'' کے خلاف ہے؟ ہماری تلواریں کس کا لہو پینے کے لئے بے نیام ہیں؟ ہمیں اپنا شیطان پہچاننے میں مزید کتنی صدیاں لگیں گی؟

رہے نام میرے رب کا جس نے اپنے بندوں کو شیطان سے بچنے کا حکم دیا ہے!

ہمیں تو اپنے سمندر کی ریت کافی ہے
تو اپنے چشمہ بے فیض کو سنبھال کے رکھ

بروز جمعۃ المبارک ۱۷/ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۴ دسمبر ۲۰۰۹ء

سنگ دل کون؟

سقراط جب زہر کا پیالہ پی چکا تو اس کے شاگرد کریٹو نے پوچھا کہ استاد بتا ہم تیرے تجہیز و تکفین کن رسموں کے مطابق کریں۔ ''میری تجہیز و تکفین؟'' سقراط ہنسا اور پھر سنجیدگی سے بولا ''کریٹو! میں نے تم لوگوں کو تمام عمر سمجھایا کہ لفظوں کو ان کے صحیح معنوں میں استعمال کیا کرو مگر معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے۔

نائن الیون کے بعد امریکی قوم کو گمراہ کرنے کے لئے قصر سفید کے فرعون جارج بش نے بھی لفظوں کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے کا گھٹیا انداز اپنایا تھا جس میں اس جنگ کو ''کروسیڈ'' کا نام دیکر اپنے متعصب ذہنیت کا ثبوت دیا تھا لیکن اس کے فوری بعد اپنے اس بیان کی تشریح میں انہوں نے پینترہ بدلتے ہوئے یہ کہا ''یہ جنگ مسلمانوں کے نہیں بلکہ دہشت گردوں کے خلاف ہے۔'' دہشت گردی کی اس جنگ کو خود بش نے لاشعوری طور پر ''صلیبی جنگ'' کا نام دیا تھا اور بش کے اس بیان پر قدامت پسند عیسائی اور صہیونی طاقتوں نے اس کا بھرپور ساتھ دینے کا اعلان بھی کیا تھا اور وہ طاقتیں اب تک مسلسل اس جنگ کو مذہبی جنگ سے تعبیر کر رہے ہیں لیکن جب اس پر اعتراض ہوا تو بش نے خود تو اس کی فوراً تردید کر دی لیکن امریکی انٹیلی جنس کے ڈپٹی سیکرٹری لیفٹیننٹ جنرل ولیم بوائے کن نے اپنے اس متعصبانہ بیان سے بغیر کسی لگی لپٹی کے برملا بش کے منافقانہ لفظوں کو بے نقاب کر ڈالا۔

"The war on Terrorism is a battle between a Christian Army and Satan, The most Muslim worship"Idol" and not a real God.

ترجمہ: ''دہشت گردی کی جنگ عیسائی فوج اور شیطان (مسلمانوں) کے درمیان لڑی جا رہی ہے۔ مسلمان اصل خدا کی نہیں بلکہ ایک ''بت'' کی پوجا کرتے ہیں۔

لیفٹیننٹ جنرل ولیم بوائے کن نے باوردی کلیسا کے ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے بڑے جرات مندانہ اور پراعتماد انداز میں اپنی تقریر میں ان الفاظ کو کئی مرتبہ استعمال کیا اور اسی لیفٹیننٹ جنرل ولیم بوائے کن نے یہی الفاظ ۱۹۹۳ء میں صومالیہ جنگ کے دوران کسی بے بس مسلمان کو بھی کہے تھے جب اس نے کہا تھا کہ ''اس کا اللہ اسے امریکی فوج سے نجات دلائے گا۔'' اس جنرل نے نہ صرف یہ الفاظ ''ہم مذہبی جنگ لڑ رہے ہیں' شیطان (مسلمان) ہماری قوم اور ہماری عیسائی فوج کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں'' اپنی تقریر میں بار بار دہرائے بلکہ اس نے یہ بھی انکشاف کیا ''صدر بش کو امریکی عوام کی اکثریت کے ووٹ نے نہیں بلکہ خدا نے انہیں وائٹ ہاوس میں بٹھایا ہے'' اس جنرل کا یہ بیہودہ جملہ اس وقت بھی عیسائیوں کے ''گاڈ'' کو ایک دہشت گرد اور ظالم ثابت کرتا تھا جس نے آج صدر باراک اوبامہ کو وائٹ ہاوس میں بٹھار کھا ہے۔ امریکا کا آئین ۱۷۸۹ء میں منظور ہوا جو ہنوز رائج ہے' اس کے مطابق اقتدار کا سرچشمہ ملک کے عوام ہیں۔

۱۷۹۳ء میں پہلی ترمیم منظور کی گئی کہ کانگریس مذہب کے قیام یا مذہب کی آزادی پر پابندی کے سلسلے میں کوئی قانون پاس نہیں کرے گی جب کہ نائن

الیون کے منصوبے کے بعد اس آئین کی خلاف ورزی کرنے والی خود امریکی حکومت ہے جس نے اب تک لیفٹیننٹ جنرل ولیم بوائے کن جیسے کئی اور افراد کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے اور اس جسارت کے بعد یورپ میں بھی اسلام کے بارے میں تحریر و تقریر میں منافرت کا اظہار آئے دن بڑھتا جارہا ہے۔ نائن الیون کے بعد سے مسلمانوں کے علاوہ ہر قوم کو اپنے مذہب کے خلاف بولنے والے کو عدالت کے کٹہرے میں لیجانے کی مکمل آزادی ہے جبکہ مسلمان اہلِ کتاب کے بارے میں زبان کھولے تو اسے میڈیا کے ذریعے رسوا کیا جاتا ہے بلکہ برسوں کے لئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا جاتا ہے۔ بوائے کن، فرینکلن گراہم، پیٹ رابرٹسن اور جیری فال ویل جیسے عیسائی رہنما اور لیڈران کھلم کھلا اپنے جوشیلے بیانات سے اس صدی کی صلیبی جنگوں کو جنم دے رہے ہیں۔

جب بھی مسلمان کمزور ہوا، دشمنانِ اسلام نے اس کو زوال کے قبرستان میں دفن کر دینا چاہا۔ جن دنوں عباسیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا، مسلمانوں کی سیاسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر یورپ کے عیسائی پیشواوں نے تمام یورپ کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا کہ وہ بیت المقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے چھین کر وہاں دوبارہ عیسائی سلطنت قائم کریں۔ ان دنوں عیسائیوں میں ایک مذہبی عقیدہ یہ بھی تھا کہ حضرت عیسٰی اس روئے زمین پر نازل ہو کر ایک ہزار برس کے لئے ایک ایسی عیسائی سلطنت قائم کریں گے جس میں امن صلح و آشتی کا دور دورہ ہو گا۔ ان کا خیال تھا کہ اس بے نظیر انقلاب کا آغاز مسلمانوں کو فلسطین سے نکالنے کے بعد شروع ہو گا، چنانچہ مختلف عیسائی ممالک کے سپاہی اس مقدس فرض کے لئے کمربستہ ہو گئے۔

مسلمان علاقوں پر حملے شروع کر دیئے گئے جس کا سلسلہ کم و بیش دو سو سال تک جاری رہا اور مسلمانوں کا بے دریغ قتلِ عام ہوا۔ عیسائیوں کے نوے برس بیت المقدس پر تسلط کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے بیت المقدس کو آزاد کروایا۔ صلیبی جنگوں سے عیسائیوں کو کوئی خاص فائدہ تو نہ ہو سکا البتہ ان کے بے پناہ قتل و غارت اور خونریزی سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان نفرت کی خلیج زیادہ وسیع ہو گئی۔ آج امت مسلمہ میں کوئی صلاح الدین ایوبیؒ نہیں البتہ صلیبی جنگوں کے سیاہ بادل امت مسلمہ کو چاروں اطراف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ''پہلی جنگ عظیم سے پہلے اور بعد میں'' قبل از اسلام اور بعد استعمال ہونے لگی ہے۔ امریکا کے متعصب عیسائی لیڈر از اسلام جیسے تاریخی جملوں کی طرح اب ''قبل از نائن الیون اور بعد از نائن الیون'' کی اصطلاح صہیونی طاقتوں کی اس سازش کا مکمل شکار ہو چکے ہیں۔ صہیونی اور ہندو اس بات سے واقف ہیں کہ اس وقت دنیا میں سب سے بڑی تعداد عیسائیوں اور مسلمانوں کی ہے، یہ دونوں قومیں دین ابراہیمی کی دو مختلف شاخوں کے ماننے والے ہیں حالانکہ اصلی یہودی بھی تو دین ابراہیمی کی ایک شاخ سے ہیں لیکن یہود و ہنود کا ساری دنیا پر حکومت دیکھنے کا خواب اس وقت تک شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک یہ دونوں قومیں تباہ و برباد نہ ہو جائیں یا اتنے کمزور نہ ہو جائیں کہ ان پر اپنی مرضی کی حکومت مسلط ہو جائے جس میں یہ اپنی باقی ماندہ زندگی ایک کمزور غلام کی حیثیت سے گزارنے پر مجبور ہو جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے لندن کے ایک یہودی پبلشر نے بھارتی نژاد سلمان رشدی سے ایک متنازعہ کتاب (سٹینک ویسس) لکھوائی، اس کے بعد یہ سلسلہ مختلف انداز میں کبھی فرانس پر سکارف پر پابندی کی شکل میں، کبھی ڈنمارک کے اخبارات میں رسول اکرم ﷺ کے کارٹونوں کی اشاعت سے،

کبھی بھری عدالت میں ایک مسلمان خاتون کو خنجروں کے ظالمانہ وار سے قتل کرنے اور اس کے شوہر کو بیوی کی مدد سے پہلے ہی عدالتی پولیس کے گولی مار دینے کی حرکت سے اور اب بھی سوئٹزرلینڈ میں مساجد کے میناروں پر پابندی سے مسلمانوں کو اشتعال دلانے کی مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں۔ اگر کسی مسلمان کو یہاں گرفتار کیا جاتا ہے تو سارا میڈیا مسلمان دہشت گرد کی گرفتاری کی خبر دن رات نشر کرتا ہے لیکن جب صرف چند دنوں کے بعد ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے تو یہ خبر کبھی بھی میڈیا کی زینت نہیں بنی۔

قبل از نائن الیون کی دنیا بھی کوئی خاص پر سکون نہیں تھی جبکہ بعد از نائن الیون تو قبل از اسلام کے وحشی عربوں، صلیبی جنگوں اور جنگِ عظیم کے درندوں سے بھی زیادہ دہشت گرد ثابت ہو رہی ہے جس نے ایک بار پھر مسلمانوں اور عیسائیوں کو نفرت کے شعلوں میں جھونک دیا ہے۔ فاتحین اسلام ''ماڈریٹ''، نہیں بلکہ ''مکمل مسلمان'' تھے۔ دن کے اجالوں میں فتوحات کرنے والے ان جری سلطانوں کی راتوں کی تاریکی میں خشیت باری تعالی سے داڑھیاں آنسوں سے تر اور بدن خوف سے کپکپاتے تھے۔ صد مہ تو اس بات کا ہے کہ اس صدی کے مسلمان حکمران بعد از نائن الیون بھی قبل از اسلام کے عربوں سے زیادہ سنگ دل واقع ہوئے ہیں۔

رہے نام میرے رب کا جس نے اعلان کر رکھا ہے کہ اس دنیا میں اسلام نافذ ہو کر رہے گا چاہے کافروں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو!

نظر میں تازہ رہے یہ حسینیت کا پیام
یزید وقت کوئی ہو، اسے خدا نہ سمجھو

بروز اتوار ۹۱ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۶ دسمبر ۲۰۰۹ء

ہمارے خواب

الیز افلاٹو اور اس کا خاندان فلسطین میں کام کر رہا تھا' یہ لوگ امریکی شہری تھے' ۱۹۹۵ء میں یہ لوگ ایک کار بم میں مارے گئے' دھماکہ کی ذمہ داری اسلامک جہاد نے قبول کر لی۔ ۱۹۹۶ء میں فلاٹو کے لواحقین نے امریکی عدالت میں اسلامک جہاد کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ عدالت نے مارچ ۱۹۹۸ء میں اس مقدمے کا بڑا دلچسپ فیصلہ سنایا۔ عدالت نے ایران کو فلاٹو خاندان کا براہِ راست قاتل قرار دیا اور لواحقین کو ۲۴۷ ملین ڈالر خون بہا ادا کرنے کا حکم دے دیا۔

اس خبر نے دنیا بھر کے میڈیا میں بڑی جگہ پائی۔ بڑے بڑے دماغوں نے اس پر سیر حاصل تبصرے کئے۔ ابھی تبصروں اور تجزیوں کا سلسلہ جاری تھا کہ اگست ۱۹۹۸ء میں ایک اور امریکی عدالت نے لبنان میں قید تین امریکیوں کے مقدمے کا فیصلہ سنا دیا۔ عدالت نے ایران کو حکم دیا کہ ان قیدیوں کے لواحقین کو ۶۵ ملین ڈالر ادا کئے جائیں۔ یہ فیصلہ آنے کی دیر تھی کہ امریکی عدالتوں نے ایران کو دھڑا دھڑ جرمانے کرنا شروع کر دیئے۔ لبنان میں محبوس ٹیری آرتھر کے حق میں مارچ ۲۰۰۰ء میں فیصلہ ہوا کہ اس کو ۲۳۴ ملین ڈالر ہرجانہ ادا کیا جائے۔ فروری ۱۹۹۶ء میں حماس نے جن دو امریکیوں کو کار بم دھماکے میں قتل کیا تھا ان کا خون بہا ۳۲۷ ملین ڈالر طے ہوا۔ امریکی فوج کا کرنل ولیم ۱۹۸۹ء میں حزب اللہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا' ستمبر ۲۰۰۰ء کو عدالت نے اس قتل پر ایران کو ۳۵۵ ملین ڈالر جرمانہ کیا' تھامس سودھرلان' لارنس جینکو' فرینک ریجر اور بنجامی ویٹر لبنان میں قید ہوئے' عدالتوں نے اس قید کی پاداش میں ایران کو بالترتیب ۳۵۳ ملین' ۳۱۴ ملین اور ۱۰۰ ملین ڈالر جرمانہ کیا۔

پیٹر کلبرک فلسطین میں قتل ہوا' امریکی عدالت نے جون ۲۰۰۱ء میں اس ''جرم'' میں ایران کو ۲ سو ملین ڈالر جرمانہ کیا' کار بوم ب ۱۹۸۳ء میں قتل ہوا' امریکی عدالت نے اکتوبر ۲۰۰۱ء میں اس کا خون بہا ۵/ارب ڈالر مقرر کر دیا۔ یہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا معاوضہ ہے۔ چارلس ہیگنا اس طیارے کا مسافر تھا جسے ۱۹۴۸ء میں حزب اللہ نے اغوا کیا۔ ہیگنا نے عجیب و غریب مقدمہ دائر کیا' اس کا کہنا تھا کہ حزب اللہ کے لوگوں نے اس سے توہین آمیز سلوک کیا' اسے گھورا' اسے گالی دی اور اس کی کمر پر مکہ رسید کیا۔ عدالت نے جون ۲۰۰۲ء میں اس کے حق میں فیصلہ سنا دیا اور ایران کو ہیگنا کو ۴۲ ملین ڈالر ادا کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ ایرا وین اسٹین ۱۹۹۶ء میں بس کے ایک دھماکے میں ماری گئی' عدالت نے اس کا معاوضہ ۶۵ ملین ڈالر طے کیا۔

۱۹۹۸ء سے لیکر ۲۰۰۰ء تک دنیا امریکی عدالتوں اور ان کے جرمانوں کو حیرت سے دیکھتی تھی۔ حیران ہونا بھی چاہئے تھا' امریکا کے ایران کے ساتھ تعلقات منقطع تھے۔ ایرانی وکیل عدالتوں میں پیش نہیں ہوتے تھے۔ جج صرف مدعی کے دلائل سن کر فیصلے سنا دیتے تھے اور یہ فیصلے بعد ازاں داخل دفتر ہو جایا کرتے تھے لیکن جب امریکا نے افغانستان اور اس کے بعد عراق پر حملے کئے اور ان کے بعد ایران کے خلاف سرخ دائرہ کھینچ دیا تو صورتحال واضح ہونے لگی۔ دنیا کو ان جرمانوں میں چھپی نئی جنگی حکمتِ عملی دکھائی دینے لگی۔ امریکی عدالتیں اس وقت تک ایران کو نو ارب ۳۱۳ ملین ڈالر جرمانہ کر چکی ہیں اور یہ رقم ایران کے ایک سال کے قومی بجٹ کے برابر ہے جبکہ اس نوعیت کے بیسویں مقدمات ابھی عدالتوں میں زیرِ سماعت ہیں۔

ان مقدمات کی سماعت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگلے چند ماہ میں جرمانے کی رقم تین گنا ہو جائے گی۔اب سوال یہ ہے کہ امریکا یہ کھیل کیوں کھیل رہا ہے؟ اس کا جواب بڑا دلچسپ ہے۔دراصل دنیا جانتی ہے کہ ایران ایک شیعہ اسٹیٹ ہے،ایرانی جہاد کو اس نظر سے نہیں دیکھتے جس نگاہ سے باقی ساٹھ اسلامی ممالک دیکھتے ہیں۔ایران بعض سنی ممالک کے اتنا ہی خلاف ہے جتنا امریکا مخالف ہے چنانچہ امریکا ایران پر جہاد اور دہشت گردی کا الزام عائد نہیں کر سکتا ۔عراق کے بعد کیمیائی اور حیاتاتی ہتھیاروں کے ہتھکنڈے میں بھی جان نہیں رہی۔ایران کا جوہری پروگرام ابھی ابتدائی سطح پر ہے۔امریکا کو یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ ایران عالمی معائنہ انسپکٹروں کو انسپکشن کی اجازت بھی دیدے گا لہٰذا پھر امریکا کے پاس ایران پر حملے کا کوئی جواز نہیں ہو گا۔

امریکا کے یہ تمام خدشات صحیح ثابت ہوئے۔جب پہلی مرتبہ اقوامِ متحدہ نے ایران کو ڈیڈ لائن دی تو ایران نے اس ڈیڈ لائن کے ختم ہونے سے پانچ دن پہلے معائنہ انسپکٹروں کو اجازت دیدی۔تجزیہ نگاروں کا خیال تھا کہ ایران اپنے جوہری پروگرام پر معذرت خواہ دکھائی دیتا ہے'انسپکٹروں کے معائنہ کے بعد رپورٹ کو کسی طرح ایران کے خلاف استعمال کرتے ہوئے اس کے جوہری پروگرام کو ختم کرنے کی آڑ میں اس سے تمام پرانے حساب برابر کرنے کا خوب موقع ملے گا۔ایران کا ایٹمی پروگرام بھی لیبیا کی طرح رول بیک کروا کے'اس آڑے وقت میں عدالتی جرمانے بھی امریکی حکومت کا ساتھ دیں گے۔امریکی قانون یہ کہتا ہے کہ عدالتوں کے فیصلوں پر عملدرآمد امریکی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

لیکن امریکا اور مغربی طاقتوں کی مراد ابھی تک پوری نہیں ہو سکی۔حالانکہ پچھلے دو سالوں میں ایران پر اسرائیل اور امریکا کے حملوں کا مشترکہ حملہ کئی دفعہ میڈیا کی زینت بن چکا ہے لیکن امریکا اور اسرائیل ایران کے جوابی حملے کی بھی پوری توقع رکھتے ہیں جو اسرائیل کے لئے نہ صرف تباہ کن بلکہ اس کے وجود کو ہمیشہ کے لئے مٹا دینے کے لئے کافی ہو گا۔اس طرح امریکا کو ابھی بھیڑیئے اور میمنے کی کہانی دہرانے کا موقع نہیں مل پایا۔

تاریخ بتاتی ہے نادر شاہ درانی نے محمد شاہ رنگیلے کو فتح کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے دربار میں اعلان کیا کہ ''ہم ہندوستان پر حملے کا فیصلہ کر چکے ہیں'اب اس حملے کی وجوہات تلاش کی جائیں۔''مشیروں نے کیا کیا وجوہات تلاش کیں یہ تو معلوم نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے طاقتور ہر دور میں حملہ کرتا ہے اور کمزور اپنی جان پر یہ حملہ سہتا ہے اور یہ کہ دنیا میں طاقت سے بڑی کوئی عدالت نہیں ہوتی اور کمزوری سے بڑا کوئی جرم نہیں ہوتا اور یہ کہ دنیا کی اس منڈی میں کمزوریوں کے یوسف سوتر کی اٹی کے بھاؤ بکتے ہیں اور یہ کہ ہم اہلِ صبر یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری بکریاں ایک نہ ایک دن ہاتھیوں کو جنم دیں گی اور یہ ہاتھی دشمنوں کی صفوں کو الٹ کر رکھ دیں گے۔واہ کیا کہنے ہیں ہماری خوش فہمیوں کی اور کیا بات ہے ہمارے خوابوں کی!

راولپنڈی کی پریڈ لائن مسجد جہاں سیکورٹی کے انتہائی سخت انتظامات موجود تھے وہاں خودکش ایک گاڑی میں آئے'سیڑھی لگا کر دیوار کو پھلانگ کر مسجد میں سجدہ ریز نمازیوں کو بھون ڈالا'اسی دن پشاور میں ایک کاروباری مرکز کو منتخب کر کے اپنی پیاس بجھائی'اور رہی سہی کسر لاہور کے ایک معروف علاقے

علامہ اقبال تاون کے کاروباری مرکز ''مون مارکیٹ'' میں سفاکانہ خون کی ہولی کھیل کر قوم کو دہشت زدہ کرنے کی کاروائی سرانجام دیکر آخر کیا پیغام دیا گیا ہے ؟ابھی چند دن پہلے اس بات سے خبر دار کیا گیا تھا کہ بلیک واٹر جیسی سفاک تنظیم نے لاہور اور ملتان میں اپنے باقاعدہ اڈے قائم کر لئے ہیں بلکہ لاہور گلبرگ میں دو قلعہ نما کوٹھیوں کی نشاندہی بھی کی گئی تھی' ملتان سے ''فرمز'' نامی سیکورٹی ایجنسی کے مالک ''عمار'' کو سیکورٹی کے اداروں نے گرفتار بھی کر لیا تھا لیکن چند گھنٹوں کے بعد کون اسے رہا کروا کر لے گیا؟ وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کا دورہ برلن اور لندن کے بارے میں قوم کو ابھی تک اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ لندن میں ڈیوڈ ملی بینڈ کے ساتھ جو خفیہ مذاکرات ہوئے ہیں اس کی تفصیلات کو کیوں چھپایا جا رہا ہے ؟

سنا ہے کہ ہمارے سیکورٹی کے اداروں نے پہلی دفعہ امریکی سی آئی اے کو پاکستان میں حالیہ کشت وخون کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا ہے اور ان کا واضح اشارہ پاکستان میں موجود رسوائے زمانہ ''بلیک واٹر'' کی طرف ہے۔ کیا یہ سیکورٹی کے ادارے ہماری اعلیٰ عدالتوں کی اس سلسلے میں معاونت کر سکتے ہیں تا کہ ہماری عدلیہ بھی امریکی حکومت سے اس خون بہا کا مطالبہ کر سکے۔ لیکن کیا کریں ہمارے صدر آصف علی زرداری تو یہ فتویٰ جاری کر چکے کہ پاکستان کی بقا امریکا کی دوستی میں ہے اور ہمارے وزیرِ خارجہ شاہ محمود قریشی نے باراک اوبامہ کی حالیہ تقریر کا کا بڑا والہانہ انداز میں غیر مقدم کیا اور بڑے فدویانہ انداز سے امریکا سے درخواست بھی کی کہ امریکا کو افغانستان میں ابھی پانچ سے چھ سال تک اور قیام کرنا چاہئے۔ ابھی کتنے اور میر جعفر اور میر صادق پاکستان کی قسمت میں باقی ہیں؟

رہے نام میرے رب کا کہ جو اپنے بندے کو اتنی ہی تکلیف دیتا ہے جتنی اس میں قوتِ برداشت ہوتی ہے !

کتنے سادہ دل ہیں' سن کر اب بھی آوازِ جرس
پیش وپس سے بے خبر' گھر سے نکل جاتے ہیں لوگ

بروز منگل ۲۱ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۸ دسمبر ۲۰۰۹ء

زیبِ داستاں

باراک اوبامہ نے افغانستان اور پاکستان کے لئے اپنی پالیسی کا اس طرح اعلان کیا ہے کہ سب دھڑے اپنی مرضی کی تشریح کر لیں۔ اپنی حالیہ تقریر میں تیس ہزار فوج افغانستان میں بھیجنے کے اعلان کے ساتھ پاکستان کا نام ۲۲ مرتبہ لیا اور انہوں نے اپنی افواج کے انخلاء کی تاریخ دیکر افغانوں کو کم از کم یہ تو بتا دیا کہ ہم جا رہے ہیں لیکن پاکستان کو کھلم کھلا یہ پیغام دیا کہ ہم آ رہے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو غیر مبہم انداز میں یہ سمجھا دیا کہ نہ ہم جا رہے اور نہ ہی آ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے پورے یقین کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ القاعدہ وزیرستان کے پہاڑوں اور غاروں میں چھپی بیٹھی ہے اور طالبان کوئٹہ سے نکل کر اب کراچی میں گم ہو گئے ہیں۔ اب اس کینسر کے خاتمے میں کوئی دریغ نہیں کیا جائے گا۔

امریکا کے پالیسی سازوں نے ہر حال میں القاعدہ اور طالبان کے ٹھکانوں کو تباہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ اب بھی سمجھ رہے ہیں کہ اسامہ ان قبائلی علاقوں میں دہشت گردوں کو تربیت دے رہا ہے جس کی وجہ سے یہ پہاڑ اور غار دنیا کے سب سے خطرناک علاقے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے افغانستان کا مستقبل اور دنیا کے امن کو پاکستان کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ اب یہ مزید تیس ہزار امریکی فوجی پاکستان میں بلوچستان اور ایران کی سرحدوں سیستان کے ساتھ افغانستان میں اپنی نئی ذمہ داریاں سنبھالیں گے۔

باراک اوبامہ کے اس پالیسی بیان کو اسرائیل، بھارت اور برطانیہ کی حکومتوں نے بہت سراہا ہے لیکن پاکستان میں ہمارے وزیرِ خارجہ شاہ محمود قریشی نے اپنے فدویانہ بیان میں امریکا سے افغانستان میں مزید پانچ سال قیام کرنے کی درخواست کی ہے اور ان کے مربی زرداری صاحب نے تو پاکستان کی بقا امریکا کی دوستی کے ساتھ منسلک کر کے آئندہ مشکل حالات میں درپردہ اپنے آقا سے مدد کی درخواست کی ہے بہر حال وزیرِ اعظم گیلانی نے اپنے تحفظات کا ذکر کیا ہے۔ اپنے بیرونی دورے سے واپسی پر انہوں نے اپنی اس خوش فہمی کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ اب امریکا اور اس کے اتحادیوں نے ہمارا موقف تسلیم کر لیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خطے میں چند شر پسند عناصر دہشت گردی کر رہے ہیں اور ہماری بہادر افوج ان کا صفایا کرنے میں دن رات مصروف ہے۔

باراک اوبامہ نے اپنی تقریر میں اس بات کا بھی واضح اشارہ دیا ہے کہ اب پاکستان کو افغانستان میں حقانی گروپ اور پاکستان میں لشکرِ طیبہ کی حمائت سے نہ صرف توبہ کرنا ہو گی بلکہ ان دونوں گروپوں کا صفایا بھی کرنا ہو گا۔ اس بات کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ بھارتی وزیرِ اعظم من موہن سنگھ نے اپنے امریکا دورے کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ امریکا سے ہم نے پاکستان پر اپنا دباو بڑھانے کو کہا ہے اور ایسا ہی دباو تسلسل کے ساتھ امریکی سیکرٹری خارجہ ہلیری کلنٹن کی طرف سے بھی ڈالا جا رہا ہے۔ باراک اوبامہ نے اپنی تقریر میں امریکی عوام کو مخاطب کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ہم پاکستان کو جو رقم دے رہے ہیں وہ امریکیوں کے تحفظ کی خاطر ڈاون پیمنٹ ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ ماضی کی طرح ہم مزید بلینک چیک نہیں دے سکتے۔

گویا کیری لوگر بل کے مطابق جو سالانہ ڈیڑھ ارب ڈالر کی مدد دی جا رہی ہے وہ نہ صرف اپنے ملک کے لوگوں کو قتل کرنے کے لئے ہے بلکہ اب

افغانستان میں بھی ایسی خدمات بجالانے کے لئے تیار اور بھارت کی خواہش کے مطابق کشمیر سے بھی اپنا ناطہ ختم کرنا ہوگا' انڈر گراونڈ مافیا ''ڈان یا بھائی'' کی زبان میں نامزد لوگوں کے قتل کی ''سپاری'' دی جارہی ہے اور ہر سال ڈیڑھ ارب ڈالر کی امداد جو اپنی نامزد این جی اوز کے ذریعے پاکستان کے حوالے کی جائے گی اس میں اگر اوبامہ اور بھارتی مافیا کی جانب سے دیئے گئے ٹارگٹ پورے نہ ہوسکے تو پھر امریکا کو خود مداخلت کرنے کا پورا حق ہے۔

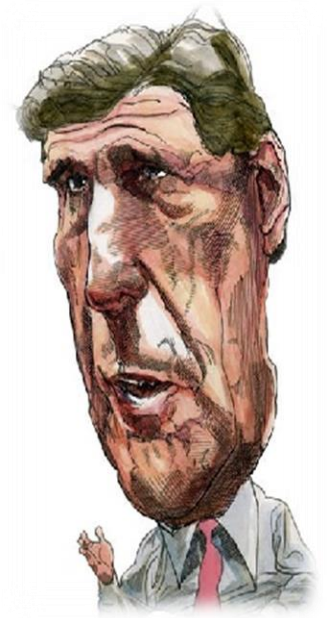

مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ اوبامہ اور امریکی حکومت کے دوسرے اہلکار ابھی تک اپنی عوام کو یہ کہہ کر بے وقوف بنا رہے ہیں کہ اسامہ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں دہشت گردوں کو تربیت دے رہے ہیں اور پاک افغان سرحد دنیا کا خطرناک ترین علاقہ بن گئی ہے۔ امریکی اپنی ٹیکنالوجی کو دنیا کی سب سے بہترین طاقت قرار دیتے ہوئے یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہمارے پاس ہر ایک کے بارے میں بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی معلومات موجود ہیں۔ اگر ان کے اس دعوے پر یقین کر لیا جائے تو اوبامہ کو یہ ضرور بتانا ہوگا کہ وہ اتنی جدید ٹیکنالوجی' پاکستان کی حکومت کے تعاون سے ڈرون حملوں کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کی حمائت کے باوجود ایک ڈرون حملے میں ابھی تک اسامہ بن لادن' ایمن الظواہری اور ملا عمر کو قتل کیوں نہیں کر سکے؟

دوسرا سوال دنیا بھر میں صحت کے حوالے سے تحقیق کرنے والوں سے' کہ اب سے دس سال قبل جس آدمی کا دن میں دو مرتبہ ڈائیلاسس ہوتا تھا، اب وہ خفیہ پناہ گاہوں میں کس طرح ڈائیلاسس کراتا ہوگا؟ قبائلی علاقوں کے ان پہاڑوں اور تنگ غاروں میں جہاں بجلی ہے نہ ٹیکنالوجی' اسامہ بن لادن کے لئے ڈائیلاسس مشینری کس طرح مہیا کی جاتی ہوگی؟ کیا کوئی نئی چینی ٹیکنالوجی آگئی ہے؟ اگر ان ایجنسیوں کی یہ اطلاع درست تھی تو اسامہ کو اس وقت کہاں ہونا چاہئے' اس کا جواب یہ ایجنسیاں ہی دے سکتی ہیں۔ اگر یہ اطلاع پہلے غلط تھی تو اب اس کے درست ہونے کی کیا ضمانت ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اوبامہ صاحب! پاک افغان سرحد دنیا کا خطرناک ترین علاقہ کیسے بن گئی جہاں پہلے تو کبھی خطرے کی بات نہیں ہوتی تھی۔ ان علاقوں کے لوگ تو بغیر اسلحے کے سرحدی چوکیوں کے عادی تھے۔ یہاں امریکی عمل دخل قبل کسی کا موبائل چھینا جاتا تھا اور نہ کسی کی گاڑی' اور نہ ہی کسی کے گھر میں کوئی چوری یا ڈاکے کی واردات ہوئی تھی' اگر کوئی جرم ہو جائے تو جرگہ میں معاملات طے کئے جاتے تھے' ہر طرف امن وامان تھا۔ جب سے نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ شروع ہوئی ہے اس وقت سے یہاں بدامنی اور دہشت گردی ہے' اس سے قبل تو نہیں تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آج اوبامہ سوئٹزرلینڈ میں دہشت گردی کے خلاف جنگ شروع کردیں تو وہاں بھی اسی طرح کی آگ لگ جائے گی اور اگر ان کو امریکا میں القاعدہ' اسامہ بن لادن اور دیگر کی کاروائیوں کا خوف ہے تو وہ واشنگٹن اور نیویارک میں دہشت گردی کے خلاف جنگ شروع کریں' مجھے یقین ہے کہ نیویارک اور واشنگٹن ڈی سی پاکستان کے قبائلی علاقوں سے زیادہ خطرناک علاقے بن جائیں گے۔

دنیا کی نظر میں امریکی صدر باراک اوبامہ نے افغانستان اور پاکستان کے بارے میں جو نئی پالیسی جاری کی ہے یہ بش حکومت کی پالیسیوں کا تسلسل ہے اور

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قصرِ سفید میں فرعون کا چہرہ بدلا ہے لیکن پالیسیاں اب بھی انہی صہیونی طاقتوں کے تابع ہیں بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ پہلے سے زیادہ سختیاں آنے والی ہیں۔ ڈیڑھ ارب ڈالر کا دانہ ڈالا گیا ہے لیکن جو مطالبات کئے جا رہے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ سخت اور شدید نقصان دہ ہیں جو کمانڈو جنرل مشرف سے کئے جاتے تھے۔ اب جن علاقوں کو چھیڑا گیا ہے اور جہاں امریکی افواج کو تعینات کیا جا رہا ہے وہ براہِ راست پاکستان کے جغرافیائی اتحاد کو خطرے میں ڈالنے والے علاقے ہیں۔ ان علاقوں میں مزید بدامنی پیدا کرنے کا مطلب پاکستان کے ساتھ ان علاقوں کی وابستگی کو متاثر کرنا ہے جب کہ پاکستان بلوچستان میں بھارتی مداخلت کے بارے میں پہلے ہی شدید تحفظات رکھتا ہے۔

صاف ظاہر ہے جب پاکستان میں بدامنی اور انتشار ہو گا' قبائلی عوام کو نشانہ بنایا جائے گا تو وہ حملہ کرنے والوں کو ہی دشمن تصور کریں گے۔ جب تک ڈرون حملے ہوتے رہیں گے اس وقت تک امریکا کو ہی دشمن تصور کیا جائے گا اور اس کے اپنے اثرات ہونگے اور جب پاکستانی حکومت خود قبائلی علاقوں سے دہشتگردوں کے مبینہ اڈوں کو ختم کرنے لگے گی تو یہ قبائلی پاکستانی حکومت اور فوج کو ہی اپنا دشمن تصور کرنے لگیں گے۔ امریکی فوج کو تو قبائلی آسانی سے نشانہ نہیں بنا سکتے لیکن پاکستانی فوج اور سرکاری اہداف تو پورے پاکستان میں امریکیوں کا آسان ترین نشانہ بن جائیں گے اور شائد یہی مطلوب بھی ہے۔ کون اسامہ اور کہاں کی القاعدہ' یہ تو سب زیبِ داستان کے لئے ہے۔ اب کہاں تک سوال اٹھایا جائے کہ کبھی تو آپ القاعدہ کی کمر توڑ دینے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کبھی یہ خوف کہ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں بیٹھ کر القاعدہ امریکا میں کاروائی کی منصوبہ بندی کر رہی ہے۔

کون سا ڈرون طیارہ قبائلی علاقوں سے پرواز کرے گا اور سیدھا نیویارک اور واشنگٹن پر جا کر حملہ کر دے گا۔ فی الحال تو پاکستانی حکومت اور اوبامہ میں اپنے ہی لوگوں پر حملوں کی سپاری پر معاملہ طے ہو چکا ہے اب آگے اللہ خیر کرے۔

رہے نام میرے رب کا جو ان شیطانی قوتوں کے مقابلے میں اپنے بندوں کا مددگار ہے

باغباں حسنِ تدبر سے شناسا ہی نہیں
کیسے کہہ دوں کہ گلستاں میں بہار آئے گی

بروز جمعرات ۲۳ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۱۰ دسمبر ۲۰۰۹ء

قدرت کا پوشیدہ راز

کیا یہ رستا بستا جہاں برباد ہونے کو ہے اور اس کی خاکستر سے ایک نئی دنیا طلوع ہو گی؟
قصرِ سفید کے فرعون کا فرمان بجا، کہ دہشتگردی ہمارے عہد کا سب سے بڑا عفریت ہے، دہشتگردی کے خلاف امریکی کوششیں مبارک اور مرحبا، بنیاد پرستی کے خلاف اس کے روشن دماغ قصیدہ نگاروں کی مخلصانہ چیخ وپکار بھی قابلِ تحسین لیکن کچھ سوال اب بھی ہنوز جواب طلب ہیں اور کچھ گتھیاں ہیں جو کسی طرح سلجھنے کا نام نہیں لیتی۔ مثلاً یہ کہ کہ سالہا سال کی تگ وتاز، کھربوں ڈالر لگا دینے کے باوجود امریکا اور اس کے حواری یہ جنگ جیت کیوں نہیں رہے، مسلسل پسپائی اور شکست ان کا مقدر کیوں ہے؟

ایک امریکی سرکاری اطلاع کے مطابق ۸ دسمبر ۲۰۰۹ء تک امریکی افواج اور اس کے اتحادیوں کے ہاتھوں (۱۳۶۳۵۰) تیرہ لاکھ چھیاسٹھ ہزار تین سو پچاس عراقی موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں جس کے جواب میں (۴۶۸۶) چار ہزار چھ سو چھیاسی امریکی اس جنگ کا شکار ہو گئے جب کہ پندرہ لاکھ سے زائد افغان اب تک مار دیئے گئے جس کے جواب میں (۱۵۳۶) امریکی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور اب تک امریکا ان دونوں لاحاصل جنگوں میں ساڑھے آٹھ کھرب ڈالر برباد کر چکا ہے اور اب امریکا ان دونوں ملکوں سے واپسی کا جو شیڈول دے چکا ہے اس پر بھی کوئی یقین کرنے کو تیار نہیں۔ ابھی کل ہی امریکا کے دو فوجی کمانڈر جنرل مائیک مولن اور جنرل جونز نے عالمی میڈیا کو اپنے ہی صدر کے بیان کی نفی کرتے ہوئے کوئی دشواری محسوس نہیں کی کہ ہم ان تاریخوں کو حالات دیکھیں گے کہ امریکا کو اب کیا کرنا ہے؟

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ امریکا جو اس مقدس مشن میں اپنے آپ کا ہلاک کر رہا ہے، اپنے اس مشن میں حمائت اور ہمدردی حاصل کرنے کی بجائے اپنے مخلص مداحوں میں بھی نفرت کا حقدار کیوں ٹھہرایا جا رہا ہے؟ امریکا کے حامی، عالمِ اسلام کے تمام روشن خیال حکمرانوں، راست فکر دانشوروں اور صحیح الخیال علماء کو پذیرائی کیوں نہیں ملی، یہی نہیں، حیرت انگیز طور پر بدترین جرائم کے مرتکب لوگ مردود اور مسترد ہونے کی بجائے مقبول تر کیوں ہیں؟ امریکا بہادر سب سے بڑی مالیاتی، اسلحی اور عسکری ہی نہیں، دنیا کی سب سے بڑی ابلاغی قوت بھی ہے۔ سب سے زیادہ سنے جانے والے ٹیلیویژن نیٹ ورک اور سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اخبارات، اس کے ہمدرد اور ہمنوا ہیں، مگر یہ سب لوگ مل کر بھی اس سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے۔

(بیچارے لوگ جن پر عصر رواں کی، آج کے آدمی کو بچا لے جانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ہے) اور اس بوجھ سے ان کی کمریں دہری ہو گئیں ہیں اسامہ بن لادن ہی کو لیجئے، کیا انسان کی تاریخ میں اس سے پہلے بھی کبھی ایسا ہوا تھا کہ ایک تنہا آدمی نے اپنے عہد کی سب سے بڑی قوت کو چیلنج کیا ہو، اپنی پسند کے میدان میں گھسیٹ لایا ہو اور اس کے لئے سنگین خطرات پیدا کر دیئے ہوں۔ کیا اس سے پہلے بھی کبھی ایسا ہوا کہ ایک آدمی کے غضب نے جسے ایک انچ زمین پر بھی اقتدار حاصل نہیں، ساری دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہو اور ہر گزرتی ساعت کے ساتھ اس کا اثر فزوں تر ہو۔ اس سے پہلے بھی کبھی ایسا ہوا تھا کہ مہذب اور منظم کہلوانے والی ساری دنیا نے ایک باغی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہوا، پھر اس کا قتل اور گرفتاری تو دور کی بات ہے، اس کا سراغ تک

نہ لگا سکے۔

کتنی عظیم سپر پاور ہے جس کے اشارہ ابرو پر حکومتیں بدل جاتی ہوں، جس کے جاسوس سیارے خلاوں میں تیرتے اور پل پل کی خبریں دیتے ہوں اور جس کے بدلتے تیوروں کے ساتھ ساری دنیا میں دانشوروں کے خیالات اور گانے والوں کے گیت بدل جاتے ہوں، پھر کیا ہمارے عہد میں ہر منطق الٹ گئی، ہر بنیاد بے بنیاد ہو گئی اور ہر سعی رائیگاں ہوئی! کیا یہ جہان برباد ہونے کو ہے اور اس کی خاکستر سے ایک نئی دنیا طلوع ہو گی؟

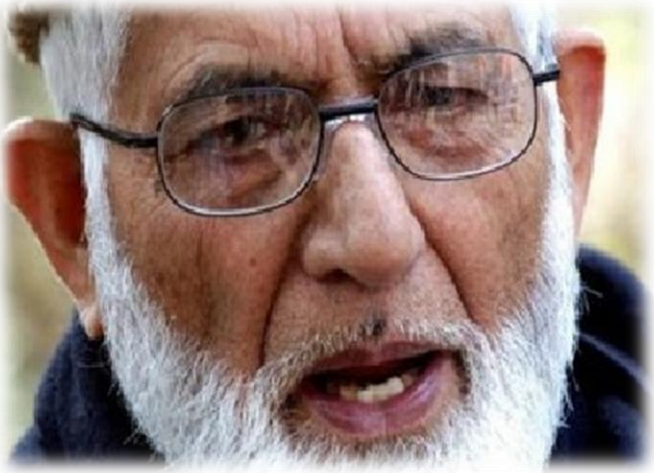

۱۹۹۲ء میں امریکی انٹیلی جنس ایجنسیوں کا بجٹ ۶۳ بلین ڈالر تھا جب انہوں نے جنگ سے جھلسے افغانستان کے ایک گرد آلود قصبے جلال آباد کے غاروں میں مقیم اس شخص سے نمٹنے کا فیصلہ کیا اور پہلے ہی برس چھ بلین ڈالر مختص کر دیئے۔ بجٹ کی دستاویز میں انہوں نے اس کا نام نہ لکھا کہ یہ عظیم الشان ریاست ہائے متحدہ امریکا کی توہین کے مترادف ہوتا بلکہ اس شق کو "وار آن ٹیرر" کا نام دیا، دہشتگردی کے خلاف جنگ لیکن سبھی جانتے ہیں کہ دہشتگردی سے مراد کیا تھی اور دہشت گرد کون ہے؟ وہ دبلا پتلا لمبا پتلا سا آدمی، جس نے تین عشرے پہلے شہزادگی اور عشرت کی زندگی کو خیر باد کہا، آرام و آسائش کو تج دیا اور تب سے غاروں، جنگلوں اور پہاڑوں میں بھٹک رہا ہے۔

پچھلی ایک دہائی گزر گئی، جب انہوں نے اس خطرناک آدمی کو گرفتار یا قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا، ہزاروں مخبر اور لاتعداد دانشور انہوں نے اس کے خلاف میدان میں اتارے، ۱۹۹۲ء کے بعد ہر سال وہ چھ بلین ڈالر اس کے خلاف یا یوں کہئے کہ دہشتگردی کے خلاف خرچ کرتے رہے۔ عالمِ اسلام کا ہر سچا، صحیح العقیدہ اور فہیم عالمِ دین اس کی فکر کا مخالف ہے، مثلاً جامعہ الازہر کے وہ دانا دماغ جن کی طرف اٹھنے والی ہر نگاہ خیرہ ہو کر لوٹ آتی ہے، وہ سب اپنا فتویٰ جاری کر چکے۔ قرآن کریم کی مقدس آیات اور احادیث رسول ﷺ کے مصدقہ متون کی روشنی میں وہ ثابت کر چکے کہ یہ شخص اور اس کے ساتھی جن حرکات کے مرتکب ہیں، دین متین کو اس سے دور کا واسطہ بھی نہیں، لیکن نتیجہ کیا ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ ان مقدس اور محترم علماء کی بجائے جن کے علم و زہد اور نیت پر رتی بھر شبہ و شک کو کوئی جواز نہیں، لوگ اسی شخص کی بات پر عمل پیرا ہیں، جسے فتویٰ دینے کا حق اور اختیار ہی نہیں!

کچھ برس پہلے عراق کے سرخ چہرے والے وزیر اطلاعات سعید الصحاف نے کہا تھا اژدھے کو اندر آنے دو، ہم اس کو ٹکڑوں میں کاٹ دیں گے۔ سعید الصحاف خود تو منہ کے بل گرے اور صدام حسین کے بقول ان کے لباس تک نے ان سے غداری کی۔ بعث پارٹی کے "صاحبِ یقیں" سیکولر تو ظاہر ہے کہ وہ کفن اوڑھ نہیں سکتے، بلاؤں سے الجھ نہیں سکتے اور جانیں ہتھیلیوں پر نہیں رکھتے، پھر یہ کون لوگ ہیں جو جو محکوم عراقیوں، مظلوم افغانیوں اور مقہور کشمیریوں کو آزادی دلانے پر تلے ان یہود و ہنود کو دن بدن نگل رہے ہیں؟ یہ کون لوگ ہیں اور ان کے پاس کس طرح کا اسلحہ جنگ ہے کہ نہ زمینوں پر

ٹینکوں کا کوئی کارواں محفوظ ہے اور نہ آسماں پر پرواز کرتا ہوا کوئی ہیلی کاپٹر !

مجھے آج کشمیر کا بوڑھا سید کیوں یاد آرہا ہے، جس نے میرے ضمیر اور وجود کو بے پناہ فخر سے بھر دیا ہے۔ اس بیماری کی حالت میں بھی ایک پل اپنے گھر میں نہیں ٹھہرتا۔ قریہ قریہ گاوں گاوں اس کے وجود کی محبت میں مہک رہے ہیں کیونکہ وہاں کے باسیوں کے دلوں میں رہنے ولا یہ شخص اس بات سے واقف ہے کہ ظالم ہمیشہ بزدل ہوتا ہے چاہے اس کے پیچھے دنیا کی دوسری طاقتیں کتنی ہی اس کی مددگار کیوں نہ ہوں۔ اس نے اپنی ثابت قدمی سے قوم کی روشن امیدوں کے دیئے کو بجھنے نہیں دیا۔ وہ نہ تو ابھی تک بکا اور نہ ہی دلبراشتہ، حالانکہ اس کے ساتھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے لیکن قدرت کا انتقام دیکھئے کہ جس نے اس کو چھوڑا، نہ صرف وہاں کے لوگ بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی ان کی پذیرائی ختم ہو گئی اور یہ بوڑھا سید اپنی بے سروسامانی کے باوجود اب بھی بے تاج بادشاہ کی طرح لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔

اور ہماری اس دنیا کو کیا ہوا کہ جب دہشت گردی کے خلاف مقدس جہاد میں مصروف مہذب دنیا کے معصوم فرزند قتل کئے جاتے ہیں تو کہیں ماتم کی کوئی صف نہیں بچھتی اور کسی آنکھ سے آنسو نہیں ٹپکتا بلکہ دیواریں انہیں مرنے والوں کی تصاویر اور بازار نعرہ ہائے تحسین سے بھر جاتے ہیں۔ جناب جاوید غامدی کے تجزیئے، مولانا وحیدالدین کے ارشادات اور الازہر کے قلب ودماغ روشن کر دینے والے فتوے کے باوجود جب کسی ٹیلیویژن نیٹ ورک سے اس شخص کی تقریر سنوادی جائے تو مغربی ایجنسیاں یہ بتاتی ہیں کہ اس کی تائید میں راتوں رات کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

آخر یہ سب کیا ہے؟ یہ تنہا اور بے بنیاد شخص ایک فلسفہ حیات کیوں بنتے جارہیں ہیں؟ کیا وہ ایک عمل انگیز ہیں، جنہیں ایک نیا جہان تخلیق کرنے کے لئے ابد کیا گیا؟ کیا وہ قدرت کے کوئی پوشیدہ راز ہے ں جس کے معانی آنے والے کل میں ظاہر ہونگے۔ کچھ تو کہو اے روز وشب شور مچاتے دانشورو، کچھ تو کہو، ہم عامیوں کے کسی سوال کا جواب تو دو، اگر آج نہیں تو تمہاری دانش کب کام آئے گی؟ کیا اب یہود وہنود کا رستا بستا جہاں برباد ہونے کو ہے اور اس کی خاکستر سے ایک نئی دنیا طلوع ہو گی؟

رہے نام میرے رب کا جو اپنے پسندیدہ لوگوں کے دلوں میں اپنی محبت بھر کر انہیں اس دنیا سے بے نیاز کر دیتا ہے!

انہی غم کی گھٹاوں سے خوشی کا چاند نکلے گا
اندھیری رات کے پردوں میں دن کی روشنی بھی ہے

بروز ہفتہ ۲۵ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۱۲ دسمبر ۲۰۰۹ء

حیثیت کا غلط استعمال

یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے باراک اوبامہ بھی اپنے پیشرو کی طرح غصے اور اشتعال کی نفسیات سے دوچار ہیں۔اس کی بڑی وجہ عراق اور افغانستان میں ان کے مقاصد پورا نہ ہونا ہے۔امریکی قوم جو خوف کی نفسیات سے دوچار ہے اس کو پوری امید تھی کہ قصرِ سفید میں تبدیلی کے بعد شائد دنیا میں امریکیوں سے نفرت میں کمی آنا شروع ہو جائے گی لیکن معاملہ اب پہلے سے بھی زیادہ گھمبیر ہوتا جا رہا ہے۔شائد یہ انہی پالیسیوں کا نتیجہ ہے جو سابقہ صدر جارج بش سے ان کو ورثے میں ملیں تھیں لیکن باراک اوبامہ ابھی تک اس میں رتی بھر تبدیلی نہیں لا سکے۔یہی پالیسیاں ساری دنیا کو تباہی کے اندھے غار میں دھکیلتی نظر آ رہی ہیں اور باراک اوبامہ بھی کی حیثیت بھی اب ایسے حکمران کی طرح نظر آ رہی ہے جو یہ چاہتا ہے کہ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کی شکل اختیار کر لے اور وہ ضابطہ بن جائے جس پر ساری دنیا تعمیل کرتی ہوئی نظر آئے۔

دنیا میں اور تاریخ میں کسی ایسے حکمراں کی مثال نہیں ملتی جو سو فیصد اپنے عزائم ،ارادوں اور سوچ کو کامیاب کروا سکا ہو۔ایسی دنیا میں ہر شخص اپنا م کام ادھورا چھوڑ کر جاتا ہے۔ابھی امریکا واحد سپر پاور نظر آتا ہے اور وہ اپنی ایسی حیثیت کا غلط استعمال کر رہا ہے اور یہ وہی راستہ ہے جو ان کے پیشرو جارج بش نے اختیار کیا تھا اور اس دنیا کے سبھی دانشور اس پالیسی کو دنیا کی تباہی سمجھتے ہیں۔آج بھی امریکی حکومت یہ چاہتی ہے کہ اس کے شہریوں اور فوجیوں کے لئے الگ ضابطے ہوں اور دوسرے ملکوں کے لوگوں کے لئے جدا قوانین ہوں۔

یہ بین الاقوامی نسانی حقوق ،انسانی مساوات اور خود مختار قوموں کے حقوق کے سراسر خلاف ہے۔یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اگر امریکی فوجی کہیں اور کسی ملک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور جینوا کنونشن کے خلاف کاروائیوں کے مرتکب ہو رہے ہوں تو ان کے خلاف کسی قانون کے تحت کاروائی نہیں ہو سکتی۔اس طرزِ عمل کے خلاف ساری دنیا میں آواز اٹھائی لیکن امریکا نے طاقت اور قوت کے بل بوتے پر استثناء حاصل کر لیا،جو لوگ آواز اٹھا رہے تھے وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ مخالف حالات کو روک سکیں ،وہ اس کو ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنے سے تعبیر کرتے رہے حالانکہ یہ ان کی کم فہمی تھی جس سے امریکی رد عمل میں اضافہ ہوا اور شور وغل کرنے والے خسارے میں رہے ،یورپ کی بڑی قوتوں اور دنیا کی آواز دب گئی۔

امریکا ایٹمی قوت کو پھیلنے سے روکنے کے لئے ساری دنیا کو اور ان ملکوں کو جو ایٹمی صلاحیت رکھتے ہیں این پی ٹی پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کرتا رہا لیکن اس نے خود اس پر دستخط نہیں کئے ہیں۔امریکا کا یہ طرزِ عمل انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے۔پھر یہ کہ وہ اسرائیل کے ایٹمی پروگرام پر بالکل خاموش ہے اور اسرائیلی حکومت آزادی سے اپنے ایٹمی پروگرام کو ترقی دے رہا ہے بلکہ میزائل سازی میں امریکی حکومتوں نے اسرائیل کی بھرپور مدد کی ہے۔

وہ لوگ جو تاریخ سے سبق حاصل کرتے ہیں اور پھر اپنی راہ متعین کرتے ہیں ،وہ کامیاب ہوتے ہیں۔اگر پیچھے مڑ کر دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ روس بھی ایک سپر پاور تھی اور اس کی افواج چیکوسلواکیہ کی سرزمین کو روندھ رہی تھی اور پولینڈ کے خلاف کاروائیوں میں مصروف تھیں لیکن کیا آج ان ملکوں

میں روسی سکہ چل رہا ہے۔ روس نے اپنی سلامتی اور مشرقی یورپ کے اتحاد کو جواز بنا کر فوجی یلغار کی، کبھی ایک ملک پر اور کبھی دوسرے ملک پر، روس کو کیا ملا، نفرتیں اور جن ملکوں پر فوج کشی کی گئی تھی ان ملکوں کے عوام کا غم و غصہ یہ بات اتنی بڑی سچائی ہے کہ کہ منفی عمل کا نتیجہ کبھی مثبت نہیں ہو سکتا۔ جب کبھی بڑی عمارت گرتی ہے تو ارد گرد کی کئی چھوٹی عمارتوں کو بھی لے بیٹھتی ہے۔ روسی کیمونسٹ ایمپائر گری تو وارسا ممالک الگ ہوئے، کئی دوسری ریاستوں نے اس ٹوٹ پھوٹ کا فائدہ اٹھایا۔ جب روسی فوجیں مشرقی یورپ کے ممالک پر یلغار کر رہی تھیں تو یہی امریکا اور مغربی ممالک اس کو نہ روک نہ سکے، آج امریکا برطانیہ اور ان کے بعض اتحادی ممالک جو کچھ عراق اور افغانستان میں کر رہے ہیں اسے فرانس چین روس ساری دنیا مل کر نہ روک سکی تو کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ مسئلے کا دائمی حل ہے۔ امریکا کے طرزِ عمل اور دھونس دھاندلی کے خلاف ساری دنیا شور و غوغا کر رہی ہے اور اس کا نتیجہ بھی وہی نکلے گا جو اس سے پہلے وقت نے ثابت کر دکھایا ہے۔

فرانس نے تو کھلم کھلا مخالفت کی، جرمنی نے امریکا کی حمائت سے انکار کر دیا، یہی حال روس اور چین کا ہے۔ دنیا کا یہ امریکی مخالف رد عمل بے نتیجہ رہا۔ اگر دنیا یہ سمجھتی ہے کہ اس نے وہ کام کر دیا جو اسے کرنا تھا تو یہ سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہے اور یہ مزید نقصان پہنچانے کا عمل ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ساری دنیا مل کر ایک مثبت اور تعمیری رویہ اختیار کرتی تاکہ دنیا کے امن کو تباہ ہونے سے بچایا جا سکے۔ مسلمان دنیا میں کہیں بھی ہوں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکا ہمیشہ اسرائیل کے تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے بلکہ اب تو ساوتھ ایشیا کے ممالک بری طرح اس بات سے خوفزدہ ہیں کہ امریکا اس خطے میں بھارت کی بے جا اور ناجائز حمائت اسی طرح کر رہا ہے جس کی وجہ سے بھارت بھی اسرائیل کی طرح منہ زور ہو کر اپنے ہمسایوں کے معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ امریکا اس بات کو بھول رہا ہے کہ اس ناجائز حمائت سے ہنود اور یہود کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ ان دونوں اقوام کو اپنے اس ظلم اور متعصبانہ رویے سے دنیا میں کہیں بھی پناہ نہ ملے گی۔

یورپی یونین کے لوگ اب یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ یہودی ساری دنیا کے امن کے لئے شدید خطرہ ہیں۔ مسلمانوں میں یہ سوچ بہت پہلے سے پراکسی کے موجود ہے جس کا اظہار چند سال پہلے ملائشیا کے مہاتیر محمد نے کیا تھا کہ یہودی ساری دنیا پر اور خاص طور سے امریکا اور یورپ کے ممالک پر ذریعے حکومت کر رہے ہیں۔ ایسی ہی خبر پچھلے دنوں امریکا کے دفاعی تبصرہ نگاروں نے بھارت کے بارے میں بھی کہی ہے کہ بھارتی خفیہ ایجنسی ''را'' آہستہ آہستہ سی آئی اے اور پینٹاگون کے آپریشن معاملات میں دخیل ہوتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے امریکا کو ساوتھ ایشیا میں ناقابل تلافی نقصان کا احتمال ہے۔

امریکا آج جس راستے پر چل پڑا ہے، یہ تباہی کا راستہ ہے، اسی راستے پر چل کر روس کی ایمپائر ختم ہوئی تھی اور یہ دور کی بات نہیں ہے۔ باراک اوبامہ بھی انہی صہیونی طاقتوں کے زیر اثر آ کر ایسے ہی غیر مقبول فیصلے کر رہے ہیں جو اس سے پہلے سابقہ صدر جارج بش نے اشتعال اور غصے میں اپنے منصوبوں کی

ناکامی پر بہت آگے جانے کو تیار ہو گئے تھے۔ جارج بش نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ کم طاقت کے ایٹم بم بنائے گا اور اس فیصلے پر موجودہ حکومت میں عمل درآمد شروع ہو گیا ہے۔ موجودہ امریکی حکومت کا یہ فیصلہ بھی اتنا ہی غیر دانشمندانہ ہے جیسا کہ ان کا حالیہ افغانستان میں مزید فوجیں بھیجنے کا فیصلہ ہے اور حالیہ بھارتی ہم منصب من موہن سنگھ کے دورے کے بعد پاکستان پر شدید دباو بڑھانے کا فیصلہ تو یقیناً امریکی طاقت اور قوت کو زوال کی طرف تیزی سے لیجائے گا۔ امریکا آج جو کر رہا ہے کل روس چین فرانس اور دوسرے ایٹمی ممالک بھی اس کی تقلید کریں گے۔

آج امریکا کے مقابلے میں کسی کی نہیں چل رہی ہے' بالکل اسی طرح جس طرح روس کے مقابلے میں ساٹھ اور ستر کے عشرے میں کسی کی نہیں سنی جا رہی تھی اور روس مسلسل اپنی من مانی کر رہا تھا۔ باراک اوبامہ کو اس راہ پر لگانے میں اسی صہیونی اور ہندولابی کا ہاتھ ہے جو امریکی معیشت کو استعمال کر کے مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیلی شرائط کے مطابق فلسطینی ریاست اور یہاں کشمیری ریاست قائم کرانا چاہتی ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ امریکا کب تک اپنی من مانی کرنے کی پوزیشن میں رہے گا۔ کب روس چین فرانس اور دوسری قوتیں ابھر کر اس کی واحد سپر پاور کی حیثیت کو ختم کر دیں گی۔

باراک اوبامہ کی پالیسیوں پر خود امریکا کے اندر ہیجان پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ امریکا کی معاشی حالات ایک دفعہ پھر بگڑنے شروع ہو گئے ہیں حالانکہ اپنے اقتدار کے اوائل میں باراک اوبامہ کو اپنے بینکوں کو بچانے کے لئے اربوں ڈالر کی مدد دینا پڑی تھی۔ امریکی فوجیوں کا افغانستان اور عراق میں تیزی سے ہلاک ہونا امریکی قوم کے لئے پہلے ہی باعث تشویش تھا جبکہ امریکا نے یہود و ہنود کو خوش کرنے کے لئے مزید فوج افغانستان میں بھیجنے کا اعلان کر دیا ہے۔ یاد رہے کہ من موہن سنگھ نے اپنے امریکا یاترا کے بعد فوری یہ بیان دیا تھا کہ امریکی صدر نے ہماری اس تجویز کو منظور کر لیا ہے کہ وہ پاکستان پر مزید دباو ڈالنے کا اپنا وعدہ پورا کریں گے۔ امریکا نے یہ ویسی ہی غلطی کی ہے جیسی وہ ویتنام میں کر چکا تھا۔ وہ جتنی زیادہ طاقت استعمال کرے گا دنیا میں اس کے خلاف جذبات اتنے ہی اور بھڑکیں گے۔

امریکا میں جوں جوں الیکشن قریب آئیں گے عراق اور افغانستان میں امریکا کے خلاف گوریلا جنگ میں اضافہ ہو جائے گا اور اس بات کا خوف ہے کہ باراک اوبامہ الیکشن میں ناکامی کے خوف اور عراق اور افغانستان میں امریکا کے خلاف کامیابی انہیں کوئی حد سے گزر کر اقدام کرنے پر آمادہ نہ کر دے۔ ایسا کرنا ان کے لئے خودکشی کے مترادف ہو گا۔

رہے نام میرے رب کا جو دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے!

بروز سوموار ۲۷ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۱۴ دسمبر ۲۰۰۹ء

کھوکھلا ڈھانچہ

قائداعظمؒ پر اللہ تعالیٰ نے بڑا کرم کیا کہ تخلیقِ پاکستان کے ایک سال بعد ہی اپنے پاس بلا لیا ورنہ نجانے انہیں کس کس سے تخلیقِ پاکستان کے جرم پر ''معافی'' مانگنا پڑتی اور کس کس اتھارٹی سے ''رحم کی اپیل'' کے لئے اپنی جھولی پھیلانا پڑتی۔

اس خزاں نصیب دور میں شائد یہ معمول کی بات ہو لیکن میں نے پاکستان کے لوگوں کو دنیا کے ہر حصے میں اتنا ملول اتنا غمزدہ' اتنا افسردہ اور اتنا اداس صرف اڑتیس سال پہلے دیکھا تھا۔ یہ سولہ دسمبر ۱۹۷۱ء کا ٹھٹھرا ہوا دن تھا۔ اس دن مسجدوں کا شہر ڈھاکہ ہم سے بچھڑ گیا تھا اور ناریل کے درختوں کی پاگل ہوا اجنبی ہو گئی تھی۔ یہ وہی دن تھا جب شیر دل ٹائیگر نیازی' جگجیت سنگھ اروڑہ کو فحش لطیفے سنا رہا تھا اور ریس کورس گراونڈ میں ہتھیار ڈالنے کی تقریب کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور یہ وہی دن تھا جب بلجیم کی یونیورسٹی میں ایک زیر تعلیم ۳۵ سالہ طالب علم نے روتے ہوئے پاکستان کو ناقابلِ تسخیر بنانے کا عہد کیا تھا۔ اس واقعے کے تینتیس سال بعد ایک دفعہ پھر پاکستان کے بیٹے اور بیٹیاں اسی طرح فرطِ غم سے رو رہے تھے' بلک رہے تھے اور سسکیاں بھر رہے تھے جب انہوں نے پاکستان کو ناقابلِ تسخیر بنانے والے کو اپنے ہی ملک میں ٹیلیویژن پر ساری قوم اور دنیا سے معافی مانگتے دیکھا۔

میں وہ دلخراش اور مکروہ منظر شائد ساری زندگی نہ بھلا سکوں۔ مجھے رات کے چھ بجے لاہور سے ایک خاتون ڈاکٹر کا فون موصول ہوا' اس نے ہچکیوں کے دوران جو کچھ کہا اس نے میری دیوارِ جاں تک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں اسے تسلیاں دیتے ہوئے خود پر بھی قابو نہ رکھ سکا لیکن یہ بات سچ ہے کہ ڈاکٹر قدیر کو اس حال میں دیکھ کر میرا اپنا دل بھی ڈوبنے لگا تھا۔ آنکھوں میں دہکتی ہوئی سلائیوں کی طرح ٹیسیں اٹھانے والا یہ منظر میں دوبارہ نہ دیکھ سکا۔ جب بھی ٹی وی کے خبر نامے یا کسی اور پروگرام میں ان کے اس اعترافی بیان کو دہرایا گیا میں نے یا تو فوری اپنی آنکھیں بند کر لیں یا پھر ٹی وی کے سامنے سے ہٹ کر کسی دوسرے کمرے میں چلا گیا کہ میری یہ چوری نہ پکڑی جا سکے۔ سقوطِ ڈھاکہ والے دن بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی لیکن ملک کو دولخت کرنے والے کسی مجرم کا تعین نہ ہو سکا۔

نہ یحییٰ خان کی ڈی بریفنگ ہوئی' نہ اسے کسی اتھارٹی کے سامنے پیش ہونا پڑا' نہ کوئی فردِ جرم عائد ہوئی اور نہ ہی سے ٹیلیویژن پر آ کر معافی مانگنی پڑی اور نہ ہی کسی سے رحم کی اپیل کرنے کی نوبت آئی۔ برسوں بعد جب وہ قولنج کے مرض میں مبتلا ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوا اسے قومی پرچم میں لپیٹ کر پورے اعزازات کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اس وقت قومی پرچم کو اگر قدرت کی طرف سے قوت گویائی مل جاتی تو وہ بھی اظہار نفرت میں کبھی بھی اپنی یہ توہین برداشت نہ کرتا۔

جس دن اس عظیم شخصیت کے گلے پر چھری چلانے کا فیصلہ ہوا اس سے تین دن پہلے ٹائیگر نیازی اگلے جہان سدھار گیا۔ ہتھیار ڈالنے کے بعد وہ ۳۳ سال تک زندہ رہا لیکن اس دوران نہ تو اس کی بھی ڈی بریفنگ ہوئی' نہ اسے کسی اتھارٹی کے سامنے پیش ہونا پڑا' نہ کوئی فردِ جرم عائد ہوئی اور نہ ہی سے ٹیلیویژن

پر آکر معافی مانگنی پڑی اور نہ ہی کسی سے رحم کی اپیل کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے اسباب کا سراغ لگانے' حمود الرحمان کمیشن برسوں تک ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا' آج تک اس کی مکمل رپورٹ منظرِ عام پر نہیں آئی اور اس کی کسی ایک سفارش پر بھی عملی جامہ نہیں پہنایا گیا لیکن ڈاکٹر قدیر کے لئے چھٹی والے دن دفاتر کھلے' صدر مشرف کو اس سے ملاقات کے لئے کمانڈو والی وردی پہننا پڑی' اسی دن معافی نامہ تیار ہوا' اسی دن رحم کی اپیل دائر ہو گئی' اسی دن قوم سے خطاب بھی ہو گیا' اسی دن نیشنل کمانڈ اینڈ کنٹرول اتھارٹی کا اجلاس بھی منعقد ہو گیا اور اسی دن فیصلہ بھی آ گیا کہ اس ''نابکار'' شخص کی تقدیر کا فیصلہ فرشتوں جیسے سراپا امانت اور دیانت وزراء پر مشتمل کابینہ نے معافی قبول کر کے سفارش صدر کو بھجوا دی۔

کی KRL اور اس نے ''گناہوں سے لتھڑے ہوئے'' تیس سالہ دور کے ایک ایک لمحے کی معافی مانگ لی' ان لمحوں کی معافی جو اس نے کے آر ایل تجربہ گاہوں میں گزارے۔ وہ لمحے جن میں وہ پاکستان کو ناقابل تسخیر بنانے کے لئے یورینیم کی افزودگی کے فارمولوں سے الجھتا رہا' وہ لمحے جب وہ دن اور رات کی تمیز کھو بیٹھا اور ایٹمی صلاحیت کے حصول کے لئے انگاروں پر لوٹتا رہا' وہ لمحے جب وہ پہروں میزائل ٹیکنالوجی کی گتھیاں سلجھاتا رہا' وہ لمحے جب سارے جہان کی پابندیوں کے باوجود ریزہ ریزہ جوڑ کر دفاعِ وطن کی فصیل تیار کرتا رہا' آج اس نے ان سارے ''گناہ آلود'' لمحوں کی معافی مانگ لی۔ اس نے پاکستان کی آنے والی نسلوں کو اپنی آبدیدہ آنکھوں سے یہ پیغام بھی دیا کہ آبرو چاہتے ہو تو ایسے گناہوں سے دور رہنا۔

یہ دیوانہ خوشخص ڈھیروں سہولتیں اور بھاری معاوضہ چھوڑ کر پاکستان نہ آتا تو شائد ہمارا سفر زیادہ کٹھن ہو جاتا بلکہ خدانخواستہ آج اسلام آباد کی شاہراہِ دستور پر مکار بنیا اپنی ''دھوتی اور بودی'' کے ساتھ ٹہل رہا ہوتا اور شائد اسے بھی اس بڑھاپے میں عمر بھر کی نظر بندی سے پالا نہ پڑتا۔ تب بھی اسے ایٹمی راز چرانے کا ملزم ٹھہرایا گیا تھا۔ ہالینڈ کی ایک عدالت نے' جس کے دو جج یہودی تھے' اسے چار سال کی سزا سنائی تھی مگر اس نے اپیل کی تو اسے باعزت بری کر دیا گیا لیکن اب کی بار اس نے مقدمہ لڑنے کی کوئی ادنی سی بھی جسارت نہیں کی' شائد اسے ہالینڈ جیسی کوئی عدالت نظر نہیں آئی' کہ وہ پورے اعتماد کے ساتھ اس کی زنجیر عدل ہلاتا۔ اس کے خلاف کیا کچھ نہیں کیا گیا' کون سی گالی نہیں دی گئی' اسے کیسی کیسی اذیت برداشت کرنا پڑی لیکن وہ پتھر بنا سب کچھ سہتا رہا' اس لئے کہ یہ سب کچھ اپنوں کی طرف سے ہو رہا تھا۔ اس نے نہ تو فردِ جرم مانگی' نہ وکیل کیا' نہ صفائی پیش کی' نہ بے گناہی کی اپیل داغی' نہ کسی کو گواہ کیا' نہ کسی سے منصفی چاہی ''نہ سوالِ وصل نہ عرضِ غم' نہ حکائتیں نہ شکائتیں'' وہ عیدِ قرباں کے تیسرے دن' غروبِ آفتاب سے ذرا پہلے قربان گاہ میں آیا اور اپنی گردن چپکے سے چھری تلے رکھ دی۔

اس کی تیس سالہ خدمات کے طویل سفر میں کئی روشن سنگِ میل اور کامرانی کے کتنے ہی تابناک مرحلے آئے لیکن اسے کبھی ٹیلیویژن پر آنے اور خطاب کرنے کا موقع نہیں ملا۔ ان یادگار مرحلوں میں ۲۸ مئی ۱۹۹۸ء کی صبح خوش جمال بھی تھی جب چاغی کے پہاڑوں سے نعرہ تکبیر بلند ہوا' اور پاکستان دو سو کے لگ بھگ ممالک میں' دنیا کی ساتویں ایٹمی قوت کے طور پر ابھرا۔ یہ تعبیرِ خواب اور تکمیلِ آرزو کا دن تھا لیکن اس دن بھی اس نے قوم سے خطاب

نہیں کیا۔ ۴/فروری کو پہلی اور آخری بار اس نے ٹیلیویژن پر قوم سے کچھ کہنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں میں ایک کاغذ تھاما اور شرمگیں نگاہیں، اعترافِ گناہ کی دستاویز پر گاڑتے ہوئے کہا ''میرے اہل وطن! مجھے معاف کر دو۔

سرحد پار واجپائی اپنی انتخابی مہم کے ایک جلسے سے خطاب کر رہا تھا کہ اسے یہ خبر ملی اسی وقت وہاں یہ پرجوش نعرے گونجنے لگے کہ ''عبدالکلام ہیرو ، عبدالقدیر زیرو''۔ ان برہمن زادوں کو کون بتائے کہ ''اعترافِ جرم، معافی کی درخواست اور رحم کی اپیل کے بعد تو عبدالکلام عبدالقدیر کے سامنے بونا لگنے لگا ہے۔ اگر روحوں تک کو جھلسا دینے والا یہ نامہرباں موسم بھارت میں بھی ہوتا، اگر وہاں بھی جمہوریت پا بجولاں ہوتی اور ''اتھارٹیاں'' بے لگام ہوتیں اور اگر وہاں بھی عبدالکلام کو جانکنی کے ایسے ہی کسی لمحے کا سامنا کرنا پڑتا تو شائد پہلی ہی ضرب سے اس کے سارے ہی چھلکے اتر جاتے۔ قدیر خان نے زمانے بھر کے گناہوں کا جو طوق اپنے گلے میں ڈال لیا ہے، اس طوق کے سامنے تو اس کے سینے پر آویزاں طلائی تمغوں کی چمک دمک بھی ماند پڑ گئی ہے، جیسے چودھویں کا چاند ستاروں کو سنولا دیتا ہے، البتہ بی جے پی کا نعرہ ہمارے اس شرمناک ریاستی نظام کے منہ پر زناٹے کا طمانچہ ہے جس نے اعتبار و وقار کی ہر علامت کے چہرے پر کالک مل دی ہے اور آج اسی نظام کو تھامے ہمارے آصف زرداری بھی ایوانِ صدر میں براجمان ہیں۔

بلاشبہ اہل پاکستان کی نظروں میں ڈاکٹر قدیر کا مرتبہ و مقام پہلے سے کئی ہزار گنا زیادہ بلند ہو گیا ہے لیکن ہمارے حکمرانوں اور ساری دنیا کی نگاہوں میں وہ ایک ''اقراری مجرم'' ہے۔ گو اس وقت کی کابینہ نے اس کی رحم کی اپیل منظور کرتے ہوئے اس وقت کے فاسق کمانڈو مشرف سے معافی کی سفارش کی تھی لیکن آج وہ کہاں چلا گیا کہ جس کو قوم نے ابھی تک معاف نہیں کیا۔ افغان طالبان کا لہو پینے اور جہادِ کشمیر کو دراندازی کی چتا میں جھونکنے ہی کی طرح ڈاکٹر قدیر کو بے لباس کرنے والے کو گارڈ آف آنر زدیکر ملک سے کس نے فرار کروایا۔ آج بلیک واٹر والے سارے ملک میں دندنا رہے ہیں لیکن ملک کا وزیرِ داخلہ ابھی تک ان کے وجود سے انکار کر رہا ہے۔ اس باخبر کو کوئی یہ تو بتائے کہ اب تو سی آئی اے والوں نے بھی پاکستان میں بلیک واٹر کی کاروائیوں کا اعتراف کر لیا ہے۔

کئی حوالوں سے یہ خبریں بھی گردش کر رہی ہیں کہ کس طرح بلیک واٹر والے ہمارے ایٹمی اثاثوں کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ اب تو بلیک واٹر کے سربراہ ایرک پرنس نے میگزین وینٹی فیئر کو انٹرویو دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف بھی کر لیا ہے کہ ہمیں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو قتل کرنے کے احکامات دیئے گئے تھے تاہم سی آئی اے نے یہ کہا تھا کہ کسی فائر سے ان کو قتل نہ کیا جائے بلکہ کوئی اور طریقہ اختیار کیا جائے۔ یاد رہے ڈاکٹر قدیر تو ''زندہ شہید'' کا درجہ اختیار کر گیا ہے لیکن کیا ان خطرات میں ڈاکٹر قدیر کی نگہداشت اس حکومت سے ہو پائے گی؟ وہ تو یہی کچھ کر سکتا تھا کہ اپنے وطن کی خاطر اپنی دستارِ فضیلت کی دھجیاں تک اڑا دے اور اپنے ننگ و ناموس کی بولی بھی لگا دے لیکن کیا یہ این آر او کے طفیل کھڑا دیمک زدہ کھوکھلا ڈھانچہ کسی آندھی کے سامنے کھڑا رہ سکے گا؟

رہے نام میرے رب کا جس کے ہاتھ میں عزت و رسوائی ہے!

بروز بدھ ۲۹ ذوالحج ۱۴۳۰ھ ۱۶/دسمبر ۲۰۰۹ء

قیامت سے پہلے قیامت

بہت سے قارئین یہ سوال پوچھتے ہیں کہ بھارت نے اسرائیل ے ساتھ گٹھ جوڑ کیوں کر لیا ہے؟ کیا اس کو معلوم نہیں ہے کہ اسرائیل کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے بعد عرب ناراض ہو جائیں گے اور بھارت کی معیشت کو زبردست دھچکا لگ سکتا ہے؟ اگر عرب ممالک اس سے تجارتی تعلقات منقطع کر لیں اور اپنے ملکوں سے بھارتیوں کو نکال دیں تو پھر کیا ہو گا؟ اس کے علاوہ اس بات کے بھی امکانات ہیں کہ ایران سے بڑھتے ہوئے تعلقات میں بھی کمی واقع ہو سکتی ہے؟

فی الحال اسرائیل ایران کے خلاف بڑھ چڑھ کر بول رہا ہے اور امریکا کے ساتھ ساتھ مغربی ممالک کو بھی ایران کے خلاف اکسا رہا ہے کہ وہ جلد ایران پر چڑھ دوڑیں لیکن اس کے باوجود بھی بھارت اسرائیل کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہا ہے' شائد اس لئے کہ وہ یہ امید لگائے بیٹھا ہے کہ اسرائیل 'بھارت کو غیر ایٹمی پاکستان حاصل کر کے دے دے یعنی وہ پاکستان کے ایٹمی ٹھکانوں پر حملہ کر کے پاکستان کی جوہری صلاحیت کو ختم کر دے۔ ممکن ہے کہ اسرائیل اور بھارت کے گٹھ جوڑ کی یہی وجہ ہو لیکن معروضی حالات میں یہ ناممکن ہے کہ سوائے اس کے کہ ہمارے اپنے حکمران اسرائیل اور بھارت کو راستہ دیں اور ہماری تنصیبات پر حملے کے بعد جوابی حملہ نہ کریں۔

پہلے بھی پاکستان اسرائیل کو یہ وارننگ دے چکا ہے کہ اگر اسرائیل نے پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر عراق جیسی مہم جوئی کی تو پاکستان اسرائیل کے خلاف ایسی کاروائی کرے گا کہ دنیا کے نقشے میں کم از کم اسرائیل کا وجود باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ اسرائیل رقبے کے لحاظ سے کوئی اتنا بڑا ملک بھی نہیں ہے۔ یاد رہے کی ۸۰ءاور ۹۰ء کی دہائی میں اسرائیل نے ایسی کوشش کی تھی کہ اس کے طیارے نیچی پرواز کرتے ہوئے پاکستان کی طرف بڑھ رہے تھے کہ پاکستان کو اطلاع ملتے ہی پاک فضائیہ نے سرعت کے ساتھ اس کا ایسا نوٹس لیا کہ اسرائیلی طیاروں کو راستے سے ہی لوٹنا پڑا۔

پھر ۳۱ مئی ۱۹۹۸ء کے بھارت ایٹمی دھماکوں کے بعد اس اطلاع نے سنسنی پھیلا دی کہ بھارتی اور اسرائیلی طیارے مدراس اور سری نگر سے پاکستان کی ایٹمی ریسرچ لیبارٹری پر حملہ آور ہونے کے لئے تیار کھڑے ہوئے ہیں اور اس وقت تک پاکستان نے ایٹمی دھماکہ نہیں کیا تھا اور اس ایٹمی دھماکے کو روکنے کیلئے اسرائیل بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ آور ہونے کے منصوبے بنا رہا تھا لیکن پاکستان نے سوئٹزرلینڈ کے ساتھ ساتھ بھارتی سفیر کو گہری نیند سے جگا کر اس کے مضمرات سے آگاہ کیا کہ پاکستان جوابی کاروائی میں اسرائیل کے ساتھ بھارت کو بھی نیست و نابود کر دے گا چاہے اس کے نتائج کیسے ہی کیوں نہ ہوں اور ایسا ہی پیغام اسرائیل کو بھی ہنگامی طور پر پہنچایا گیا کہ قیامت سے پہلے قیامت آسکتی ہے۔

اس کے بعد بھارت پاکستان پر حملہ آور ہونے کے ارادے سے یہ کہہ کر باز آیا کہ اس کا پاکستان کی جوہری تنصیبات پر حملے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن یقیناً اسرائیل اور بھارت کی انتہائی مایوسی کے عالم میں پاکستان کو اور پاکستان کے ایٹمی طاقت بننے کے اعلان کو روکنے کی ایک خطرناک کوشش کرنے جا رہے

تھے جو پاکستان نے اپنے بہترین اطلاعاتی نظام کے ذریعے ناکام بنادیا۔

لیکن اب بھی بھارت اور اسرائیل سے بعید نہیں کہ وہ کسی ایسی کسی ناعاقبت اندیش مہم جوئی میں مبتلا ہو اور خفیہ منصوبہ بندی کر رہا ہو لیکن پھر یہ صورتحال ہمیں اسرائیل کے لئے زیادہ خطرہ پیدا کرنے کی دعوت دیتا ہے اور ہمیں زیادہ تیار اور خطرہ کو اسرائیل کے زیادہ قریب لیجانے کے لئے اکساتا ہے اور اسی خوف کے پیشِ نظر اسرائیل، سعودی عرب کے فرمانروا شاہ عبداللہ کے بعد یہ کہانیاں گھڑتا ہوا نظر آتا ہے کہ پاکستان سعودی عرب کو ایٹمی طاقت بن جانے میں مدد کر رہا ہے یا یہ کہ وہاں جوہری اسلحہ رکھنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ یہ قرینِ قیاس تو ہو سکتا ہے کہ جب اسرائیل بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان کی سلامتی کے لئے خطرات بڑھائے تو جواب میں پاکستان بھی ایسا کچھ کرے کہ اسرائیل کو اپنے مکروہ عزائم سے پہلے ہزار بار سوچنا پڑے۔

حرمین شریف کی وجہ سے نہ صرف سعودی عرب پاکستان کا بہترین اور ہمدرد دوست ہے بلکہ اس کی سلامتی ہماری سلامتی ہے اور حرمین شریف کی سلامتی کے لئے کوئی بھی کہیں کا بھی مسلمان وہ کچھ کر سکتا ہے جو اس کے بس میں ہو۔ امریکی اور مغربی ممالک بھی اس بات سے واقف ہیں کہ پاکستان سعودی عرب کے معاملے میں کسی حد تک جا سکتے ہیں۔ ایک امریکی نے ایک پاکستانی دانشور سے سوال کیا کہ آپ کے سعودی عرب کے بارے میں جو تصورات ہیں انہیں دیکھتے ہوئے امریکا میں یہ خیال عام ہے کہ اگر سعودی عرب پاکستان سے ایٹم بم مانگے تو آپ دے دیں گے؟ لیکن اب حقائق اس کے برعکس ہیں۔

اگر آپ کو یاد ہو یہودی وزیرِ خارجہ اور دیگر یہودی حکام پاکستان کے کمانڈو جنرل پرویز مشرف کی زندگی کی دعا مانگا کرتے تھے کہ یہ شخص نام نہاد دہشتگردی کے خلاف جنگ میں انتہائی مددگار ثابت ہوتا رہا، اور ہم سب جانتے ہیں کہ ان کی نظروں میں دہشت گرد کون ہیں۔ دنیا بھر کے متحرک، راسخ العقیدہ مسلمان، اللہ کی راہ میں جان دینے والے لوگ، ظلم کے خلاف کھڑے ہو جانے والے مومن مسلمان جو امریکا اور ان مغربی ممالک سے اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان کے ملک سے واپس چلے جائیں، ان کو اپنے رب کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق تسلیم کریں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان مسلمان ممالک میں اس ظلم کے خلاف کھڑے ہونے والوں کے خلاف امریکی حمائت یافتہ حکومتیں اپنے انہی لوگوں کو مٹانے پر تلی ہوئی ہیں۔

اس لئے ان امریکیوں کو اس بات کی فکر نہیں ہونی چاہئے کہ شائد سعودی عرب کو کچھ دینے سے پہلے ہمارے حکمرانوں کو امریکا کی اجازت درکار ہو گی۔ ہمارے ان حکمرانوں سے معاشی مفادات کی تکمیل میں سعودی عرب کے حق میں چند جملے یا بیانات سے آگے بڑھنے کی توقع کرنا عبث ہے تاہم یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ بھارت، اسرائیل اور امریکا مل کر پاکستان کی جوہری تنصیبات کو ختم کرنے کے درپے ہیں اور موجودہ حالات میں جس طرح رسوائے زمانہ بلیک واٹر مختلف نام کے ساتھ پاکستان کے کئی اہم شہروں میں اپنے مکروہ عزائم کے ساتھ سرگرم عمل ہے، جس کا اعتراف اب امریکی سی آئی اے نے

بھی کیا ہے‘اس سے میرے خدشات کو یقین کی زباں مل رہی ہے کہ موجودہ حکومت کے وزیرِداخلہ رحمان ملک جو اس تنظیم کی پاکستان میں موجودگی کی ہمیشہ نفی کرتے رہے اور ہر بم دھماکے کی ذمہ داری طالبان پر ڈال کر قوم کی توجہ بلیک واٹر والوں کی طرف مبذول نہیں ہونے دی جبکہ بلیک واٹر کا کردار سمجھنے کے لئے ہمیں عراق کی انہی مذموم کاروائیوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔

آخر رحمان ملک اور موجودہ حکومت کس مشن کی تکمیل میں مصروف ہیں‘جہاں کوئی بلیک واٹر کا دہشت گرد پکڑا جاتا ہے‘فوری طور پر وزارتِ داخلہ کے ایک ٹیلیفون سے اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ سرگودھا سے پکڑے جانے والے پانچ امریکی دہشت گرد جو ایک خاص مشن پر یہاں آئے‘وہ اپنے اپنے شعبے کے ماہر اور تربیت یافتہ ہیں‘اور انہوں نے فوری طور پر اپنی پراسرار سرگرمیاں بھی شروع کر دیں تھیں‘ان کو فوری طور پر امریکا ڈی پورٹ کرنے میں رحمان ملک اور وزیرِ صنعت منظور وٹو کس کے کہنے پر اتنے سرگرم ہو گئے ہیں؟ان دہشت گردوں کے پاس تین قیمتی غیر رجسٹرڈ گاڑیاں‘تمام راستوں کا بخوبی علم‘سرگودھا میں ایک سرکاری افسر کے گھر میں رہائش اور ان کے قبضے سے کئی ایسی سی ڈیز اور دستاویزات برآمد ہونا جس میں ہماری فضائیہ کے مضبوط مرکز کے علاوہ اس علاقے میں ہماری ایٹمی تنصیبات کی تفصیلات اور نقشے ہیں‘کس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں؟آخر کیوں ان کے ساتھ پاکستانی ایجنسیوں سے پہلے امریکی سفارت خانے کا وفد ملا اور ان کی گرفتاری پر امریکی سفیر اس قدر پریشان کیوں ہے اور طرح طرح کے بہانے بنا کر ان خطرناک اور مشکوک امریکیوں کو واپس امریکا کیوں بھیجنے کے لئے پریشر ڈال رہا ہے؟

مجھے اس بات کا قوی خدشہ ہے کہ امریکا باقاعدہ ایک سازش کے تحت پاکستان کے عوام اور ہمارے سیکورٹی کے اداروں کو اس قدر کمزور اور خوفزدہ کرنا چاہتا ہے کہ اگر اسرائیل یا بھارت پاکستان کے ایٹمی تنصیبات پر حملہ کرے تو پاکستان سکتے کی حالت میں رہ جائے اور جواب دینے کی صلاحیت سے محروم رہے کیونکہ مستعد‘متحرک اور پرعزم پاکستان پر حملہ کرنے کی جرات نہ تو امریکیوں میں اور نہ ہی یہود و ہنود میں موجود ہے۔ پاکستان کی سلامتی کے لئے جرات کا ہونا بنیادی عنصر ہے جس سے موجودہ حکومت عاری ہے۔ علامہ اقبالؒ نے درست کہا ہے:

تو کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا

یاد رہے کہ ماضی میں بھی ہم نے جرات رندانہ کی وجہ سے دشمنوں کے دانت کھٹے کئے تھے اور ان کو ایٹمی تنصیبات پر حملہ کرنے سے روکا تھا اور اب بھی ہمیں اس جرات رندانہ کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ برطانیہ کے معروف آج کے اخبار ''ٹائمز'' میں چار کالمی خبر میں امریکی مائیک مولن کے حوالے سے یہ خبر چھپی ہے کہ جنرل کیانی نے کسی بھی نئے محاذ کھولنے سے بالکل انکار کر دیا ہے اور یقیناً پہلی دفعہ اس طرح کا شدید ردعمل سامنے آیا ہے جو اغلباً پاکستان میں پریڈی مسجد میں خودکش حملے جس میں بلیک واٹر پر بھی شبہ ظاہر کیا گیا ہے جس میں پاکستانی فوج کے اعلیٰ آفیسر شہید ہو گئے تھے۔ یقیناً اس جرات آمیز فیصلے کی ستائش ہونی چاہئے اور دوسرا جرات مندانہ فیصلہ ابھی چند لمحے پہلے ہماری اعلیٰ عدلیہ کے حالیہ فیصلے سے سامنے آگیا ہے جس نے این آر او کو آئین سے متصادم قرار دیتے ہوئے اس کو ختم کرنے کا حکم دے دیا ہے اب اس کے اثرات حکمرانوں پر کیا پڑتے ہیں‘پرہ گرنے کی دیر ہے۔‘ساری قوم کو اس کی مبارک ہو۔ رہے نام میرے رب کا جس نے ہر حال میں عدل کا حکم دیا ہے کہ یہ تقوے کے قریب ہے۔

بروز جمعۃ المبارک یکم محرم ۱۴۳۱ھ ۱۸ دسمبر ۲۰۰۹ء

لباس کی جنگ

میرے قارئین میں سے کئی دوست تسلسل سے یہ سوال پوچھتے تھے اور میں کسی نہ کسی بہانے سے انہیں ٹال دیتا تھا لیکن جب ٹی وی کے ایک پروگرام میں بھی یہی سوال کیا گیا کہ ''آپ اسلام کی اتنی وکالت کرتے ہیں' مسلمانوں عورتوں کے حجاب پر اعتراض ہوتا ہے تو آپ کا خون کھول اٹھتا ہے' پھر آپ ٹائی کیوں پہنتے ہیں' یہ تو صلیب کی علامت ہے؟''اور پھر میرے گزشتہ کالم کا حوالہ دیا گیا جس میں فرانس میں سکارف پر پابندی پر میرے احتجاج کا ذکر کیا اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ یہودی جو نیویارک میں رہتے ہوئے اپنے لباس پر ٹائی نہیں لگاتے تو آپ اس سے گریز کیوں نہیں کرتے۔

اوّل تو یہ بات طے ہے کہ ٹائی پہننا کوئی قابل فخر بات نہیں ہے اور نہ ہی اتنا سہل لباس ہے کہ اسے پہننے کے بعد آدمی یہ کہے کہ میں نے بڑا آرام دہ کپڑا پہنا ہے۔ایک لباس کا حصہ ہے اور اسی کے ساتھ پہنا جاتا ہے۔آیئے میں آپ کو چند لمحوں کے لئے ٹائی کے آغاز کے ایک سفر پر صدیوں پیچھے لئے چلتا ہوں۔

ملک چین میں ۲۲۱ سال قبل مسیح جو بادشاہ حکمراں تھے' ان کی فوج کا نام ٹیرا کوٹا تھا۔یہ وہ دور تھا کہ جن میں بادشاہوں' ان کے درباریوں' فوجیوں اور عام سروس کے لوگ جنہیں وہ مینڈرنز کہتے ٹائی پہنا کرتے تھے۔۱۹۷۰ء کی کھدائیوں میں چین میں سات ہزار ٹیرا کوٹا فوجیوں کی قبروں کی کھدائی ہوئی تو ہن خاندان برسرِاقتدار آگیا اور انہوں نے سابقہ حکومت کی باقیات کے طور سب کے لباس کے ساتھ موزونیت کے لئے ٹائی موجود تھی لیکن پھر چین پر پر ٹائی کا خاتمہ کر دیا اور پھر یہ ٹائی مازوئے تنگ کے زمانے تک چین واپس نہ آسکی۔ لیکن حیرت ہے جب اس کا آغاز ہوا' اس وقت نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جنم لیا تھا نہ صلیب کی داستاں بنی تھی اور نہ ہی ٹائی صلیب کی علامت ٹھہرائی گئی تھی۔

سلطنتِ روم میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے قبل ۱۰۱ سے ۱۰۶ قبل مسیح میں بادشاہ نے روم کی فوج میں تخصیص کے لئے ان کو ایک خاص قسم کی ٹائی پہننے کا حکم دیا جس پر مختلف اشیاء پینٹ کی جاتی تھیں جب کہ غیر رومی فوجیوں کو سیاہ ٹائی پہننے کا حکم دیا گیا تھا۔یہ وہ زمانہ تھا کہ اس وقت نہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری سینٹ پیٹرز روم میں داخل ہوئے تھے اور نہ ہی روم کے بادشاہ نے عیسائیت قبول کی تھی بلکہ ابھی تک تو حضرت عیسی علیہ السلام پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ پھر اس کے بعد اسی ٹائی نے کیا کیا تبدیلیاں دیکھیں اور حالت یہ آگئی کہ سولہ سو سال بعد کنگ چارلس پنجم جو اسپین کا حکمران تھا ' نے اصلاح پسندوں کے خلاف جنگ کے دوران ٹائی باندھنے کو لازمی قرار دے دیا۔یہ سترھویں صدی میں لڑی جانے والی کئی سالہ طویل جنگ تھی۔اس جنگ میں قتل کرنے اور مارنے کی کئی وجوہات میں سے ایک وجہ یہی ٹائی تھی حالانکہ پہننے اور نہ پہننے والے دونوں عیسائی تھے۔

لباسوں فیشنوں اور تہذیبوں کا یہ تصادم پورے یورپ میں رہا اور یونہی چھوٹے چھوٹے فیشنوں کے نزاع پر سالوں سال جنگ چلتی رہتی' میں اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ فیشن کی اس جنگ اور ملکوں اور تہذیبوں کے تصادم میں کیا کچھ ہوتا رہا' چونکہ یورپ کے سب ممالک اپنے آپ کو ایک دوسرے سے برتر سمجھتے تھے اس لئے ایک دوسرے کے فیشن قبول کرنا بھی اپنی توہین سمجھتے تھے۔اسی لئے فرانس کے بادشاہ کنگ لوئی پندرہ نے حکم دیا کہ ٹائی صرف

لباسوں فیشنوں اور تہذیبوں کا یہ تصادم پورے یورپ میں رہا اور یونہی چھوٹے چھوٹے فیشنوں کے نزاع پر سالوں سال جنگ چلتی رہتی، میں اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ فیشن کی اس جنگ اور ملکوں اور تہذیبوں کے تصادم میں کیا کچھ ہوتا رہا، چونکہ یورپ کے سب ممالک اپنے آپ کو ایک دوسرے سے برتر سمجھتے تھے اس لئے ایک دوسرے کے فیشن قبول کرنا بھی اپنی توہین سمجھتے تھے۔ اسی لئے فرانس کے بادشاہ کنگ لوئی پندرہ نے حکم دیا کہ ٹائی صرف جنازوں میں پہنی جائے کیونکہ یہ اسپین کے لوگ پہنتے ہیں، حالانکہ دونوں ممالک ایک ہی مذہب عیسائیت کو ماننے والے تھے۔ جس وقت اسپین کے زیر نگیں کالونیوں کا رواج عام ہو گیا تھا ٹھیک اسی وقت ایک حیران کن منظر نظر آتا ہے۔ آسٹریا اور دیگر کٹر کیتھولک عیسائی ممالک کے حکمرانوں نے ٹائی پہننے پر پابندی لگادی اور فیشن کے طور پر ایک ریشمی رومال گلے میں ڈالنے کا رواج عام کر دیا لیکن ادھر اسپین نے اپنے ملک میں اس طرح کے فیشن یعنی ریشمی رومال کو گلے میں پہننے پر پابندی لگادی۔ یوں ملک جنگوں، بحرانوں کشمکشوں کی بھینٹ چڑھنے کے بعد آخر کار قریب ہوئے اور ایک دوسرے کے فیشنوں کو قبول کرنے کا رواج جاری ہوا، اور گلے میں پہننے کا ایک ہی کپڑا زندہ رہ گیا جسے ہم آج کی زبان میں ٹائی کہتے ہیں وگرنہ پرانے فیشن کی تصاویر میں آپ کو کئی طرح کے مفلر نما اور ریشمی نما کپڑے ملیں گے جو قمیض اور کوٹ کے درمیان لٹکائے جاتے تھے۔

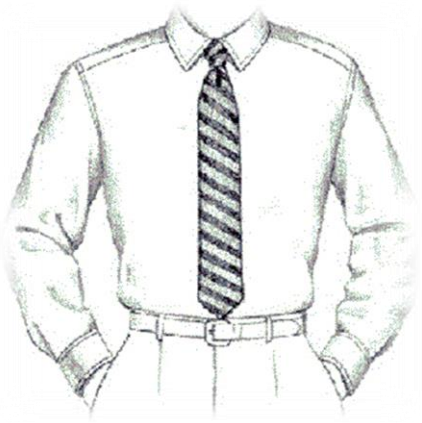

لباس کی جنگ دنیا کے ہر معاشرے کی جنگ رہی ہے۔ شہری، دیہاتی کی پھٹی جوتیوں پر ہنستے ہیں اور دیہاتی شہریوں کے بے آرام لباس کی تضحیک کرنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ عرب والے عجم پر اور یورپ والے ایشیا پر ہنستے رہے ہیں لیکن کبھی کبھی ایک سوال میں آپ سے بھی پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر آج پورے یورپ میں اللہ کے کرم سے کوئی ایسی لہر آئے کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں تو کیا یہ سب لوگ شلوار قمیض، دھوتی کرتا یا عربوں کا جبہ پہننا شروع کر دیں گے اور کبھی تاریخ میں مسلمانوں کی فتوحات کا رخ برصغیر کی طرف نہ ہوتا تو آج شلوار قمیض ہندوؤں، سکھوں اور بدھ مت والوں کا لباس ہوتا اور اگر یہی مسلمان یورپ اور امریکا فتح کرنے چل پڑتے آج پتلون قمیض مسلمانوں کا لباس ہوتا۔

لباس کا شوشا اس طریقے سے مسلمانوں میں چھوڑا گیا تاکہ یہ لوگ اصل معاملات سے دور رہیں اور فروعی اختلافات میں الجھے رہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جس ٹائی کو ہم صلیب کی علامت سمجھتے ہیں وہ پاپائے روم یعنی پوپ کے لباس میں شامل ہی نہیں اور جس حجاب کو ہم مسلمانوں کی علامت اور فخر سمجھتے ہیں وہ چرچ کی ساری راہبائیں پہنتی ہیں اور یہاں معاشرہ کا ہر فرد ان کو دیکھ کر عقیدت سے سر جھکا کر اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے لیکن کسی مسلمان خاتون نے اپنے آپ کو اسی طرح ڈھانپا ہو تو وہ اسی ترقی یافتہ قوم اور مہذب معاشرہ کو دہشت گرد نظر آتی ہے گویا مسئلہ لباس کا نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ قوموں اور علاقوں کے لباس پر جنگیں اس لئے کروائی جاتی ہیں کہ نفرت کے گھپ اندھیرے میں لوگ اصل جنگ کا میدان بھول جائیں۔

سرکار دو عالم ﷺ نے خود اپنی زندگی میں رومی جبہ پہنا حالانکہ روم تو ایک عیسائی ملک تھا، کسروانی قبا پہنی، آخری عمر میں ایران کی ایک مخصوص قسم کی شلوار تھی جو عرب میں نئی نئی آئی تھی، اسے خریدا، پسند فرمائی اور استعمال میں بھی رہی اور آج بھی ان کے ترکے کی یہ اشیا ٹوپ کاپی میوزیم استنبول ترکی میں محفوظ ہیں۔ حضرت عمرؓ نے برنس پہنی جو عیسائی درویش پہنا کرتے تھے جب کہ شیروانی، ٹوپی اور ایسے دوسرے لباس جن کے بارے میں ہمارا گمان

یہ ہے کہ صرف یہی اسلامی لباس ہیں، اس کو کبھی بھی ہمارے رسول اکرم ﷺ یا کسی بھی صحابی نے استعمال نہیں کیا لیکن میں اس کو غیر اسلامی لباس بالکل نہیں گردانتا۔ یہ دین ہر اس لباس کو پسند کرتا ہے جو ستر پوشی کا حق ادا کرے، موسم کے مطابق ہو، بخل یا اسراف کا اظہار نہ ہو، عورتیں اپنی زینت چھپائیں اور مرد ستر کو۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس ساری جنگ میں یہ بھول جاتے ہیں کہ فائر کہاں ہو رہا ہے اور ریت کی بوریاں کدھر رکھنی ہیں اور مورچے کہاں بنانے ہیں۔

قائداعظمؒ نے ہمیشہ انگریزی لباس پہنا لیکن ہندو اور انگریز اسے ہمیشہ اپنا دشمن سمجھتے رہے اور آج مہاتیر محمد بھی انگریزی لباس پہنتا ہے جس نے اپنے دورِ حکومت میں ایک جدید مثالی حکومت قائم کر کے دکھا دی کہ اب ہر آنے والا حکمران اسی کے نقش قدم پر حکومت کو چلا رہا ہے اور اس وقت ملائشیا دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان ملک سمجھا جاتا ہے لیکن مہاتیر محمد کو سارا مغرب اور امریکا اب بھی اپنا دشمن سمجھتا ہے اور کتنے ایسے مسلماں حکمراں ہیں جو جبہ و دستار اور عبا بھی پہنتے ہیں لیکن مغرب انہیں اپنا دوست کہتا ہے کیونکہ مغرب مسلمان کو لباس سے نہیں اس کی سوچ اور عمل سے پہنچانتا ہے اور پھر دشمن ہو جاتا ہے۔ ہم وہ میدانِ جنگ اختیار کر لیتے ہیں جہاں ہمیں شکست ہو سکتی ہے اور اس میدان سے ہم دور بھاگتے ہیں جس میں کودنے سے مغرب لرزتا ہے۔

رہے نام میرے رب کا جس نے عزت کا معیار تقویٰ میں رکھا ہے!

یہ آرزو تھی کہ ہم اس کے ساتھ ساتھ چلیں
مگر وہ شخص تو رستہ بدلتا جاتا ہے
وہ بات کہہ، جسے دنیا بھی معتبر سمجھے
تجھے خبر ہے، زمانہ بدلتا جاتا ہے

بروز منگل ۵ محرم ۱۴۳۱ھ ۲۲ دسمبر ۲۰۰۹ء

رخصتی طے ہو چکی

بہت ہی اہم میٹنگ جاری تھی، دنیا کی تقدیر سنوارنے اور بگاڑنے کی تدبیریں ہو رہی تھیں، یہ بھی طے کیا جا رہا تھا کہ آئندہ دنیا میں واحد سپر طاقت کا رعب کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے کہ سیکرٹری نے ایک اہم اطلاع دنیا کے سب سے طاقتور آدمی کو دی کہ واشنگٹن ڈی سی کے ''اینڈریوز ایئر فورس بیس ''پر جو امریکی ایئر فورس کے تین سی ۱۷ ٹرانسپورٹ طیارے چپکے سے اترے تھے ان کی اطلاع میڈیا کو مل گئی ہے اور بہت سے کیمروں کی آنکھ نے یکے بعد دیگرے طیاروں سے نمودار سٹریچر کی لمبی قطار کو محفوظ کر لیا ہے اور اب تک آنے والے تابوتوں میں یہ سب سے بڑی تعداد ہے۔

باراک اوباما نے ڈوبتے جہاز کے شکستہ بادبانوں کی طرح سرگوشی کی ''یہ المناک مشق کب ختم ہو گی؟''رابرٹ گیٹس نے صدیوں کے بیمار لہجے میں کہا''یہ دکھ کا دن ہے اور جنگوں میں ایسا دن آیا ہی کرتا ہے'' یہ واقعی رعونت شعار قوت کے لئے ایک اور دکھ کا دن تھا۔ وہ جو نجانے کتنے عراقیوں کے سینے چھلنی کرنے، کتنے معصوم افغان بچوں کا لہو پینے، کتنی عفت شعار دوشیزاوں کی عصمتیں پامال کرنے کے بعد اب واپس اپنے ملک میں کرسمس کا تہوار اپنے عزیزوں سے منانے کا ارادہ دل میں لئے ہوئے تھے کہ اجل نے آن لیا۔ کسی بھی انسان کے لہو سے مسرت کشید کرنا انسانی شیوہ نہیں۔ ان تابوتوں میں بھی یقیناً انسان تھے جو کسی نہ کسی کی آنکھوں کا سرور اور دلوں کا قرار تھے۔ ان کی مائیں، بہنیں بیٹیاں اور دوسرے عزیز ان کا انتظار کر رہے ہونگے، ان کے استقبال کی تیاریاں بھی کر رہے ہونگے، گھروں کو سجا رہے ہونگے، دعوتوں کے شرکاء کی فہرستیں اور ڈشوں کی تفصیلات طے کر رہے ہونگے کہ ایک خون آشام خبر سب کچھ خاکستر کر دے گی کہ آپ کے فلاں پیارے کا تابوت فلاں وقت آپ کے گھر میں لایا جا رہا ہے!

اب تک ۴۷۲۳/امریکی ہلاک شدگان اس بھٹی میں جل کر خاکستر ہو چکے ہیں جو پچھلے آٹھ سالوں امریکا نے دہکا رکھی ہے۔ امریکا کی قیادت کا ایک مختصر مگر خود سر ٹولہ جسے اس بھٹی کے لئے ہمیشہ ایندھن کی ضرورت رہتی ہے اس کے لئے ہزاروں معصوم نوجوان جو خوشنما مستقبل کے خوابوں کے عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں، بڑی آسانی سے ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اب بھی یہ آدم خور شکاری مسلسل میکسیکو کی بستیوں میں ہانکا لگا رہے ہیں۔ گرین کارڈ اور امریکی شہریت کی آرزو میں بلکتے تارکین وطن کو جھانسہ دیا جا رہا ہے کہ وہ مخصوص عرصے کے لئے فوجی خدمات سرانجام دیں تو برسوں کا سفر مہینوں اور دنوں میں طے ہو جائے گا۔ محروم طبقے کے طالب علموں سے کہا جا رہا ہے کہ وہ گریجوایشن کے بعد دو سال کے لئے فوج میں آجائیں تو ان کی تعلیم کے اخراجات ریاست برداشت کرے گی۔

بڑھتی ہوئی بے روزگاری سے نڈھال نوجوان سارے رستے بند دیکھ کر بھرتی کے دفاتر کا رخ کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے نوعمر نوجوان فوجیوں کی اکثریت عراق اور افغانستان میں اپنی مجبوریوں اور خوشنما مستقبل وعدوں کی بناء پر پہنچ تو جاتی ہے لیکن بدقسمتی سے ان تابوتوں میں سب سے زیادہ تعداد بھی ان کی بڑی خاموشی اور پراسرار انداز میں گھروں میں لواحقین کے حوالے کی جاتی ہیں۔ ان مرنے والوں میں زیادہ چھوٹے اہلکار اور سپاہی ہیں۔ ان میں کوئی کسی عالی مرتبت باغ میں اگے متبرک درخت کا پھول نہیں، سب جنگلی جھاڑیوں کے بیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک امریکا میں جانے والے ۴۷۲۳ تابوت

کانگرس اور سینیٹ میں کوئی ہلچل نہیں مچا سکے اس لئے کہ ان تابوتوں کا رخ امریکا کے نادار گھرانوں کی طرف ہے جو طوفان اٹھانے اور قیامت بپا کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔

آج سے کچھ سال پہلے امریکی فرسٹ آرمرڈ ڈویژن کے ڈپٹی کمانڈر بریگیڈیئر جنرل مارک ہرٹلنگ نے ایک ایسا تبصرہ کیا تھا جو امریکی اندازِ فکر کے نادر نمونے کے طور پر تاریخ کے ریکارڈ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا۔ انہوں نے اخبار نویسوں کو بتایا ''بغداد میں ایک ہی دن متعدد خودکش حملے دراصل غیر ملکی جنگجوؤں کی کارستانی ہے'' مودب رپورٹروں میں سے ایک گستاخ نے یہ پوچھ لینے کی جسارت کر دی کہ ''کیا آپ کا شمار بھی غیر ملکی جنگجوؤں میں نہیں ہوتا؟'' تو فوری پریس کانفرنس کو لپیٹ دیا گیا۔ نشہ قوت کس طرح ذہن کی اوسط صلاحیتوں کو مسخ کر دیتا ہے کہ سات سمندر پار سے آیا ہوا ایک غاصب آج بھی خود کو غیر ملکی جنگجو سمجھنے کی بجائے سرزمین دجلہ و فرات، کابل اور قندھار کا وارث خیال کرتا ہے جیسے اس نے موصل یا غزنی میں جنم لیا ہو، بصرہ یا قندھار میں کھجوروں کے باغات میں پروان چڑھا ہو، جیسے اس کے دن بغداد یا کابل کی یونیورسٹیوں میں اور شامیں داستانی کشش رکھنے والی پراسرار بستیوں کے قہوہ خانوں میں گزاری ہوں۔

بریگیڈیئر جنرل مارک ہرٹلنگ اور اس کے ساتھی آج بھی بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ منہ بھر کر کہنے میں ذرہ بھر بھی ندامت محسوس نہیں کرتے کہ عراق اور افغانستان میں یہ سب کاروائیاں غیر ملکی کر رہے ہیں اور یہ سب بدامنی اور قتل و غارت غیر ملکی جنگجو کر رہے ہیں۔ اپنے گھروں، اپنی بستیوں اپنے اہل و عیال کو سفاک درندوں سے نجات دلانے کی پرعزم جدوجہد کرنے والے تو غیر ملکی جنگجو ہیں اور اپنے اسلحے خانے کے زور پر عراق اور افغانستان پر تسلط جمانے والے ان ملکوں کے مالک و مختار ہیں۔ ایک اخباری رپورٹر نے حواس باختہ امریکی جنرل سے یہ پوچھا کہ ''جب جہاز سے امریکی ہلاک شدگان کے تابوتوں کو جہاز سے اتارنے کا منظر مختلف ٹی وی چینلز پر کھائے جا رہے تھے اس وقت آپ نے ان ناچتے عراقی اور خوشی سے جھومتے افغانیوں کو نعرے لگاتے دیکھا ہے؟ حقیقتوں سے چشم پوشی کرنے اور سامنے کے منظروں سے آنکھیں چرانے والے حیلہ ساز شخص نے کہا ''جب اس طرح کا واقعہ ہوتا ہے تو کسی ایک نوجوان کا ناچنا اور تالیاں بجانا کوئی خاص بات نہیں"۔

امریکی اور برطانوی ذرائع ابلاغ کی رگِ جاں ان خفیہ ہاتھوں میں ہے جو قطرے کو طوفان اور پہاڑ کو رائی بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہاں سے نشر ہونے والی خبریں اور دکھائی جانے والی تصویریں بھی سو سو چھلنیوں سے چھنتی ہیں اس کے باوجود سی این این اور بی بی سی پر ہر روز عراقی اور افغانی عوام کے نعرہ زن ہجوم دکھائی دیتے ہیں جو غاصبوں کے بارے میں کسی بھی منفی خبر پر بے ساختہ مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ جب کبھی کسی فوجی کانوائے پر حملہ ہوتا ہے اور گاڑیاں نذرِ آتش ہوتی ہیں تو وہ گھروں سے نکل آتے اور دیوانہ وار رقص کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک منظر میں ایک عراقی جلتی امریکی فوجی گاڑی کو گولیوں کا نشانہ بنا کر اپنے غم و غصہ کا اظہار کر رہا تھا۔

امریکا ہار رہا ہے اور ٹیکنالوجی کی نبضیں ڈوب رہی ہیں۔ بموں کی مائیں، عراق اور افغان ماؤں کے سامنے بے بس ہو گئیں ہیں۔ سرزمین بصرہ و بغداد اور کابل و قندھار کے فرزندوں نے بے سروسامانی کے باوجود امریکی تسلط قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ امریکا پچھلے آٹھ سالوں کے دوران کوئی ایک بھی

منظر تخلیق نہیں کر سکا جس میں عراقی یا افغانی عوام کسی امریکی صدر کی تصویر اٹھائے خوش آمدید کے نعرے لگا رہے ہوں۔ تاریخ دم سادھے کھڑی ہے اور امریکا کے قہر و غضب سے ڈرانے والوں کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ وہ جوہری کہیں دکھائی نہیں دے رہے جو اپنی دانش کی کسوٹی کو حرفِ آخر سمجھتے ہوئے گواہیاں دے رہے تھے کہ ٹیکنالوجی ہارا نہیں کرتی، جو بھول گئے تھے کہ اخلاقی جواز سے عاری جنگیں ٹیکنالوجی کے زور پر نہیں جیتی جا سکتیں ۔اب بھلا میں جناب آصف زرداری کی یہ بات کیسے مان لوں کہ کہ پاکستان کی بقاء امریکا کی دوستی میں ہے۔

امریکا تو اپنی شکست کا اعتراف کر چکا، اب دیکھنا یہ ہے کہ امریکا کے نمک خوار جو این آر او کے تحت در آمد کئے گئے تھے ان کا مستقبل کیا ہے؟ کیا سوئٹزر لینڈ میں شرلاک ہومز یا جیمز بانڈ جیسی بھونڈی حرکات کرنے والے اپنی اس غیر قانونی حرکات سے اپنے آقا آصف زرداری کی کھال کو بچا سکیں گے؟ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں سرے محل کے لئے پاکستان سے اسمگل شدہ نوادرات کی وصولی اور بعد میں نیب کو ملک کی لوٹی ہوئی رقم کا ایک چیک دیکر برطانیہ واپسی کے کردار کو قوم بھول چکی ہے؟ برطانیہ کے ایک مقامی چینل پر چلنے والے پروگرام جو پاکستان کے خلاف کالے کرتوت کرنے والوں کو بے نقاب کر رہا تھا اس کو بند کروانے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ شائد اپنی نوکری کا پکا کروانے کی کوشش ہو رہی ہے لیکن اب تو رخصتی کا طے ہو چکا اور وہ بھی ناپسندیدہ طریقے سے۔ ہونی کو کوئی روک سکا ہے؟ افتخار عارف بے طرح یاد آرہے ہیں!

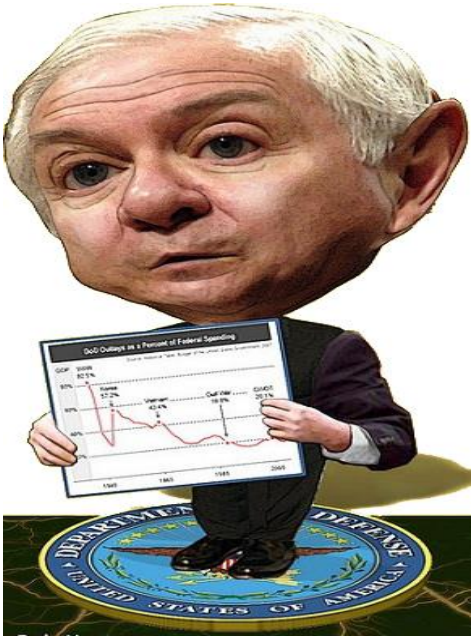

جوہری کو کیا معلوم، کس طرح کی مٹی میں
کیسے پھول ہوتے ہیں
کس طرح کے پھولوں میں کیسی باس ہوتی ہے
جوہری کو کیا معلوم
جوہری تو ساری عمر پتھروں میں رہتا ہے
زرگروں میں رہتا ہے
جوہری کو کیا معلوم
یہ تو بس وہی جانے
جس نے اپنی مٹی سے
اپنا ایک اک پیماں، استوار رکھا ہو
جس نے حرفِ پیما کا اعتبار رکھا ہو
جوہری کو کیا معلوم
کس طرح کی مٹی میں کیسے پھول ہوتے ہیں
کس طرح کے پھولوں میں کیسی باس ہوتی ہے

بروز جمعرات ۷ محرم ۱۴۳۱ھ ۲۴ دسمبر ۲۰۰۹ء

ماتھے کا جھومر

اقبال نے تو کہا تھا کہ گہری تاریکیوں میں مرنے والوں کے ماتھے ستاروں کی طرح راہ دکھاتے ہیں، پھر یہ کیا ہوا کہ جلیلی القدر ہستیوں کی یاد صرف خراجِ تحسین کا عنوان بن گئی۔ فاروق اعظمؓ کا دن گزر گیا لیکن کیا ہم نے یہ سوچا کہ ہمارا کل ان کی یاد سے منور اور معتبر ہو سکتا ہے اور کیا ان کی شخصیت آج بھی رہنما ہو سکتی ہے؟

کچھ سال پہلے ایک نوجوان سیاستدان ہمسفر تھے، گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو بڑے آسودہ اور پر جوش تھے، کہنے لگے کہ "آجکل ماوزئے تنگ اور امام خمینی کو پڑھ رہا ہوں"، عرض کیا "ضرور پڑھئے، یہ ہمارے عہد کے اہم ترین لوگ ہیں، تاریخ پہ جن کا گہرا نقش ہے اور اپنی اقوام کی تقدیر کو جنہوں نے بدل ڈالا لیکن اگر سیاست سیکھنی ہو، اگر قوت فیصلہ کو بہتر بنانا ہو اور اگر یہ سمجھنا ہو کہ بہتر حکمرانی کن اوصاف اور کن اصولوں کا تقاضہ کرتی ہے تو حضرت عمرؓ بن خطاب کو ضرور پڑھئے"۔

کیا مسلمان سیدنا عمرؓ بن خطاب کو پڑھتے ہیں؟ جواب ہو گا کہ نہیں! وہ ان پر فخر کرتے ہیں، ان سے محبت کرتے ہیں، ان کی عظمت و شوکت کو یاد کر کے خود کو تھامتے اور سہارا پکڑتے ہیں لیکن پڑھتے نہیں ہیں۔ حزب المجاہدین کے سربراہ محمد صلاح الدین کو ان کے ساتھی نے بہت برا طعنہ دیا تو آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور انہوں نے سوال کیا "اس نے ایسا کیوں کیا؟" عرض کیا، رہنما سیرت نہیں پڑھتے، وہ نہیں جانتے کہ ہمدردی، حسنِ ظن اور خیر خواہی کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔

ماضی میں رہنے والے قدامت پسندی کے مارے مسلمان اگر سیدنا عمرؓ فاروق کی حیات کا مطالعہ کریں تو ان پر کھلے کہ آئین نو سے ڈرنا اور طرزِ کہن پر اڑنا جہالت کی ایک قسم ہے۔ بحرین سے طویل مسافت طے کر کے ابوہریرہؓ پانچ لاکھ دینار اٹھائے مدینہ میں داخل ہوئے تو عمرؓ بن خطاب کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ تمہارا دماغ تو درست ہے، کیا تم گنتی جانتے ہو؟ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ ان کا دماغ بھی درست ہے اور وہ گنتی بھی خوب جانتے ہیں۔ فراغت نہ دینے والے ہنگاموں کے سبب ٹیکس کا مال جمع ہوتا رہا، ایسے میں مشاورت ہوتی اور بحث کی جاتی۔ سیدنا علیؓ ابن طالب نے فرمایا "بانٹ دیجئے۔" فرمایا: محتاج کو بقدر ضرورت دیا جا چکا۔ پھر پلٹ کر سوال کیا، شاہانِ عجم ایسے میں کیا کرتے تھے؟ عمارت بنائی، حساب کتاب کے رجسٹر تیار ہوئے، قبطی منشیوں کو ملازم رکھا اور اسلام میں پہلی بار خزانہ وجود میں آیا۔

ہنگامی طور پر لیکن پائیدار اور مستقل بنیادوں پر ایک نیا ادارہ وجود میں آ گیا۔ وظائف کا سلسلہ شروع ہوا تو محتاجوں، کمسن بچوں کے والدین، اصحاب کبار اور اہلِ بیت کو ان کے گھروں میں خاموشی کے ساتھ وظائف کی رقوم پہنچا دی جاتیں۔ اہل بیت کو زیادہ وظیفہ دیا جاتا لیکن وہ تو ایک ہاتھ سے وصول کرتے تو دوسرے ہاتھ بانٹ دیتے۔ آمدن بڑھی تو دودھ چھڑانے کے بعد نہیں، بچوں کی فوری پیدائش کے بعد وظیفہ شروع کر دیا جاتا۔ پھر بیروزگاروں کو اور

ایک بے نوا یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو مفلس غیر مسلموں کی فہرست بنانے کا حکم جاری کر دیا گیا کہ مستقل طور پر ان کی احتیاج کو دور کرنے کی سبیل ہو سکے۔ ایک سفر میں معلوم ہوا کہ ریگزار کے فرزند بیمار، مرتے ہوئے اور بوڑھے جانوروں کا چارہ بند کر دیتے ہیں تو سرکاری خزانے سے چارہ فراہم کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا۔

چھبیس ادارے جی ہاں مستقل طور پر ۲۶ نئے ادارے قائم کئے، مثلاً ملٹری انٹیلی جنس اور سوشل سیکورٹی کو تو ایسا عروج بخشا کہ ۱۴ صدیوں کی مجموعی انسانی ذہانت بھی اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکی۔ سیکنڈے نیویا میں اسی لئے سوشل سیکورٹی کو عمر لاء کہا جاتا ہے اور برطانیہ میں اس تصور کے معمار نے کہا تھا کہ اس نے یہ سب مسلمان عبقری کی سوانح سے اخذ کیا۔

محاسن بے شمار ہیں لیکن بنیاد یہ کہ ایک درد بھرا دل رکھتے تھے۔ قرآن قرار دیتا ہے کہ حکمران کو صاحبِ علم، توانا اور اجلا ہونا چاہئے۔ وہ ایسے ہی تھے، فیصلہ کبھی موخر نہیں کرتے، کوئی علمی نکتہ سامنے آتا تو اصحاب کبار سے کرید کرید کر پوچھتے۔ عبداللہ بن عباسؓ عبداللہ بن مسعود کو اسی لئے عزیز رکھتے کہ صاحبانِ علم تھے۔ عدل اولین ترجیحات میں سب سے بڑی ترجیح تھا۔ اصحاب بدر تک سے رعائت نہیں کرتے۔ اپنے صاحب ﷺ اور صدیق اکبرؓ کو یہی کرتے دیکھا تھا اور وہ ساری عمر اس پر قائم رہے۔ اپنی کسی رائے کو غلط پاتے تو علی الاعلان تسلیم ہی نہیں کرتے بلکہ معذرت کر لیتے، زعم کا روگ کبھی نہیں پالا۔ ہمیشہ بلالؓ حبشی کے احترام میں کھڑے ہو جاتے اور علیؓ ابن طالب کے بارے میں ایک بار یہ کہا "اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ برباد ہو جاتا"۔

دمشق میں امین الامت کی سادگی اور درویشی دیکھ کر رو دیئے۔ معمولی لباس پہنتے، کچے گھر میں رہتے اور عام مسلمانوں میں نہ صرف گھل مل کر بلکہ ان میں سے ہر ایک کو سوال اور اعتراض کی کھلی اجازت دیتے۔ معاشرے کو سنوارنے کا نسخہ ان کے نزدیک یہ تھا کہ حکمران طبقہ درست رہے اور اس کا کردار، عامیوں کا رہنما ہو، لہٰذا حکام، گورنروں حتیٰ کہ اصولی معاملات میں اصحاب کبار تک سے سختی برتتے۔ جناب خالدؓ بن ولید کا معاملہ یہی تھا۔ حکمرانی طاقتوروں کے گٹھ جوڑ اور اہل رسوخ کو رعائتیں دیکر چلائی جاتی ہیں۔ اسلام نے اس طرز کو بدل ڈالا تھا اور عمرؓ اس روش کے نگہبان تھے۔ ملوکیت میں جاہلیت پھر پلٹ آئی، تفصیل کا محل نہیں، مجملاً عرض ہے کہ تعلیم کو فروغ دیا۔ عدل کے معاملے میں انتہا درجہ کی سختی برتی۔ بیمار کے علاج اور محتاج کے رزق کو ریاست کی ذمہ ٹھہرایا۔ امن کو ہر حال میں قائم رکھا اور ہر چند امیر معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے بارسوخ گورنروں پر سخت تھے مگر سیاسی استحکام کے لئے گاہے تلخ گھونٹ پی لیتے لہٰذا ان دونوں کو ڈانٹا مگر معزول نہیں کیا کہ امن کے لئے استحکام لازم ہوتا ہے۔

ہمدردی بار دگر عرض ہے تمام انسانوں سے گہری ہمدردی ان کے طرز حکمرانی کی اساس تھی اور ظاہر ہے کہ یہ رحمتہ للعالمین ﷺ کی تعلیم کا ثمر تھا اور جناب ابو بکرؓ کا ورثہ بھی جنہیں وقت کم ملا۔ عظیم اوصاف کے حامل ہیں۔ غصہ تھا لیکن اگر ذرا سی زیادتی بھی ہوتی تو معافی مانگنے میں ذرا بھی تاخیر نہ کرتے۔ اوّل اوّل عورتوں کو اہمیت نہ دیا کرتے۔ خود کہا: ''ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ عورتیں بھی کوئی چیز ہیں، یہ تو ہم نے آنجناب ﷺ سے سیکھا'' دراز قد، گورے چٹے، انتہائی بارعب اور فصیح۔ وہ ہمیشہ غور و فکر میں منہمک رہتے، ہمیشہ سیکھتے رہنے والے، انتہائی سادہ، بہت منکسر، خوبیوں پر کبھی ناز نہ کرتے، ہمیشہ کوتاہیوں کی فہرست اور خود کو سنوارنے کی فکر میں مبتلا رہتے۔

ہم نے یہ پاکستان حاصل کرتے ہوئے اپنے رب سے یہ وعدہ تو کئی بار کیا کہ ہم ان بندوں کو جو بندوں نے اپنے غلام بنا لئے ہیں ان کو ان بندوں کی غلامی سے نکال کر رب کی غلامی میں دے دیں گے ،لیکن ہم نے اب تک ساری عمر وعدہ خلافی میں گزار دی اب یہ سوچتے ہیں کہ ہم پر ایسے حکمران کیوں مسلط کر دیئے گئے جو ہم سے غلام در غلام ہونے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ملک کا کھربوں روپیہ لوٹ کر بھی خود کو بے گناہ اور معصوم ظاہر کرتے ہوئے اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ یہاں سے مجھے ایمبولنس کے ذریعے تو نکال سکتے ہو' زندہ میں اس منصب کو نہیں چھوڑوں گا۔ قوم کے محافظ اپنی پارٹی کو خطاب کرنے کے لئے بھی باہر نہیں نکلے مبادا کوئی اور آن دھمکے۔ جمہوریت کی پاسبانی کا نعرہ لگانے والے اب عدالتی احکام کو بھی خاطر میں نہیں لاتے کہ ملک کا آئین استثناء کی سہولت دیتا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ آپ اگر واقعی بے گناہ اور معصوم ہیں تو استثناء اور ڈر کیسا!

ان کے نمک خوار تو پوری کوشش میں ہیں کہ ان کے خلاف جتنے بھی ثبوت و شواہد ضائع کئے جا سکتے ہوں اس میں تاخیر نہ کی جائے لیکن ''وہ'' اپنے ان ثبوتوں کو کیسے ضائع کریں گے جن کی بناء پر وہ خود نیب سے جان چھڑا کر آئے تھے۔ ۲۳ جنوری ۱۹۹۷ء کو نیشنل ویسٹ منسٹر بینک سلون سٹریٹ برانچ لندن سے اکاونٹ نمبر ۰۲۔۲۸۹۷۶۔۹۴ کا چیک نمبر ۰۰۰۰۵۱ جس کی مالیت ۴ کروڑ ۳۷ لاکھ ۸۷ ہزار ۷ سو پچاس پاونڈ تھا، پہلی قسط کے طور پر اپنے اکاونٹ سے کیوں ادا کی؟ کیا وہ قوم کو اس کا جواب دیں گے؟ قارئین! ابھی اس کتاب کا پہلا ورق کھولا ہے' دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے!

آیئے اپنے موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔ آج ہم انہیں یاد کرتے' ان سے محبت اور ان پر فخر کرتے ہیں لیکن افسوس ان سے سیکھتے کچھ نہیں۔ ہمارا آنے والا کل ان کی یاد سے منور اور معتبر ہو' اگر ہم سیکھیں۔ اگر تقلید کو ترک کریں' سوچیں اور بروئے کار لائیں' اگر ہم عہدِ جدید میں قرآن و سیرت کی اساس پر زندگی بسر کرنے کا ارادہ باندھیں تب مرنے والے کے ماتھے گہری تاریکیوں میں ہمارے رہنما ہوں۔ اقبال کا قول سچا ہو جائے:

بروز جمعۃ المبارک ۸ محرم ۱۴۳۱ھ ۲۵ دسمبر ۲۰۰۹ء

کوتاہیوں کا کفارہ

"یوم یکجہتی کشمیر" ایک علامت ہے اس احساسِ ذمہ داری کی جو کشمیر کی جدوجہد کے سلسلے میں ہم اہل پاکستان پر عائد ہوتی ہے۔ کشمیر میں خودارادیت کے حق کے حصول کے لئے گزشتہ چھ دہائیوں سے جو جدوجہد ہو رہی ہے اس میں پاکستان کی بقاء بھی شامل ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ ایک خاص منصوبہ بندی اور سازش کے تحت پیدا کیا گیا ہے۔ برصغیر سے جب برطانیہ کے استحصالی دور کا خاتمہ ہوا تو یہاں دو آزاد ملک وجود میں آئے۔ کشمیر کا مسئلہ نہ ہوتا تو یہاں مغربی طاقتوں کی مداخلت کا کوئی جواز نہ ہوتا۔ مغربی طاقتوں خصوصاً برطانیہ اور امریکا کے دو اصول ہیں۔ اپنے داخلی معاملات میں وہ سچائی اور انصاف کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں اور بین الاقوامی سیاست میں وہ منافقت کا اصول اپنے سامنے رکھتے ہیں اور معاملہ مسلمانوں یا مسلمان مملکتوں کا آجائے تو ان کے فیصلوں پر صہیونی اثرات غالب آجاتے ہیں۔

کشمیر کا مسئلہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کوئی سرحدی تنازعہ نہیں ہے۔ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے بھارت نے اپنے وجود کی ابتداء ہی جارحیت سے کی ہے۔ اس جارحیت کی ابتداء کشمیر سے ہوئی جس کی تیاری دہلی کے "وائسرے گل لاج" میں قیام پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی کی گئی۔ کشمیر کی ریاست ہر سمت سے پاکستان کے اندر تھی اور وہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت بھی تھی۔ کشمیر تک بھارتی فوجوں کو راستہ فراہم کرنے کے لئے وائسرے ماونٹ بیٹن اور باونڈری کمیشن کے صدر سیرل ریڈکلف نے پاکستان کے ساتھ کھلم کھلا بدعہدی کی اور ضلع گورداسپور کی دو تحصیلیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، بھارت کو دے دیں، پھر ایک مشکوک دستاویز کے ذریعے مہاراجہ کشمیر کے نام سے بھارت سے کشمیر کے الحاق کا اعلان کیا گیا اور بھارتی فوجیں فوراً کشمیر میں داخل ہو گئیں اور اس جارحیت سے دفاع کے لئے پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے قائداعظم نے جب افواج پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی جو انگریز تھا حکم دیا تو اس نے قائداعظم کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

یہی نہیں بلکہ اس وقت کے برطانوی وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی نے برطانوی دارلعوام میں قانونِ آزادی کا مسودہ پیش کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "ہمیں افسوس ہے کہ ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے اور ہمیں توقع ہے کہ یہ پھر ایک ہو جائے گا حالانکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ یہ پورا برصغیر کشمیر سے راس کماری تک اور برما سے بلوچستان تک کبھی ایک نہیں رہا۔ برصغیر کی یکجہتی، دراصل یادگار ہے ہمارے دورِ غلامی کی، برطانیہ کے استحصالی اقتدار کے دور کے علاوہ یہ علاقہ کبھی ایک ملک یا ایک جغرافیائی وحدت نہیں رہا۔ انگریزوں نے اپنے غاصبانہ دور میں تین تصورات عام کئے، وطنی قومیت کا تصور، جمہوریت کا تصور اور جغرافیائی وحدت کا تصور۔ وطنی قومیت کے فروغ کا مقصد مسلمانوں کو ان کی عالمگیر ملی شناخت سے دور کرنا تھا، جمہوریت کا مقصد برصغیر میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی ہندو اکثریت کا مستقل پابند بنانا تھا۔

جغرافیائی وحدت کا مقصد یہ تھا کہ ہندو قیادت اس پورے برصغیر کو اپنی ملکیت سمجھے اور اس میں کسی کمی کو اپنے دائرہ اقتدار میں کمی سمجھے۔ گاندھی جی نے اسی تصور کے تحت کہا تھا کہ "قیامِ پاکستان کا مطلب یہ ہو گا کہ گویا گؤ ماتا کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں۔" گاندھی جی کی سیاست قول و عمل کے تضاد اور

منافقت کا بڑا نادر عملی نمونہ تھی۔ انہوں نے لہجہ دھیما رکھا لیکن ہندوؤں کے مذہبی جذبات بھی خوب بھڑکائے۔ انگریزوں نے برصغیر میں مسلمانوں سے مجموعی طور پر معاندانہ حکمت عملی اختیار کی، یہ ان کے نقطہ نظر سے تاریخ کا تقاضہ تھا۔ انہوں نے ہندوؤں سے یکجہتی اختیار کی اور ہندوؤں نے اسے قبول کیا اور یہ دونوں کے باہمی مفاد کا تقاضہ تھا۔ افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ ہمارے درمیان اب بھی ایسے لوگ ہیں جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ بھارت اور برطانیہ حقیقی معنوں میں پاکستان کے خیر خواہ ہو سکتے ہیں۔

ان دونوں ملکوں کی سیاسی لغت میں ''بین الاقوامی تعلقات'' کے حوالے سے معاہدوں کی پابندی کی اصطلاح محض نمائش کے لئے ہے، عمل کے لئے نہیں ہے۔ بھارت خود اقوام متحدہ میں کشمیر کا مسئلہ لیکر گیا، سلامتی کونسل کی واضح قرادادیں کشمیر کے مسئلے پر موجود ہیں لیکن چھ دہائیاں گزر گئیں کہ بھارت مسلسل سلامتی کونسل کی قراداوں کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہا ہے اور عالمی طاقتیں خاموشی سے تماشہ دیکھ رہی ہیں۔ سلامتی کونسل کی قراداوں کی خلاف ورزی کرنے والے اس وقت ساری دنیا میں صرف دو ممالک ہیں، ایک بھارت اور دوسرا اسرائیل، اور ان دونوں کو برطانیہ اور امریکا کی پوری سرپرستی حاصل ہے۔ کشمیر اور فلسطین میں بڑے تسلسل اور بڑی بے حیائی کے ساتھ انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں، ہر دن معصوم اور بے گناہ انسان حکومتی بربریت اور دہشت گردی کا شکار ہو رہے ہیں اور منافقانہ سیاست کی ماہر عالمی طاقتیں تماشا دیکھ رہی ہیں، صرف اس لئے کہ یہ بہنے والا خون مسلمانوں کا ہے۔

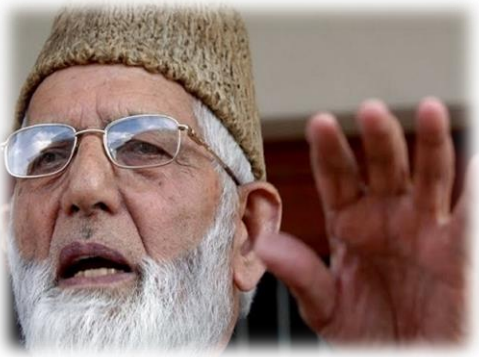

جہاں تک برطانیہ اور امریکا کا تعلق ہے تو اسرائیل ان کا مربی ہے اور وہ اسرائیل کے جارحانہ مقاصد کی حمائت پر مجبور ہیں، رہ گیا بھارت تو وہ اس پورے علاقے میں ان کے مفادات کا واحد نگراں ہے لہٰذا وہ یہاں بھارت کی چودراہٹ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ بھارت میں تمام اقلیتوں کے ساتھ اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً جو مظالم روا رکھے ہیں وہ بالکل عیاں ہیں۔ کشمیر میں بے رحمی اور درندگی انتہاء کو پہنچ چکی ہے لیکن مغربی ممالک صہیونی طاقتوں کے زیرِ اثر میڈیا اور حکومتیں یہ ڈنکہ پیٹ رہی ہیں کہ بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔ دونوں اطراف سے یہ تاجرانہ رشتوں کا ظہار اور تاجرانہ ذہنیت کی پکار ہے۔ یہ ایشیا کی نہیں، علاقوں میں اثر ورسوخ کے سودے ہیں، کرداروں کے نام بدلے ہیں، ڈراموں کے کردار بدلے ہیں، کہانیاں نہیں بدلیں، جن میں مرکزی خیال یہ ہے کہ نسبتاً کمزور لیکن وسائل رکھنے والی قوموں کا استحصال کیا جائے۔ یہ انسانیت کی تذلیل ہے، رسوائی ہے، یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے وجود کا تسلسل ہے۔ بھارت کشمیر میں وہی کچھ کرتا چلا آیا ہے جو تکبر اور جبر پسندی کا تقاضہ ہوتا ہے۔ ہر فرعون نے اپنے اپنے دور میں یہی روش اختیار کی کہ مخالفت کو شدید بے رحمی سے کچل دیا جائے لیکن وہ بات جو فیض نے کہی ہے:

یہی جنون کا یہی طوق ودار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم

شیطانی جبر کے مقابلے میں ایمانی توانائی سدراہ بن جاتی ہے اور بالآخر کامیاب ہوتی ہے۔ جبر کرنے والے اذیتوں اور موت سے ڈراتے ہیں، ایمانی قوت موت سے نبرد آزمائی کی جرات عطا کرتی ہے۔ موت میں خوف ہی نہیں ہوتا، لذت بھی ہوتی ہے اور جذبہ ایمانی اس لذت کو نکھارتا ہے۔ خود اہل کشمیر

اس لذت سے اب سرشار ہو گئے ہیں۔ یہ اللہ کا کرم ہے اہل کشمیر پر بھی اور اہل پاکستان پر بھی، کشمیری صرف کشمیر کی آزادی کی ہی نہیں بلکہ پاکستان کے استحکام کی جنگ بھی لڑ رہے ہیں۔ حریت کی داستانیں اس طرح رقم ہو رہی ہیں کہ تاریخ بھی ششدر ہے۔ بھارت کی جارحانہ طاقت جذبہ حریت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بھارت کی لاکھوں کی تعداد میں فوج ہر طرح سے مسلح ہے اور کشمیری اس کے مقابلے میں تقریباً غیر مسلح ہیں لیکن بھارت کی بھرپور مسلح فوج انسانی اقدار سے نہ صرف محروم ہے بلکہ اس سے متصادم ہے اس لئے ناکامی بالآخر ان کا مقدر ہو گی۔ قوموں کی زندگی میں یہ مرحلے آتے ہیں، جھکے سر کے ساتھ، طیش یا سربلندی کے ساتھ سرفروشی کا فیصلہ:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

ہم جیسے بھی ہیں، بہر حال مسلمان ہیں، ہمارے مسائل عالمی طاقتیں حل نہیں کریں گی۔ ہمیں خود اپنے فیصلے کرنے ہیں، ہمیں خود اپنی تقدیر بنانی ہے۔ مسلمان ملکوں میں دن بدن ایمانی شعور کی بیداری مغربی ممالک اور امریکا کے لئے خطرہ بنتی جا رہی ہے جس کو ختم کرنے کے لئے دہشت گردی کا جال تقریباً اسلامی ممالک میں پھیلایا جا رہا ہے تاکہ دنیا میں مسلمانوں کو ایک دہشتگرد دکھا کر اس کے پردے میں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کی جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جمہوریت کے لبادے میں ایسے حکمرانوں کو مسلمانوں کے سروں پر بٹھا دیا ہے جو مسلمانوں کے اصلی دشمنوں کو اپنا دوست قرار دیتے ہوئے ان کی دوستی کو اپنے اقتدار کی بقاء سمجھتے ہیں۔ کبھی درپردہ بیک ڈور ڈپلومیسی کا جال پھینکا جاتا ہے اور کبھی مسلمانوں کے حقیقی رہنماؤں کو منظر سے ہٹانے کی مکروہ کوششیں جاری ہیں۔ کشمیریوں نے ایمانی جذبے سے سرشار سید علی گیلانی کی قیادت پر جس یقین محکم اور عزم کا اظہار کیا ہے اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ وہ اپنی دھرتی کے میر جعفر اور میر صادق کو پہچان چکے ہیں۔ ابتداء ہو گئی ہے، فرائض تو سب کو ادا کرنے ہیں لیکن ہم اہل پاکستان پر خصوصی ذمہ داری ہے۔ ہم کو آج کی ذمہ داری بھی پوری کرنی ہے اور اب تک کی کوتاہیوں کا کفارہ بھی ادا کرنا ہے۔ پاکستان کا قیام اور استحکام ایک معاشرتی معجزہ ہے اور کشمیر کا پاکستان سے الحاق اسی معجزے کا تسلسل ہو گا۔

رہے نام میرے رب کا جو انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے اور کامیابی بالآخر انصاف کرنے والوں کا ہی مقدر ہے!

بروز ہفتہ ۹ محرم ۱۴۳۱ھ ۲۶ دسمبر ۲۰۰۹ء

ہم ذلیل و رسوا کیوں؟

ایک ہاتھ سے ٹوپی سنبھالے بھاگتا ہوا آدمی سامنے شیڈ میں کھڑی چمکدار کار کے ڈرائیور کے کان میں سرگوشی کرتا ہے تو فوراً باہر کے ماحول میں ایک حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ چمکدار گاڑی جو کچھ دیر پہلے ایک شیڈ کی چھاؤں میں دفتر کے سامنے کھڑی تھی، جس پر وقفے وقفے سے ڈرائیور اس کی دیکھ بھال کرتے ہوئے گرد صاف کر رہا تھا، مکھی تک کو بیٹھنے نہیں دیتا تھا، وہ فوراً گاڑی چوکس حالت میں ممکن حد تک دفتر کے دروازے کے قریب لا کر کھڑی کر دیتا ہے اور ڈرائیور باہر نکل کر مودب دفتر کی طرف منہ کر کے کھڑا صاحب کا انتظار کرتا ہے۔ اتنے میں بڑے دفتر کا دروازہ کھلتا ہے۔ چپراسی بریف کیس اور صبح کی اخباریں ہاتھ میں لئے باہر آتا ہے اور دوسرا آدمی ہاتھ میں کچھ فائلیں لئے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ کا دروازہ کھول کر نہائت سلیقے سے پہلے فائلیں اور اس کے ساتھ بریف کیس کے اوپر اخباریں رکھ دیں جاتی ہیں۔ پھر ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ کو زور لگا کر ممکن حد تک آگے کر دیا جاتا ہے تاکہ پچھلی سیٹ کے سامنے کافی جگہ آرام سے ٹانگیں پھیلانے کے لئے میسر آجائے۔ گرمی کا موسم ہو تو ائر کنڈیشن صاحب کے دفتر سے نکلنے سے بیس منٹ پہلے چلا دیا جاتا ہے۔

صاحب بہادر ایک شانِ بے نیازی سے برآمد ہوتے ہیں، ارد گرد موجود لوگ ایک دم ساکت و جامد ہو جاتے ہیں، گفتگو کرنے والا بات کرنا بھول جاتا ہے، بے ترتیب یونیفارم والا ٹوپی سیدھی کر لیتا ہے اور سگریٹ پیتا ہوا شخص سگریٹ پھینک دیتا ہے یا کہیں چھپا دیتا ہے۔ پچھلا دروازہ جو ڈرائیور سے دوسری سمت والا ہے اسے کھول کر سر جھکائے کوئی شخص کھڑا ہوتا ہے۔ صاحب بہادر تشریف رکھتے ہیں۔ اشاروں کا منتظر گاڑی کو خراماں نکالتا ہوا منظر سے غائب کر دیتا ہے۔ پورا راستہ صاحب بہادر یا تو اخباروں کی ورق گردانی کرتے ہیں یا پھر اگر کوئی فائل ضروری محسوس ہو تو اسے دیکھا جاتا ہے۔ وہ حتی الامکان کھانسنے سے بالکل پرہیز کرتا ہے اور اگر ایسا ہو جائے تو کھانسنے کی تکلیف سے فارغ ہوتے ہوئے اپنی اس حرکت پر بڑا نادم اور شرمسار دکھائی دیتا ہے۔

اس پورے سفر میں ڈرائیور کی حیثیت ایک کل پرزے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یوں لگتا ہے کہ کہ کمپنی نے سٹیئرنگ، گیئر یا سیٹ کی طرح اسے بھی فکس کر دیا ہے جسے صرف احکامات سننے اور اس پر عمل کرنا ہے۔ وہاں روک دو، ادھر لے چلو، میرا یہاں انتظار کرو، میں واپس آرہا ہوں، مجھے یہاں تین گھنٹے لگ جائیں گے اور ڈرائیور روبوٹ کی طرح سر ہلا کر یا پھر منہ سے سعادت مندی کے الفاظ نکالتا رہتا ہے۔ یہ منظر آپ کو ہر اس دفتر یا ادارے کے باہر ملے گا جہاں کوئی صاحبِ اختیار تشریف رکھتا ہے۔ کسی سرکاری یا غیر سرکاری کا کوئی امتیاز نہیں۔ وزیر کا دفتر یا سیکرٹری کا، جرنیل کا ہیڈ کوارٹر یا عدلیہ کی عمارات، کسی پرائیویٹ کمپنی کے دفاتر ہوں یا بینک کی شاندار عمارت، سب جگہ صاحبانِ طاقت اور والیانِ حیثیت کے لئے ایک ہی سیٹ مخصوص ہے۔ ان کی گاڑی کہیں پہنچے، لوگ وہی دروازہ کھولنے کے لئے لپکتے ہیں۔

پاکستان میں جب میں یہ سارے مناظر دیکھتا ہوں تو اکثر میرے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ سب لوگ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر کیوں نہیں بیٹھتے۔ کیا وہ آرام دہ نہیں، کیا وہاں ائر کنڈیشن کی ہوا صحیح طور پر نہیں پڑتی، کیا وہاں سے راستہ، ارد گرد کی عمارتیں یا لوگ ٹھیک طرح سے نظر نہیں

آتے ؟؟؟ لیکن ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ملتا ہے۔ یہ سامنے والی سیٹ زیادہ آرام دہ بھی ہے اور ائر کنڈیشن کی ہوا بھی اگلی سیٹ پر زیادہ لطف دیتی ہے، باہر کا منظر بھی صحیح طور پر نظر آتا ہے تو پھر اگلی سیٹ خالی کیوں رہتی ہے یا پھر اس میں سٹاف آفیسر یا پی اے کیوں بٹھایا جاتا ہے ؟

دراصل یہ کہانی اس نفرت اور یہ داستاں اس تکبر کی ہے جس میں ڈرائیور کی حیثیت ایک انسان سے کم ہو کر بادشاہوں کے رتھ اور مہاراجوں کی بڑی بڑی سواریاں چلانے والوں کی ہوا کرتی تھیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک اعلیٰ مرتبہ اور مقام رکھنے والی شخصیت ڈرائیور کے برابر آ کر بیٹھ جائے اور دیکھنے والے ان دونوں میں تمیز تک نہ کر سکیں کہ کون افسر ہے اور کون معمولی حیثیت کا ڈرائیور۔ ایک زمانہ ان متکبر افسران اور وزرائ، جرنیل اور اعلیٰ عہدیداروں پر ایسا آیا کہ ان کو چھوٹی سوزوکی پر سفر کرنا پڑا جس کی پچھلی سیٹ انتہائی بے آرام اور کم جگہ والی تھی لیکن تکبر اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ اگلی سیٹوں کو مکمل طور پر فولڈ کیا جانے لگا اور آقا و مالک کی تمیز کو برقرار رکھنے کے نئے نئے طریقے دریافت کئے گئے۔

یہ رویہ ان ساری قوموں پر گزرا ہے جنہوں نے انسانوں کو غلام اور محکوم بنانے کے ڈھنگ ایجاد کئے تھے۔ امریکا میں جم کرو کے قوانین کے تحت بسوں میں کالوں کی سیٹیں گوروں کی سیٹوں سے علیحدہ یعنی پچھلی طرف ہوتیں اور اگر کوئی کالا اگلی سیٹ پر بیٹھ جاتا تو اسے گولی مار دی جاتی اور اگر کوئی گورا پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کی جسارت کرتا تو لوگ اسے طعنے مار مار کر مار دیتے۔ لندن شہر میں آج بھی کالے رنگ کی ٹیکسیوں کا رواج ہے جس میں ڈرائیور کی سیٹ اور سواریوں کے درمیان شیشے کی دیوار فکس ہے جس کی کھڑکی صرف مسافر کھول سکتا ہے تاکہ ڈرائیور کی حیثیت، مرتبہ اور اس سے بات کرنے کا تعین بھی وہی کرے جو پچھلی سیٹ پر براجمان ہے۔ صدیوں تک فرعونوں، شہنشاہوں، آمروں، ڈکٹیٹروں اور ان کے چھوٹے چھوٹے کارپردازوں کی سواریاں بھی ایسی تھیں کہ ان کا عام لوگوں سے کوئی تعلق نہ رہے۔ دھول اڑاتی یہ سواریاں جہاں عوام الناس کا مذاق اڑاتی تھیں وہاں ان سواریوں پر سفر کرنے والے بھی انسانوں کے درمیان تمیز، فرق اور آقا اور غلام کے قانون میں بٹے ہوئے تھے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی ایک مناظر ایسے بھی یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں جس کو دیکھتی آنکھیں اپنے اندر صدیوں محفوظ کر لیتی ہیں۔ چند سال پہلے پاکستان کے فور اسٹار جنرل میرے ساتھ گاڑی میں جا رہے تھے کہ اچانک ٹریفک سگنل پر گاڑی کھڑی کی تو ساتھ والی لین میں برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیر بھی اشارہ کھلنے کے منتظر تھے۔ میں نے فوری طور پر اپنے مہمان کو ساتھ والی لین کی طرف دیکھنے کی دعوت دی اور کہا'' کیا آپ جانتے ہیں کہ اس گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص اس ملک کا وزیرِ اعظم ہے''، میں نے ٹونی بلیر کی طرف دیکھ کر جونہی ہاتھ ہلایا تو اس کے جواب میں اس نے کئی مرتبہ ہاتھ ہلاتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور اسی اثناء میں ٹریفک سگنل کھل گیا اور ہم دونوں اپنی اپنی راہ پر چل دیئے۔ بس آجکل ایک فرق آیا ہے کہ کبھی کبھی گاڑی کے ساتھ ایک پولیس آفیسر موٹر سائیکل پر جا رہا ہوتا ہے۔ میرے مہمان نے باقی سارا سفر نہائت خاموشی میں گزارا، پتہ نہیں اس خاموشی میں کوئی ندامت تھی یا میرے سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

ہمارے ہاں صدر اور وزیر اعظم اول تو عوام سے کوسوں دور ہیں لیکن اگر کبھی نکلنا پڑے تو سینکڑوں گاڑیوں کے سائرن بجاتے ہوئے قافلے کے جلو میں نکلتے ہیں، سنا ہے اعلیٰ عدلیہ کے چیف جسٹس بھی بیس گاڑیوں کے سکواڈ میں آتے جاتے ہیں، ملک کے وزیرِ داخلہ جن کے ذمے اس ملک کے شہریوں کی سلامتی کی ذمہ داری ہے وہ اس وقت کہیں نہیں جاتے جب تک ایک بھاری سیکورٹی گارڈ ان کو چاروں طرف سیکورٹی فراہم نہیں کرتے۔ اب تو معمولی وزراء بھی سیکورٹی اور سائرن والی گاڑیوں کے بغیر سفر نہیں کرتے۔

تکبر، غرور اور گھنٹوں ساتھ چلنے، آرام پہنچانے والے شخص سے کراہت اور دوری کے اس ماحول میں پتہ نہیں کیوں مجھے اپنا ماضی یاد آجاتا ہے اور اسلاف کے وہ معیار آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ روم کے بادشاہوں کی طرح رہن سہن اور لباس پہننے والوں عیسائیوں کے بیت المقدس پر جب پھٹے پرانے کپڑے پہننے والے مسلمانوں نے فتح حاصل کی تو شہر حوالے کرنے کے لئے خلیفہ وقت حضرت عمرؓ فاروق کا انتظار تھا۔ ایک گھوڑا جس کے سم گھس کر بیکار ہو چکے تھے، رک رک کر قدم رکھتا تھا، اس کے ساتھ خلیفہ وقت اور فاتح ایران و شام عمرؓ ابن خطاب اور غلام موجود۔ طے ہوا کہ آدھا راستہ غلام سواری کرے گا اور آدھا راستہ خلیفہ۔ بیت المقدس قریب آیا تو باری غلام کی آگئی اور پھر تاریخ نے انسانی احترام کا عجیب و غریب منظر دیکھا۔ غلام گھوڑے پر سوار اور خلیفہ وقت باگ تھامے بیت المقدس میں داخل ہوئے۔ شاہی کروفر اور لباس پہنے رومی عیسائی صرف ایک فقرہ بول سکے "ایسا ہی شخص عزت کا مستحق ہے اور ایسے ہی شخص کو فتح نصیب ہوا کرتی ہے۔" اس تاریخی فقرے کے بعد بھی اگر کوئی مجھ سے سوال کرتا ہے کہ ہم دنیا میں ذلیل و رسوا کیوں ہیں، بے آبرو اور بے آسرا کیوں ہیں، تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوتی!

رہے نام میرے رب کا جس کے ہاتھ میں عزت و ذلت ہے!

یہ آرزو تھی کہ ہم اس کے ساتھ ساتھ چلیں
مگر وہ شخص تو رستہ بدلتا جاتا ہے
وہ بات کہہ، جسے دنیا بھی معتبر سمجھے
تجھے خبر ہے، زمانہ بدلتا جاتا ہے

بروز سوموار ۱۱ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۲۸ دسمبر ۲۰۰۹ء

میرا قصور

راجستھان میں جب کوئی بوڑھا' لاغر اور طویل العمر مہاراجہ مرتا تھا تو اس کی نعش پر بین کے لئے پیشہ ور خواتین بلائی جاتی تھیں اور ان خواتین کو ''رودالیاں'' کہا جاتا تھا۔ گجرات کاٹھیاواڑ کے بعض علاقوں میں یہ خواتین ابھی تک موجود ہیں' رونا دھونا اور بین ڈالنا ان کا پیشہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے پیشوں کی طرح یہ کاروبار بھی ''زوال'' کا شکار ہو چکا ہے لیکن جب یہ فن عروج پر تھا تو پورا پورا گاؤں اس پیشے سے وابستہ ہوتا تھا' یہ لوگ مرگ سے پہلے ہی مہاراج کی ڈیوڑھی میں پہنچ جاتے تھے۔ جونہی ''حکم'' کی جان قبض ہوتی تھی' رودالیاں اپنے بینوں سے آسمان سر پر اٹھا لیتی تھیں' فرطِ غم سے اپنے بال نوچتیں' اپنے سر میں خاک ڈالتیں' زمین پر لیٹتیں' سینہ کوبی کرتیں اور رو رو کر بے ہوش ہو جاتیں۔

رودالیاں کا یہ سارا کھیل ڈارمہ ہوتا تھا لیکن یہ اپنے فن میں اتنی ماہر ہوتی تھیں کہ ان کا بین اچھے اچھوں کا سینہ ہلا دیتا تھا۔ یہ پیشہ دراصل ان خاندانوں کے لئے تھا جو جائیداد کے بٹوارے کے لئے بڑی شدت سے مہاراج کے انتقال کا انتظار کرتے تھے' ان کے لئے مہاراج کی آخری سانسیں خوشخبری سے کم نہیں ہوتی تھیں لیکن رسماً رونا بھی ضروری ہوتا تھا۔ ایسے حالات میں جو ظاہر ہے مشکل کام ہوتا ہے' رودالیاں اپنے بینوں کے ذریعے انہیں اس مشکل سے باہر نکالتی تھیں اور بعض دیہات میں تو مہاراج اپنے جیتے جی اپنی میت کے لئے رودالیاں کا بندوبست کر جاتے تھے' انہیں معقول معاوضہ ''لاگ'' بھی دے جاتے تھے۔ راجستھان میں کچھ ایسے دیہات بھی تھے جن میں رودالیاں کے اپنے محلے ہوتے تھے تاکہ ناگہانی مرگ کی صورت میں انہیں دور سے نہ جانا پڑے۔

ہمارے پنجاب میں اس قسم کے حالات میں ''نینوں'' سے کام چلایا جاتا تھا' نائیوں کی بعض خواتین بین میں طاق ہوتی تھیں' ان خواتین کو ''سیاپے کی نین'' کہا جاتا تھا' یہ عورتیں اب بھی پنجاب کے کئی دیہاتوں میں مل جاتی ہیں۔ طالب علمی کے دور میں ایک دوست مجھے اپنے گاؤں لے گیا' وہاں مجھے زندگی میں پہلی بار سیاپے کی نین سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ایک بوڑھی عورت تھی' گریہ زاری سے اس کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں بن چکی تھیں۔ سردیوں کے دن تھے' نین دھوپ میں بیٹھی گنا چوس رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا ''جب تمہارا مرنے والے سے کوئی رشتہ یا کوئی تعلق نہیں ہوتا تو تم رو کیسے لیتی ہو؟'' وہ ہنسی' اس نے ''پھو'' کر کے گنے کا پھوک دور پھینکا اور آنکھیں مٹکا کر بولی ''تعلق'' مجھے تو بعض اوقات مرنے والے کا نام بھی معلوم نہیں ہوتا'' میں نے دوبارہ پوچھا ''پھر تم روتی کیسے ہو؟'' اس نے قہقہہ لگایا' گنا چارپائی کے ساتھ کھڑا کیا' سر سے دوپٹہ اتارا' بیٹھے بیٹھے کمر کے گرد لپیٹا اور بولی ''ایسے روتی ہوں۔

اور ساتھ ہی اس نے ایک لمبی کوک بھری' سینے پر دوہتھڑ مارا' اور بین شروع کر دیا۔ چند سیکنڈ میں اس کی آنکھوں میں ساون بھادوں سما گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے چہرے کی لکیروں سے پانی بہنے لگا' وہ مچھلی کی طرح تڑپتی اور تڑپ تڑپ کر بین کرتی تھی۔ اس کی آواز' اس کی تڑپ نے مجھے اندر سے ہلا دیا' مجھے ایسے محسوس ہوا کوئی بلیڈ سے میرے دل کو آہستہ آہستہ چھیل رہا ہے' میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہو گئی اور میرے متغیر

چہرے پر خوف اور پسینے کو دیکھ کر وہ یک لخت خاموش ہو گئی' دوپٹہ کھولا' آنسو پونچھے اور ہاتھ بڑھا کر گنا اٹھایا' اطمینان سے اس کو چوسنا شروع کر دیا۔ میرا خوف حیرانی میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے ''پھو'' کر کے گنے کی پھوگ پھینک کر بولی ''ایسے روتی ہوں' اب تو کوئی میت بھی نہیں تھی۔'' میں اس کے فن کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

میں نے رودالیاں نہیں دیکھیں' صرف ان کے بارے میں پڑھا ہے' نین بھی صرف ایک دیکھی تھی لہٰذا سیاپوں اور بینوں پر میرا علم واجبی سا ہے لیکن جب میں اپنے معاشرے کو دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے' ہم سب کسی نہ کسی حد تک ''نہیبیں میں' رودالیاں میں'' ہم سب دھوپ میں چارپائیاں بچھا کر بیٹھتے ہیں ' گنے چوستے ہیں' پھوکر کے پھوگ پھینکتے ہیں' گنا چارپائی کے ساتھ کھڑا کر کے کمر کے گرد کپڑا لپیٹتے ہیں اور پھر سیاپا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بچا ہوا گنا اٹھا کر دوبارہ چوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہماری عملیت صرف یہیں تک محدود ہے۔ آپ دیکھ لیجئے ہمارے ملک میں کیا کیا حادثے نہیں ہوئے' چار بار مارشل لاء لگا' چھ سات مرتبہ اسمبلیاں برخواست کر کے گھروں کو بھیج دیا گیا' پورا آئین ایل ایف او بن گیا' ملک دو حصے ہو گیا' ہماری سفارکاری نے ۱۸۰ زاویئے پر ٹرن لیا' ہم نے جنگ کو جہاد میں بدلا اور پھر جہاد کو دہشت گردی میں تبدیل کر دیا' لیکن ان انقابات' ان تبدیلیوں پر من حیث القوم ہمارا ردعمل کیا تھا' ایک چھوٹا سا بین' معمولی سا سیاپا اور بس!

پہلے ہماری سیاسی پارٹیاں ملک و قوم کے مسائل کو اجاگر کر کے ان کو حل کرنے کے وعدے پر حکومت میں آتے ہیں لیکن اب ہوتا یہ ہے کہ حکومت سنبھالتے ہی ملک و قوم کے مسائل حل کرنے کی بجائے ملک و قوم کو بلیک میل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کہیں سے آواز آتی ہے کہ مکمل صوبائی خود مختاری چاہئے جس کے تحت صوبے کے تمام وسائل پر ہمارا حق ہونا چاہئے' کہیں سے اب یہ آواز آنا شروع ہو گئی ہے کہ ملک کے صدر اور وزیراعظم کے لئے مسلمان ہونے کی شرط ختم ہونی چاہئے اور ہمیں لسانی بنیاد پر اپنے صوبے کو پختون خواہ کہہ کر پکارا جائے' ملک کے ایک کونے سے آواز آتی ہے کہ کراچی اور حیدرآباد میں ہمارے اختیارات کو چیلنج نہ کیا جائے' اور اگر ملک سے لوٹی ہوئی دولت اور بے گناہ لوگوں کو قتل اور بلوے کرنے والوں کے متعلق عدالت این آر او کو ختم کرنے کا اعلان کرتی ہے تو موجودہ حکومت وفاقی جماعت ہونے کے ناطے اس مکروہ قانون کی منسوخی کو اپنے خلاف ایک سازش قرار دیتے ہوئے سارے ملک میں انارکی جیسی صورتحال پیدا کر دیتی ہے۔

صدر زرداری جو کہ پورے وفاق کی علامت ہیں' ان کو فوری طور پر اپنا علاقائی لباس اس قدر عزیز ٹھہرتا ہے کہ ان کی جماعت کے وزراء نہ صرف سندھی ٹوپی اور اجرک کا دن مناتے ہیں بلکہ سندھ کارڈ کھیلنے کی دھمکی دیکر ساری قوم کو ایک شدید عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں اور اس بات کا بھی اعلان کرتے ہیں کہ اگر آصف زرداری ''پاکستان کھپے'' کا نعرہ نہ لگاتا تو ہم ''پاکستان نہ کھپے'' (خاکم بدہن) کا نعرہ لگانے میں کوئی شرم محسوس نہ کریں۔ پہلی مرتبہ قوم

اور ملک کو اپنے اداروں میں تصادم کی کیفیت نظر آ رہی ہے اور وہ بھی ان افراد کی طرف سے جو حکومت میں ہوتے ہوئے اپنی بد عنوانیوں کو چھپانے کے لئے کھلم کھلا عدالت عالیہ' میڈیا اور فوج کو موردِ الزام ٹھہرا کر مظلوم ہونے کی اداکاری کر رہی ہے۔

پاکستان کی دو دفعہ وزیر اعظم رہنے والی خاتون بے نظیر بھٹو جس کو پاکستان میں ایک گہری سازش کے تحت قتل کر دیا گیا ان کی دوسری برسی پر ان کے شوہر نامدار اور پاکستان کے صدرِ محترم جناب آصف زرداری تعزیتی اجتماع میں اپنی ۴۳ منٹ کی بہت ہی جذباتی تقریر میں ۷۶ مرتبہ قوم کو ''میرا قصور یہ ہے ''کہہ کر اپنی خوبیاں گنوا رہے تھے' اور پہلی مرتبہ قوم نے یہ محسوس کیا کہ جس سیاسی اور غیر ریاستی اداکار کا بار بار ذکر کیا گیا اس کی واضح شبیہ نظر آ رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ پنجاب کی کوئی ''نین یا گجرات کا ٹھیا واڑ کی کوئی ''رودالیاں'' ہمارے حالات کا سیاپا کرنے آن پہنچی ہیں۔ ملک میں غربت' مہنگائی' بے روزگاری کی بڑھتی ہوئی لہر نے قوم کو جیتے جی مار دیا ہے جس کا اس تقریر میں کوئی ذکر نہیں لیکن مخالفین کی آنکھیں نکال دینے کی دھمکیوں سے نجانے کس کو ڈرایا جا رہا تھا۔ کبھی ان کی جماعت کے لیڈران صحافیوں کے نام لیکر ان کے ہاتھ تور دینے کی دھمکیوں سے ان کو صحافتی ذمہ داریوں سے روک دینا چاہتے ہیں اور کہیں اسی سیاسی پارٹی کی ایک رہنما کا بیٹا ٹیلیفون پر ایس ایم ایس کر کے اس کے مرنے کی بد دعا کرتا ہے۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ باجماعت ''سیاپے'' کی مہم شروع کر دی گئی ہے لیکن بات پھر وہیں پر آ رکتی ہے' اس ظلم' اس زیادتی پر ہمارا رد عمل کیا ہے۔ ہم مکھی کی بھنبھناہٹ جتنا احتجاج کرتے ہیں اور پھر توقع کرتے ہیں کہ ہماری اس بھنبھناہٹ پر حکومت اپنی کارکردگی کو بہتر بناتے ہوئے ملک و قوم کو غربت' مہنگائی' بے روزگاری کی بڑھتے ہوئے عذاب سے نجات دلائے گی۔ آپ بس ہماری سادگی ملاحظہ کیجئے' یہ درست ہے کہ قوموں کی زندگیوں میں احتجاج' سیاپے اور بین بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں لیکن اس سے کہیں قیمتی وہ کوشش' وہ جدوجہد ہوتی ہے جو ظلم و زیادتی کے خلاف کی جاتی ہے' وہ مزاحمت ہوتی ہے جو ظالم کے ہاتھ روکتی ہے' جو ظلم کے فیصلے کرنے والے ہاتھوں کی گرفت توڑتی ہے' وہ رد عمل ہوتا ہے جو حکمرانوں کو بتاتا ہے تم لوگ زندہ انسانوں پر حکومت کر رہے ہو' مٹی کے ڈھیلوں اور ریت کے ٹیلوں پر نہیں' مگر افسوس ہم من حیث القوم رد عمل' مزاحمت اور جدوجہد کی بجائے بین' سیاپا' بھنبھناہٹ بنتے جا رہے ہیں' خود اپنا مذاق ہوتے جا رہے ہیں کہ ہر کوئی ہمیں بے وقوف بنا کر ہماری ہمدردیاں حاصل کر کے اپنے جرائم کو چھپانے کے لئے ہماری قوت کو استعمال کر سکے۔

کیا اب دوبارہ اٹھارہ کروڑ لوگوں کو مزید بے وقوف بنایا جا سکتا ہے' چاہے جتنا مرضی سیاپا کر لیں شائد ہرگز نہیں' اس لئے کہ اس میں ہمارا کیا ''قصور" ہے۔ قوم کا قصور صرف یہی ہے کہ وہ پرویز مشرف ٹولے سے محض اس لئے بھی نالاں تھی کہ اس نے پورے ملک کو امریکا کے حوالے کر دیا تھا اور وہ ہر قیمت پر اس ٹولے سے نجات کی خواہش مند تھی لیکن بے نظیر چونکہ خود بھی ڈیل کے تحت ملک میں واپس آئیں تھیں جس میں یہ طے تھا کہ پیپلز پارٹی آئندہ اقتدار سنبھالے گی لیکن مشرف اس حکومت کا بدستور صدر رہے گا۔ لیکن یہ کسی کو علم نہیں تھا کہ بے نظیر بڑی طاقتوں کے ساتھ جو معاہدہ کر کے ملک لوٹی تھیں وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو جائیں گی۔ غیر مصدقہ اطلاع یہی ہے کہ ان کو اس وعدہ خلافی کی پاداش میں راستے سے ہٹا دیا گیا لیکن معاہدہ کی رو سے اور بے نظیر کا قتل بالآخر پیپلز پارٹی کے اقتدار کا سبب بنا۔ اسی لئے زرداری صاحب نے برملا اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ پاکستان کی بقاء امریکا کی دوستی میں ہے۔ نہیں زرداری صاحب! پاکستان کی نہیں بلکہ آپ کے اقتدار کی بقاء امریکا کی دوستی میں ہے۔ اب نجانے قوم کو اپنے اس قصور کی کتنی اور

سزا بھگتنا ہو گی؟

کراچی میں جو سانحہ ہوا ہے اس پر دل خون کے آنسو رو رہا ہے کہ کس درندگی سے لوگوں کو مار دیا گیا اور اس کے بعد ایک خاص سازش کے تحت جن املاک کو نذرِ آتش کر دیا گیا اس کے پیچھے بھی ایک خاص کہانی ہے۔ اس کی تفصیلات انشاءاللہ کسی اور کالم میں!

رہے نام میرے رب کا جو دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے!

بروز منگل ۱۲ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۲۹ دسمبر ۲۰۰۹ء

خلافِ مصلحت

میڈم مروے کا تعلق فضیلت پارٹی سے تھا' وہ ۱۸/اپریل ۱۹۹۹ء کے الیکشن میں ترک پارلیمنٹ کی رکن منتخب ہوئی' مئی میں حلفِ وفاداری کا موقع آیا تو مروے سر پر سکارف اوڑھ کر پارلیمنٹ میں چلی گئیں۔ یہ جدید ترکی کی ۷۶ سالہ تاریخ کا حیران کن واقعہ تھا کیونکہ جب ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۳ء کو ترکی آزاد ہوا تھا تو کمال اتاترک نے عربی رسم الخط' دینی تعلیم اور اذان کے ساتھ ساتھ سر ڈھانپنے اور حجاب لینے پر بھی پابندی عائد لگادی تھی۔ کمال اتاترک کا کہنا تھا کہ اگر ہم ترکی کو ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں اس کو سیکولر ثابت کرنا ہوگا۔ اس وقت سے ترکی میں عورت کا ننگا سر اور سیکولرازم ایک ہو چکے ہیں لیکن مئی ۱۹۹۹ء میں مروے نے سکارف کے ساتھ پارلیمنٹ میں داخل ہو کر سیکولرازم کے ترک فلسفے کو چیلنج کر دیا۔ مروے کی اس حرکت پر پارلیمنٹ میں زلزلہ آگیا۔ سیکولر ارکان نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ ترکی میں سیکولرازم کی ضامن فوج نے بھی مروے کی جسارت کا سختی سے نوٹس لیا۔ لہٰذا صدر سلیمان ڈیمرل نے مروے کی رکنیت اور شہریت دونوں منسوخ کر دیں۔ یہ ایک سیکولر اسٹیٹ کا ایک ایسے آزاد شہری سے انتقام تھا جو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا چاہتا تھا۔

۲۹/اکتوبر ۲۰۰۳ء کو یہ صورتحال ایک بار پھر زیادہ شدت کے ساتھ سامنے آئی۔ اس دن ترک قوم نے اپنا ۸۰واں یومِ آزادی منایا۔ قومی دن کی روایات کے مطابق صدر' ارکان پارلیمنٹ اور حکومتی عہدیداروں کے اعزاز میں ایک دعوت کرتا ہے' جس میں ارکان کی بیگمات بھی شریک ہوتی ہیں لیکن اس بار کیونکہ ترکی میں طیب اردگان کی سربراہی میں ایک اسلامی جماعت جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کی حکومت تھی اور اس پارٹی کے زیادہ تر عہدیداروں کی بیگمات سروں پر سکارف پہنتی تھی' لہٰذا صدر کے لئے ان تمام حضرات کو دعوت دینا مسئلہ بن گیا۔ صدر نے طویل غور وخوض کے بعد اس مسئلے کا یہ حل نکالا کہ انہوں نے حکومت' پارلیمنٹ کے ارکان اور حکومتی پارٹی کے چیدہ چیدہ ارکان سے درخواست کی ''آپ تقریب میں بیگمات کو ساتھ نہ لائیں'' صدر کے اس فارمولے کی زد میں وزیراعظم طیب اردگان بھی آگئے کیونکہ ترکی کی خاتونِ اوّل بھی سر پر سکارف لیتی تھی' اس اقدام پر جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی نے صدارتی تقریب کا بائیکاٹ کیا اور صدر احمد نجات سیزر سے استعفٰی کا مطالبہ کر دیا۔

ترکی کے صدر احمد نجات سیزر کے اس فارمولے نے دنیا بھر کے دانشوروں' فلاسفروں اور تجزیہ نگاروں کو ایک بار پھر سوچنے پر مجبور کر دیا'' کیا سیکولرازم اور سکارف' ماڈرن ازم اور حجاب ایک دوسرے کے دشمن ہیں' کیا ترقی اور پردہ ایک دوسرے سے مزاحم ہیں' کیا سروں پر دوپٹے اور چہروں پر حجاب کرنے والی خواتین اور ان سے متعلقہ اقوام دنیا کو تشدد' بنیاد پرستی' جہالت اور پسماندگی کا تاثر دیتی ہیں اور کیا جن ملکوں میں سکارف اوڑھے جاتے ہیں' وہ ملک' وہ قومیں کبھی سیکولر نہیں ہو سکتیں؟؟؟ اس نقطے پر پہنچ کر جب دنیا بھر کے دانشور اور فلاسفر غور کرتے ہیں تو انہیں مسلمانوں کی کوتاہ فہمی اور احساسِ کمتری پر حیرت ہوتی ہے' کیونکہ سکارف اور حجاب سے سیکولرازم' وسعتِ فکر اور روشن خیالی کو ذرہ برابر خطرہ نہیں۔

اس وقت پورے یورپ میں چھوٹے بڑے سات لاکھ چرچ اور مذہبی اسکول ہیں' امریکا کے اندر ایک لاکھ ۵۳ ہزار چرچ ہیں' ان میں آٹھ لاکھ ۵۳ ہزار

چرچوں میں ۲۷ لاکھ ننیں سسٹر اور مدر" ہیں اور یہ تمام ننیں سروں پر سکارف لیتی اور برقعہ نما ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہنتی ہیں۔ اگر ان گاؤنوں اور سکارفوں کے باوجود وہاں ترقی ہوئی' یورپ اور امریکا سیکولر کہلائے تو مسلم دنیا کیوں ترقی نہیں کر سکتی' اور مزید یورپ' امریکا اور مشرقِ بعید میں کسی نن کے سکارف پر آج تک کسی نے اعتراض نہیں کیا' کسی نے ان کے سر ننگے کرنے کا مطالبہ نہیں کیا' لوگ یہ مطالبہ اور اعتراض کریں بھی کیوں؟ جب یورپ' امریکا اور مشرقِ بعید کی تمام ریاستوں میں شہری آزاد ہیں' وہ چاہیں تو گلیوں میں برہنہ پھرنا شروع کر دیں' اگر قانون ان کی اس "آزادی" کو پورا تحفظ فراہم کرتا ہے تو پھر وہاں چرچ اور چرچ میں پروان چڑھنے والی ننوں کو بھی سر ڈھانپنے اور ستر پوشی کا پورا حق ہے اور کوئی شخص ان کے اس حق پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔

لیکن اس حقیقت کے باوجود مسلم دنیا کا احساسِ کمتری بھی ملاحظہ کیجئے' دنیا بھر کے تمام متشدد اور بے لچک یہودی ناف تک داڑھی رکھتے ہیں' ہمہ وقت کالا کوٹ اور سر کے درمیان چھوٹی سی ٹوپی اوڑھے پھرتے ہیں لیکن دنیا کو ان کی داڑھی نظر آتی ہے اور نہ ہی ان کے عیارانہ متشدد نظریات' صہیونیت کا تو مطلب ہی فلسطین پر جبری قبضہ' ایک مضبوط یہودی ریاست کی تشکیل اور مسلمانوں کی تباہی اور بربادی ہے لیکن دنیا کے کسی کونے سے صہیونیت کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھتی اور نہ ہی کوئی احتجاج ہوتا ہے اور نہ ہی کہیں کوئی اعتراض ہوتا ہے۔ بھارتی بنئے کے سب سے بڑے لیڈر گاندھی جی جن کے بت آج بھی بھارت کے طول و عرض میں بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ نصب ہیں اور دنیا کے تمام ملکوں کے سربراہ اپنے بھارتی سرکاری دورہ کا آغاز گاندھی جی کی سمادھی پر پھول چڑھانے سے ہوتا ہے۔ انہوں نے ساری عمر دھوتی پہنی اور اسی لباس میں اپنے وقت کے تمام غیر ملکی لیڈروں سے بھی ملتے رہے' ان کی خواتین لیڈر بھی ساڑھی میں اپنے سر کو ڈھانپتی ہیں' ان کے لباس پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی۔

لیکن اس کے مقابلے میں سکارف اور داڑھی پر جتنا شرمندہ مسلمان ہے اتنی شرمندگی طوطے کو اپنے سبز رنگ پر اور مور کو اپنے بھدے پیروں پر نہیں ہوتی۔ المیہ دیکھئے یہودی غزہ کی پٹی اور اردن کے مغربی کنارے پر سینکڑوں مسلمانوں کو ٹینکوں تلے روندیں' بھارت مقبوضہ کشمیر کے ایک لاکھ سے زائد بے گناہ اور معصوم مسلمانوں کو قتل کر دے' اور دوسری اقلیتوں کو دن دیہاڑے قتل کر دے' مساجد اور عیسائی چرچوں اور راہبوں کو زندہ جلا دے' تو مسلم ممالک سمیت دنیا کا کوئی ملک انہیں دہشت گرد نہیں کہتا لیکن ۱۶ اسلامی ممالک اپنے مدارس' اپنے مجاہدوں' اپنے جبوں' اپنی داڑھیوں اور اپنے حجابوں پر اپنے گھر میں شرمندہ بیٹھے ہیں' وہ اپنے شہداء کو دہشت گرد کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں' وہ سکارف لینے والی خاتون کی پارلیمنٹ کی رکنیت اور شہریت منسوخ کر دیتے ہیں' انہیں صدارتی تقریب سے خارج کر دیتے ہیں۔

یہ عجیب بات نہیں ایک سکارف برطانیہ جرمنی اٹلی فرانس یونان اور آسٹریا کی خاتون لیتی ہے تو پورا یورپ اس کو جھک کر سسٹر یا مدر کہتا ہے لیکن وہی سکارف ترکی انڈونیشیا ملائیشیا سعودی عرب اور پاکستان کی عورت سر پر رکھ لیتی ہے تو اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے' اسے جاہل گنوار غیر ترقی یافتہ اور بنیاد پرست کہا جاتا ہے۔ یہ یقیناً عجیب بات ہے لیکن اس سے بھی بڑی عجیب بات مسلم ممالک کا رویہ ہے۔ ۶۱ مسلم ممالک میں خود داڑھی اور پردے کو

خلافِ مصلحت قرار دے رہے ہیں' یہ خود اسلامی احکامات کو دہشت گردی اور شدت پسندی کہہ رہے ہیں۔افسوس آج اسلام جتنا بے بس اسلامی ممالک میں ہے اتنا بے بس' اتنا مجبور' سیکولر ممالک میں نہیں' بے دین اور غیر ممالک میں نہیں۔

یورپ کے کئی ممالک اور امریکا میں یومِ عاشورہ نہائت امن کے ساتھ گزر گیا لیکن یومِ عاشورہ کے موقع پر کراچی میں ایسی خون کی ہولی کھیلی گئی کہ دل کانپ اٹھا ہے۔ باخبر ذرائع کے مطابق یہ کمال انہی باکمال لوگوں نے سرانجام دیا ہے جو اس سے پہلے ایسے ہولناک کارنامے عراق میں سرانجام دے چکے ہیں۔انہوں نے بم دھماکے کی آڑ میں پاکستان کی نہ صرف معیشت پر حملہ کیا بلکہ فرقہ وارانہ جنگ کرانے کی بھی مکروہ کوشش کی۔ہم سب جانتے ہیں کہ پچھلے کئی ماہ سے ایم کیو ایم کی صوبائی حکومت پیپلز پارٹی کے ساتھ اختیارات کی جنگ چل رہی ہے لیکن ان تعلقات کی خرابی میں یوٹرن اس وقت آیا جب ایم کیو ایم نے این آر او پر حکومت کی حمائت سے معذوری کا عندیہ دیتے ہوئے زرداری صاحب کو صدارتی منصب کی قربانی کا مشورہ دیا جس کی وجہ سے پارلیمنٹ میں این آر او کو دوام نہ مل سکا۔اعلیٰ عدلیہ کی جانب سے این آر او کو منسوخ کرنے کے بعد اب اقتدار کا سنگھاسن ڈول رہا ہے اور پیپلز پارٹی اس سارے معاملے کا ذمہ دار ایم کیو ایم کو سمجھتی ہے۔

امریکی مکتی باہنی (بلیک واٹر) جس کو بھارت' اسرائیل اور سی آئی اے کی مکمل پشت پناہی میسر ہے' جو پاکستان کو ہر طرح سے مفلوج کرنے میں سرگرم ہے' نے پاکستان کی معیشت اور مختلف مذہبی یکجہتی پر ایک بھرپور وار کیا جس میں اس نے ہمارے ہی ملک کے کچھ لوگوں کو استعمال کیا ہے۔یہ کس طرح ممکن ہے کہ خودکش بم دھماکے کے فوری بعد کراچی کی سب سے مصروف اور دوسرے مذہبی فرقے کی املاک بولٹن مارکیٹ کی ایک ہزار سے زائد دوکانوں کو آگ لگادی جائے اور پولیس کھڑی تماشہ دیکھتی رہے' جب کہ شہر کے تمام سی سی ٹی وی کیمروں کا انتظام شہری حکومت (ایم کیو ایم) کے پاس تھا۔حساس اداروں نے بروقت کاروائی کر کے شہری حکومت کی طرف سے فوٹیج ضائع کرنے کی کوشش ناکام بناتے ہوئے سارا ریکارڈ بھی اپنے قبضے میں لے لیا ہے جس کے لئے شہری حکومت کے کچھ کارندوں نے مزاحمت بھی کی۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر شہری حکومت یعنی ایم کیو ایم اس سازش میں شریک نہیں تو پھر اس فوٹیج کا ضائع کرنے کا حکم کس نے دیا تھا؟اس فوٹیج کو ایڈٹ کر کے کیوں جاری کیا گیا؟

بتایا یہ جاتا ہے کہ کچھ افراد ایک خاص قسم کا سبز رنگ کا مواد اپنے ساتھ لائے' اس کو چھڑک کر آگ لگادی گئی اور بعض تنگ گلیوں میں ایک خاص قسم کے ہتھیار سے اسی خاص قسم کے مواد کی گولیوں چلا کر کئی عمارتوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔یاد رہے کہ بلیک واٹر اس سے پہلے عراق میں بھی ایسی سفاکانہ کاروائیاں کر چکا ہے۔فوری اطلاعات کے مطابق ساٹھ ارب روپے کی پراپرٹی اور اس میں موجود سامان کو خاکستر کر دیا گیا۔

میری پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ سے درخواست ہے کہ بلیک واٹر کو ملک سے نکالنے کے لئے فوری طور پر ''سوموٹو'' نوٹس لے' اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے اور ان محرکات کی بھی تحقیق کی جائے جس کی بناء پر عدلیہ کے احکام کی تعمیل میں لیت و لعل سے کام لیا جا رہا ہے۔سنا ہے کہ اعلیٰ عدلیہ کا این آر او سے استفادہ اٹھانے والوں کے مقدمات کی نگرانی کے لئے چاروں صوبوں کی ہائیکورٹس کے چیف جسٹس صاحبان کی تقرری ہمارے حکمرانوں کو بڑی گراں گزری ہے جس کی وجہ سے عدلیہ' فوج اور میڈیا کے ساتھ محاذ آرائی شروع ہو چکی ہے۔اب دیکھتے ہیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

رہے نام میرے رب کا جو الحی القیوم ہے!

یہ سوزِ دروں، یہ اشکِ رواں، یہ کاوشِ ہستی کیا کہیے
مرتے ہیں کچھ دن جی لیں ہم، جیتے ہیں کہ آخر مرنا ہے
رستوں پہ اندھیرے پھیل گئے، اک منزلِ غم تک شام ہوئی
اے ہم سفرو کیا فیصلہ ہے، اب چلنا ہے کہ ٹھہرنا ہے؟

بروز جمعرات ۱۴ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۳۱ دسمبر ۲۰۰۹ء

ایک مضبوط پاکستان

حکیم الامت علامہ اقبالؒ مرحوم و مغفور کی مشہور نظم ''محراب گل افغان کے افکار'' کی یہ دعا موجودہ حکومت کے پالیسی سازوں اور بعض دانشوروں کی خواہشات اور کوششوں پر بھی صادق آتی ہے جن کی رو سے وہ بھارت کے ساتھ دوستی اور قریبی ہمسایوں جیسے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی آرزو لئے بیٹھے ہیں۔ان سب کے جواب میں بھارت کی طرف سے آج تک جس سرد مہری بلکہ توہین آمیز رویہ کا اظہار کیا گیا ہے اس کے پیشِ نظر نرم سے نرم الفاظ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ یعنی اپنی ''آرزو'' ہی بدل دے اور کوئی دوسرا راستہ اختیار کرلے!

بھارت کے ساتھ دوستی اور ہمسائیگی کے اچھے تعلقات قائم کرنے کا کوئی پاکستانی مخالف نہیں بلکہ خواہشمند ہے' کوئی پاکستانی بھارت کے ساتھ جنگ نہیں چاہتا۔ پاکستان کے عوام نے ۱۹۴۷ء میں رسوائے زمانہ ریڈ کلف ایوارڈ کا چرکہ برداشت کرلیا۔انہوں نے ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو دولخت کرنے اور مشرقی پاکستان پر بھارتی فوجی یلغار کی جارحیت کا صدمہ بھی اپنے دل میں دفن کرلیا لیکن اب پوری ریاست جموں و کشمیر کو ہڑپ کرنے اور اس کے ساتھ ہی وہاں سے آنے والے تینوں دریاوں چناب' جہلم اور نیلم (کشن گنگا) کے پاکستان کی طرف آنے والے پانیوں کو روک کر پاکستان کو زرعی اور معاشی طور پر مفلوج کرنے کے بھارتی عزائم' مذموم ارادے ہماری غیرت کے لئے ایک کھلا چیلنج ہیں۔

بھارت کے اس دلخراش بلکہ اشتعال انگیز رویہ کے جواب میں ایک فوری رد عمل یہ ہو سکتا ہے کہ اب بھارت کے ساتھ مذاکرات کے کھیل کو خیر باد کہہ دیا جائے لیکن بوجوہ شائد اس حکومت کے لئے یہ ممکن نہ ہو۔ پاکستان بھارت کے ساتھ تمام متنازعہ امور پر امن طور پر مذاکرات اور بات چیت کے ذریعے طے کرنے کا اقرار بھی کر چکا ہے۔ زمینی حقائق اور معروضی حالات کے پیشِ نظر بھارت کے ساتھ مذاکرات کے لئے مندرجہ ذیل تجاویز پر غور کیا جاسکتا ہے۔

ا۔ بھارت سب سے پہلے ریاست جموں و کشمیر کو ایک متنازعہ علاقہ تسلیم کرے اور اس کا باقاعدہ بین الاقوامی طور پر اعلان و اقرار کرے۔ اگر بھارت ایسا نہیں کرتا تو اس کے ساتھ کشمیر کے مسئلہ اور اس سے ذیلی امور پر پر قطعاً کوئی بات چیت نہ کی جائے' ان ذیلی امور میں سیاچین اور وولر بیراج کی تعمیر شامل ہے۔

۲۔ پاکستان اپنے اصولی موقف پر ثابت قدم ہے کہ ریاست جموں و کشمیر کا فیصلہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کے عین مطابق کیا جائے' جن میں یہ ضمانت دی گئی ہے کہ یہاں کے باشندے اقوام متحدہ کی نگرانی میں رائے شماری کے ذریعے اپنے مستقبل کا فیصلہ کریں گے کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں۔ان میں اور کسی تیسرے آپشن کی گنجائش نہیں ہے۔

۳۔ پاکستان اپنی طرف سے کسی دوسرے آپشن یا ''لچک'' کی مہم اور بے معنی تجاویز پیش نہ کرے' اور اس سے پہلے ایک فوجی ڈکٹیٹر مشرف نے جو تجاویز دی تھیں ان سے فوری لاتعلقی کا اظہار کیا جائے۔

۴۔پاکستان بھارتی مقبوضہ کشمیر سے پاکستان آنے والے تینوں دریاوں چناب، جہلم اور نیلم (کشن گنگا) پر بھارتی منصوبوں کا مسئلہ اقوام متحدہ اور سارک کانفرنس، عالمی بینک اور عالمی عدالت انصاف کے سامنے ان دریاوں کے پانی پر اپنا بین الاقوامی معاہدہ کے تحت اپنا حق تسلیم کروانے کی آخری کوشش کرے اور اس بات کی بھی وضاحت کردے کہ یہ ملکی سلامتی کا ایک اہم اور سنگین مسئلہ ہے اور اس مسئلے کی ناکامی پر دنیا کے امن کو تباہ کرنے کی ذمہ داری بھارت پر ہو گی۔

۵۔بلوچستان اور پاکستان کے دوسرے علاقوں میں بھارت کی طرف سے دہشت گردی کے ثبوت عالمی طاقتوں کے سامنے رکھے جائیں اور ان طاقتوں کو صاف اور کھلے الفاظ میں بتادیا جائے کہ امریکا اور دوسری مغربی طاقتوں کی دوغلی پالیسی کو مزید برداشت نہیں کیا جائے گا۔امریکا اور اس کے اتحادی اگر اس معاملے میں اپنے کردار سے فرار یا اس معاملے میں تاخیر کرتے ہیں تو ایک مقررہ تاریخ کی ڈیڈ لائن دیکر اس علاقے سے نام نہاد ''وار آن ٹیرر'' سے علیحدگی اختیار کرلی جائے۔

۶۔بیک ڈور پالیسی جیسی فضول اور بے فائدہ مشق کا خاتمہ ہونا چاہئے، اس کے لئے کشمیر کی حقیقی قیادت سے رابطہ کرکے ان کو اعتماد میں لیا جائے۔وہ تمام کوششیں بیکار ثابت ہونگی جس میں کشمیر کی حقیقی قیادت شامل نہیں ہو گی۔خفیہ طور پر کشمیر کے ان افراد سے ملاقاتوں کا سلسلہ فوری بند ہونا چاہئے جس کو کشمیریوں نے مسترد کردیا ہے۔اس طرح وہاں کے باشندوں کے دلوں میں بدگمانی نہ پیدا کی جائے۔

آج سے کچھ سال پہلے پاکستان میں منحوس سایوں تلے ۸۲ دسمبر کی یخ بستہ شام کو مسئلہ کشمیر کے ساتھ جو کچھ بیتی، اس سے یہ مسئلہ استعارہ کی زبان میں نہیں بلکہ لٹریری طور پر سرد خانے میں چلا گیا تھا۔ چشمِ فلک نے یہ بھی دیکھا کہ پاکستان ہی کی سرزمین پر بھارت کے اس وقت کے سیکرٹری خارجہ سری شیام سرن کا یہ اعلان یا ناپاک جسارت کہ پوری ریاست جموں وکشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے، پاکستان کے پالیسی سازوں کے لئے نہ صرف سبق آموز ہے بلکہ شکستہ دلی کی غماضی بھی کرتا ہے، افسوس تو اس بات کا ہے کہ موجودہ حکومت اب تک نہ صرف پرانی حکومت کی وضع کردہ پالیسیوں پر عمل پیرا ہے بلکہ ان سے بھی کئی ہاتھ آگے جارہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے صدر آصف زرداری نے حلف اٹھانے کے بعد قوم کو مسئلہ کشمیر پر ایک بہت بڑے ''بریک تھرو'' کا مژدہ سنایا تھا جس سے ہم جیسے دل جلوں کا ماتھا ضرور ٹھنکا تھا لیکن اب تک ایسی کوئی خبر نہیں آسکی ماسوائے کہ زرداری بار بار اس بات کا اعداہ کرچکے ہیں کہ بھارت تو کبھی بھی پاکستان کا دشمن نہیں تھا اور وہ بھارت کے ساتھ فوری طور پر تجارت کی شدید خواہش کا بھی اظہار کرچکے ہیں۔

بھارت کے پختہ اور اٹل موقف کی تکرار نئی بات نہیں ہے۔بھارت کے موجودہ وزیر اعظم من موہن سنگھ نے اپنے سرینگر کے دورے میں برملا کہہ دیا تھا کہ ریاست جموں وکشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے۔ویسے یہ موقف تو پورے بھارت کا ہے کیونکہ اس کے خلاف بھارت میں اگر کوئی آواز اٹھی بھی تو اس کو متعصب ہندوؤں نے غدار قرار دیکر کسی کونے کھدرے میں ڈال دیا تاکہ کوئی دوسرا کوئی ایسی ہمت نہ کرسکے لیکن دوسرے ''آپشنز'' تجاویز کی بھانت بھانت کی بولیاں اور ''لچک'' صرف پاکستان اور آزاد کشمیر کے کچھ چند خود غرض لوگوں کی طرف سے ہی سننے میں آئی تھیں جس کو بھارت نے بھی درخور اعتناء نہیں سمجھا اور نہ ہی بھارت کے کسی لیڈر اس پر کسی رد عمل کا اظہار کیا ہے۔اب تو پاکستان کی اکثریت جو پہلے ہی ایسی نامعقول تجاویز اور بے

معنی لچک پر اپنے غم و غصہ کا ظہار کر چکی تھی' موجودہ حکومت کو بھی اس سے لا تعلقی کے اظہار کا کئی بار مطالبہ کر چکی ہے۔

چوہدری محمد علی اپنی کتاب ''ظہورِ پاکستان'' میں لکھتے ہیں کہ جب انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو (نومبر ۱۹۴۷ء) کو مختلف دلائل سے کشمیر پر بھارتی فوجی یلغار کے خلاف قائل کر لیا تو پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا ''محمد علی! تمہاری سب باتیں درست ہیں' بھارت کو کشمیر پر قبضہ جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن اگر ہم نے کشمیر پر سے اپنا قبضہ اٹھا لیا تو اس طرح پاکستان مضبوط ہو جائے گا اور ایک ''مضبوط پاکستان'' بھارت کے لئے ہمیشہ خطرہ بنا رہے گا۔'' ہمارے پالیسی ساز یہ بات ذہن نشیں رکھیں کہ بھارت میں یہ ذہنیت ابھی تک موجود ہے۔ اگر آج بھی بھارت میں تقسیم ہند پر ریفرنڈم کروایا جائے تو تقریباً سارا بھارت اس کے خلاف ووٹ دے گا۔ یہی حال کشمیر کا ہے' اگر بھارت میں اس سوال پر رائے شماری کرائی جائے کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے یا نہیں تو سو فیصدی ووٹ اس کے حق میں آئیں گے۔

اس حقیقت کے باوجود ہماری وزارتِ خارجہ کے سمارٹ اور نو آموز پالیسی سازوں نے اپنی ذہانت اور فطانت سے کشمیر کے مسئلے کا یہ فارمولہ وضع کر رکھا ہے کہ کشمیر کے مسئلے کا وہی حل قابلِ قبول ہو گا جو پاکستان' بھارت اور کشمیر کو منظور ہو گا' یہاں بھارت کی ''پنچ'' قابلِ غور ہے۔ بھارت کو کیا کیا منظور ہو گا اس کا اظہار تو بھارت کے سیکرٹری خارجہ اسلام آباد میں آ کر کہہ چکے کہ کشمیر کی پوری ریاست بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور پوری ریاست جموں و کشمیر میں آزاد کشمیر بھی شامل ہے۔ یاد رہے کہ اپنی اس ناپاک جسارت کا اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل کے عین سامنے کشمیر ہاؤس کی طرف تضحیک آمیز انداز میں اشارہ کرتے ہوئے اظہار کیا تھا۔ اب تو ان کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ پیپلز پارٹی کے دور میں تو ان بھارتی زعماء کی خاطر کشمیر ہاؤس کا بورڈ بھی اتروا دیا جاتا ہے تاکہ دوستی اور وفاداری کا عہد نبھایا جا سکے۔

یاد رکھیں کشمیر کا فیصلہ تو کشمیری ہی کریں گے کہ یہ ان کا مادری حق ہے اور اس کے لئے انہوں نے اپنے ایک لاکھ سے زائد افراد کی قربانی دیکر ثابت کر دیا ہے لیکن ہم کہاں کھڑے ہیں؟ کیا اب وہ وقت نہیں آن پہنچا کہ جموں و کشمیر کے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا جائے کہ تمہارا خون اتنا ارزاں نہیں کہ اس کا حساب نہ لیا جائے۔ عیسوی سال کے پہلے دن کا یہ عہد ہمیں یاد بھی رکھنا ہو گا۔ رہے نام میرے رب کا جس کی لاٹھی بے آواز ہے لیکن نہائت شدید!

بروز جمعۃ المبارک ۱۵ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ یکم جنوری ۲۰۱۰ء

کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ مجھ جیسے ہزاروں لوگوں کو زندہ درگور کر دیا گیا ہے" ہچکیوں میں اس آواز کو مجھے پہچاننے میں ذرا دیر نہ لگی' میں نے حوصلہ دیتے ہوئے معاملہ کی بابت دریافت کیا تو زرگل خان گلوگیر لہجے میں تفصیلات بتا رہا تھا کہ یوم عاشورہ کے دن میری اہلیہ گھر کے دوسرے افراد کے تعان سے روزے کی افطاری کا بندوبست کرنے میں مشغول تھی' اپنے تمام عزیزوں اور دوستوں کو افطاری کے لئے دعوت دے رکھی تھی' آپ اور ہم سب کے انتہائی عزیز دوست جناب سید امام گل یوم عاشورہ کے حوالے سے درسِ قرآن سے دلوں کو منور فرما رہے تھے کہ میرے بیٹے نے اشارے سے مجھے باہر بلایا۔ میرا بیٹے کا زرد رنگ' چھلکتی آنکھیں اور تھر تھر کانپتا ہوا جسم میرے دل کی دھڑکنوں کو بے قابو کئے جا رہا تھا۔ میں نے بڑھتی ہوئی بیتابی پر کنٹرول کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ مارکیٹ میں آگ لگ گئی ہے اور ہماری ساری دوکانیں جل کر خاکستر ہو گئیں ہیں اور آگ پر ابھی تک قابو نہیں پایا جا سکا۔ اسے یہ اطلاع مارکیٹ میں میرے پڑوسی نے دی تھی جو اس وقت وہاں موقع پر موجود اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ کاش میں گوانتاموبے میں ہی مر جاتا' کم از کم اتنا تو ہوتا کہ ہمارا لہو اپنے بھائیوں کے ہاتھوں پر نہ ہوتا۔

مجھے اس کے آخری فقرے نے کاٹ کر رکھ دیا اور مجھے چار سال پہلے والی ساری کہانی یاد آ گئی جو میں نے غالباً اپنے ایک کالم میں قسط وار تحریر کی تھی اور پاکستان کے چند اخبارات نے اس کو شائع بھی کیا تھا!

پشاور سے چند میل دور افغان سرحد پر واقع کچے گھروندوں کی بستی کوتکہ میر عالم داود کے مرد' عورتیں اور بچے حکیم محمد کے مٹی سے اٹے دالان میں جمع تھے۔ ڈاکیا ایک پراسرار سی چھٹی لایا تھا جس پر امریکا کی مہر لگی ہوئی تھی۔ سارا گاوں تصویرِ حیرت بنا کھڑا تھا۔ لفافہ کھولا تو ڈاکیا سے پڑھنے کی استدعا کی گئی' اس نے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر پڑھنا شروع کیا "محترم والد صاحب! پیاری والدہ اور بہت یاد آنے والی بہنوں! میں زندہ سلامت ہوں' مجھے پکڑ کر امریکا بھیج دیا گیا تھا حکیم محمد نے کاغذ کا پرزہ اچک لیا اور زور زور سے اپنی بیوی اور بیٹیوں کو پکارنے لگا "عائشہ بی بی! تمہارا بیٹا زندہ ہے' دیکھو اس کا خط آیا ہے ۔ پچھلے کمرے میں جب یہ آواز پہنچی تو وہاں اس کی بیوی اپنے شوہر کی طرف ابھی لپکی تھی کہ راستے میں لڑکھڑا کر گر گئی۔ حکیم محمد نے بڑی مشکل سے اٹھا کر بٹھایا اور وہ کاغذ کا پرزہ اس کے ہاتھوں میں دے دیا۔ وہ پڑھ تو نہیں سکتی تھی لیکن اس کاغذ کے پرزے کو چوم کر کبھی آنکھوں سے لگاتی تھی اور کبھی اس کو اپنے سینے سے اسی طرح بھینچ رہی تھی جس طرح وہ کبھی بچپن میں گل خان کو لگایا کرتی تھی۔

باہر سارے ہجوم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ زرگل محمد کے ماں باپ تو یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ان کا بیٹا اب اس دنیا میں نہیں۔ یہ چھٹی گوانتاناموبے کے ایک پنجرے سے آئی تھی۔ زرگل محمد نے بہت سے دوسری باتوں کے علاوہ لکھا تھا "کوئی غم نہ کرنا' میں خوش و خرم ہوں' مجھے کسی شئے کی ضرورت نہیں البتہ "جو لطف اور سرور یہاں نماز اور دوسری عبادات میں حاصل ہو رہا ہے ایسا تو کبھی بھی وہاں نہیں مل سکا جہاں میں نے ساری زندگی گزاری ہے۔

۲۶ سالہ زرگل خان کا دہشت گردی، طالبان یا القاعدہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ۲۰۰۱ء کے اوائل میں اس کی بیوی اپنے دو بچوں کو شوہر کے گھر چھوڑ کر صرف اپنے نومولود بچے کو اپنے عزیزوں رشتہ داروں کو ملانے شمالی افغانستان کے شہر مزار شریف گئی۔ پاکستان میں بسنے والے اس خاندان کے لئے ڈیورنڈ لائن کبھی رکاوٹ نہ بنی تھی۔ گرمیوں کا موسم ڈھلنے لگا تو زرگل خان اپنی بیوی اور بچے کو واپس لانے مزار شریف روانہ ہو گیا۔ کئی دنوں کی لمبی مسافت کے بعد وہ مزار شریف پہنچا تو جنگ بھڑک چکی تھی۔ شمالی اتحاد نے مزار شریف پر قبضہ کر لیا تو زرگل خان بھی فاتحین کے شکنجے میں آ گیا۔ امریکی سپاہ عربوں اور پاکستانیوں کی تلاش میں بولائی پھر رہی تھی۔ شمالی اتحاد کے گرگوں کے لئے یہ گراں قیمت مالِ غنیمت تھا۔ طالبان سے تعلق رکھنے والے کا بھاؤ پانچ ہزار ڈالر اور القاعدہ کی تہمت والے کم نصیب کی قیمت بیس ہزار ڈالر نقد لگ رہی تھی۔

شمالی اتحاد کے ایک ایسے آدمی نے زرگل خان کو امریکیوں کے ہاتھ بیچ دیا جو پچھلے کئی سالوں سے زرگل خان کا لاکھوں کا مقروض تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانا اور زرگل خان کی کیا قیمت وصول کی، اس کو طالبان کے کھاتے میں ڈالا یا پھر القاعدہ کا ایجنٹ ٹھہرایا گیا، بہر حال اس کی مشکیں کس کر ایک عمارت میں لایا گیا جہاں سب سے پہلے اس کی بڑی اور گھنی داڑھی اور بھنوئیں مونڈ دی گئیں، آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی گئی، کانوں میں ایک خاص قسم کی روئی ٹھونسی گئی، ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پاوں میں بیڑیاں ڈالی گئیں۔

۱۷ گھنٹوں کے طویل سفر کے بعد وہ گوانتاناموا یکسرے کیمپ کے آٹھ فٹ مربع پنجرے میں ڈال دیا گیا۔ مہینوں اس کی کوئی خبر نہیں آئی تو اس کے بوڑھے والدین اور اس کے بیوی بچے رو دھو کر چپ ہو گئے۔

گوانتاناموا یکسرے کیمپ کے ۶۶۰ باسیوں میں سے نوے فیصد ایک فاسق کمانڈو جنرل پرویز مشرف کی فیاضی کا نتیجہ ہیں اور ان میں سے ساٹھ سے زائد پاکستانی بھی ہیں جن کی اوسط عمریں ۲۰ سے ۲۲ سال ہیں۔ پاکستانی ٹیمیں دو دفعہ وہاں جا کر قیدیوں سے مل آئیں ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ صرف آٹھ کا کچھ واسطہ نام نہاد القاعدہ سے ہو سکتا ہے اس کے باوجود حکومتِ پاکستان نے بے گناہوں کی رہائی کے لئے کچھ نہیں کیا اور ان میں جو چھوٹ کر واپس آئے بھی ہیں وہ امریکا کی ایک طویل تفتیش کے بعد اور امریکا میں موجود انسانی ہمدردی کے لئے کام کرنے والی تنظیموں کے دباو کے بعد رہا ہو کر آئے ہیں اور زرگل خان بھی ان خوش نصیبوں میں ایک تھا۔ اسی کیمپ میں ۱۶ سال سے کم عمروں والے کچھ بچے بھی ہیں اور سو سال کے لگ بھگ عمروں والے دو بوڑھے بھی۔ اب تو ہم امریکی کروسیڈ کی بگھی کھینچتے کھینچتے ہانپنے لگے ہیں لیکن اتنا حق بھی نہیں رکھتے کہ اپنے معصوم فرزندانِ وطن بشمول اپنی بہن ڈاکٹر عافیہ صدیقی اور اس کے گمشدہ بچوں کی رہائی کے لئے آواز اٹھا سکیں۔

یہ کیسے ماہ و سال ہیں کہ دل پتھر ہوتے جا رہے ہیں، آنکھوں کا پانی مر گیا ہے اور پتلیاں سنگلاخ زمینوں کے سنگریزے بن کر رہ گئی ہیں۔ افغانستان پر جو کچھ گزری وہ حساس جانوں کی ہڈیاں تک پگھلا دینے کے لئے کافی تھا لیکن ہمارے معمولِ حیات کوئی فرق نہیں پڑا۔ ظلم کی اس داستاں کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اللہ کے حضور جھکنے اور محمد عربی ﷺ کے نام کا کلمہ پڑھنے والوں کے سینے چھلنی کرنے والی بندوقیں برسوں ہمارے کندھوں پر سجی رہیں۔

ان کی بستیاں تاراج کرنے والے طیارے ہمارے ہوائی اڈوں سے اڑانیں بھرتے رہے۔اس عہد ستم گار میں زندہ رہنے والوں کو کبھی نہ کبھی یہ حساب دینا پڑے گا کہ تمہارے دل شدتِ کرب سے پھٹ کیوں نہیں گئے اور تمہاری آنکھیں آتشیں غم سے پگھل کر بہہ کیوں نہ گئیں؟

ہم نے تو یہ خبریں بھی کرکٹ میچ کے تازہ اسکور کے انداز میں سہیں کہ سرزمین حجاز سے آئے کتنے مہمانانِ عزیز بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہانک کر امریکی قصابوں کے حوالے کی گئیں جنہیں پاکستان اور امریکا مشترکہ طور پر یہاں لائے تھے اور جن کے شمشیر زن بازو سرخ سامراج کے خلاف استعمال کئے گئے تھے۔یہ کیسا نامہرباں موسم ہے کہ ہمیں پتھر بنا گیا؟ کوئی بھی منظر ہماری دیوارِ جاں میں شگاف نہ ڈال سکا اور کوئی بھی خبر ہمارا دامانِ دل چاک نہ کر سکی اور جب درندگی کا یہ قافلہ بلیک واٹر کی شکل میں آئے دن ہمارے شہروں میں بم دھماکوں سے معصوم زندگیوں سے کھیل رہا ہے تو بھی راکھ کے ڈھیر میں کوئی کوئی چنگاری نہیں سلگ رہی۔میں گزشتہ کئی دنوں سے ٹیلیویژن کی سکرین پر ان بدنصیبوں کو دیکھ رہا ہوں جو اپنی خاکستر دوکانوں کی صفائی میں مصروف ہیں۔سفید ریش بزرگ ہاتھ جوڑ کر ٹی وی اینکر سے کہہ رہا تھا کہ ہم اپنے خاندان کے دوسرے افراد کو بھی یہاں لاتے ہیں' حکومت سے کہو کہ ہم سب کو ایک دفعہ بم مار کر ختم کر دو کہ ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم پاکستان سے محبت کرتے ہیں"۔

ایک تاجر اپنے ننھے بچے کا بازو تھامے کیمروں کے نرغے میں کھڑا یوں کانپ رہا تھا جیسے کوئی معصوم ہرنی اپنے معصوم بچوں کے ساتھ بھوکے بھیڑیوں میں کھڑی ہو''میری آٹھ دوکانیں اور چودہ گودام اس مارکیٹ میں تھے جن میں سے ایک بھی نہیں بچا' مجھے میرا قصور بتایا جائے؟ لمحہ بھر کے لئے میرے دل کے کسی گوشے میں ایک آتشیں بگولہ سا اٹھا' آنکھوں میں نمکین پانی کی ایک موج سی لہرائی اور پھر سب کچھ تحلیل ہو گیا لیکن آج زرگل خان کے ٹیلیفون نے گوانتاناموبے میں مر جانے کی خواہش نے مجھے گوانتاناموبے کے ان فراموش بھائیوں پر ہونے ہولے مظالم کے زخموں کو پھر سے ہرا کر دیا ہے۔اکیسویں صدی میں جیتے جاگتے انسانوں کو یوں پنجروں میں بند کر دینا کبھی اتنا آسان نہیں تھا۔اگر ستاون اسلامی ملک پرزور موقف اختیار کر لیتے تو ساری دنیا ان کا ساتھ دیتی لیکن دنیا کو نیا وژن اور عالمِ اسلام کو روشن خیالی' اعتدال پسندی کے نعرے دینے والوں کو شائد یاد ہی نہیں رہا کہ اس کرہ ارض پر گوانتاناموبے نامی بے مہر بستی بھی ہے۔

پچاس سے زائد پاکستانی قیدیوں کے چاہنے والے ان گنت امریکی دوروں پر گئے پاکستانی لیڈروں کی تقریریں اور خبریں بڑے غور سے سنتے ہیں لیکن ان کے جگر گوشوں کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔بوڑھی مائیں اپنی گل ہوتی آنکھوں میں موجود روشنی کی آخری رمق سنبھالے بیٹھی ہیں کہ شائد دور دیس جانے والے لوٹ آئیں لیکن کیمپ ڈیوڈ کے پر فضا مقام سے وائٹ ہاوس کی متبرک راہداریوں تک رسائی رکھنے والوں کو یاد ہی نہیں رہا کہ اس زمین کے کتنے بیٹے گوانتاناموبے کے پنجروں میں گل سڑ رہے ہیں۔ان کا ذکر تو اس عزت مآب اسمبلی میں بھی نہیں ہوا جس کے ارکان کی بڑی تعداد خونِ شہداء کو اپنے عارض ورخسار کا غازہ بنا کر ایوان تک آئی ہے۔پتا نہیں ان اذیتوں کا موسم اور کتنی دیر جاری رہے گا اور بے بال وپر پرندے فولادی زنجیروں میں جکڑے تڑپتے پھڑکتے رہیں گے۔

زرگل خان! ہمارے دل تو پتھر ہو چکے ہیں اور ہماری آنکھوں کی پتلیاں سنگلاخ زمینوں کے سنگریزے بن گئیں ہیں۔اب نہ کوئی منظر ہماری آنکھوں میں چنگاریاں سلگاتا اور نہ کوئی خبر ہماری دیواروں پر ضرب لگاتی ہے۔ تمہارا اللہ نگہبان! رہے نام میرے رب کا جو ظالموں کو ایک خاص وقت تک ڈھیل دیتا ہے اس کے بعد!

اس شہر میں ہر شخص کا احوال ہے یکساں
دیوارِ یقیں گرتی ہوئی، ٹوٹتے اعصاب

بروز ہفتہ ۱۶ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۲ جنوری ۲۰۱۰ء

کمزور یا منافق

اکرم کی کہانی بہت دلچسپ تھی۔ اکرم اور اشرف دو بھائی تھے' ان کے والد نے مرتے ہوئے اپنا واحد مکان دونوں میں تقسیم کر دیا۔ اکرم کے حصے نچلی منزل اور اشرف بالائی حصے کا مالک بن گیا۔ مکان کے درمیان سٹور قسم کا ایک کمرہ تھا' امام دین جوان دونوں کا والد تھا' نے آخری سانسیں اس کمرے میں لیں۔ والد کی بیماری کے دوران اکرم نے اپنے والد کی بہت خدمت کی' لہٰذا والد نے انتقال سے پہلے وہ کمرہ اکرم کو دے دیا۔ اکرم ابھی اس کمرے میں سامان رکھنے کا سوچ رہا تھا کہ ایک دن اشرف نیچے اترا اور کمرہ پر قابض ہو گیا۔ اکرم نے اسے لاکھ سمجھایا' ترلے منتیں کیں' یار احباب سے کہلوایا' پنچائت بلوائی اور ثالث بٹھائے لیکن اشرف نے قبضہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

ان دنوں ساری برادری اشرف کو لعن طعن کرتی تھی لیکن اشرف کے پروں پر پانی نہیں پڑتا تھا۔ اکرم ہر ملنے والے کو اشرف کی بد معاشی اور زیادتی کے بارے میں بتاتا اور آخر میں بڑی عاجزی کے ساتھ درخواست کرتا کہ ''اس بد معاش کو اس زیادتی سے روکیں اور اسے سمجھائیں۔'' ملنے ملانے والے اشرف کے خلاف فوراً قرار دادِ مذمت پیش کر دیتے۔ یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہا یہاں تک کہ ان دونوں کی اولادیں جوان ہو گئیں۔ اکرم کا ایک بیٹا ذرا ''اتھرا'' تھا' وہ ایک روز اٹھا اور اس نے نیچے سے چچا کی بجلی' پانی اور گیس بند کر دی۔ اشرف بہت چلایا' اس نے بہت شور مچایا لیکن لڑکے نے کنکشن کھولنے سے انکار کر دیا۔ معاملہ پنچائت میں گیا' پنچائتی بیٹھے تو لڑکے نے مطالبہ کیا'' چچا پنچائت کے پرانے فیصلے مان لیں' ہمارا کمرہ واپس کر دیں' میں کنکشن کھول دوں گا۔

اشرف اس مطالبے کو دہرانے پر بڑے غصے میں پنچائت سے اٹھ کر واپس آ گیا لیکن جس گھر میں پانی بجلی اور گیس نہ ہو اس کا مالک کتنی دیر تک ناراض رہ سکتا ہے۔ اشرف کی ضد نے تیسرے دن ہی دم توڑ دیا۔ وہ اکرم کے پاس آیا' اپنے رویے پر معافی مانگی اور کمرے کی چابی اس کے قدموں میں رکھ دی۔ اس شام اکرم کا ''اتھرا'' بیٹا باپ کی پائنتی بیٹھا اور باپ کے گٹھنے دبا کر بولا'' اباضدی اور قابض لوگ منت کو مانتے ہیں اور نہ ہی مطالبوں کو' یہ لوگ جوتوں کی اولاد ہوتے ہیں' انہیں صرف جوتے کی زبان ہی سمجھ میں آتی ہے۔

اکرم کے اس اتھرے بیٹے کا نام آصف ہے اور بچپن میں میرا نہ صرف کلاس فیلو تھا بلکہ میرا گہرا دوست بھی تھا۔ حالات نے برسوں پہلے اس کا رزق بحرین میں اور مجھے لندن لا بٹھایا۔ پچھلے دس سالوں سے میرا اس کا کوئی رابطہ نہیں' اگر میرے پاس اس کا نمبر ہوتا تو میں اس سے ضرور درخواست کرتا کہ بھائی ذرا چند دنوں کے لئے اسلام آباد کا ایک چکر ضرور لگائے جہاں ہمارے حکمران کا ایک بہت بڑا گروہ آئے دن قصرِ سفید کے مہمانوں کا استقبال کے لئے ہمہ وقت انکساری اور عاجزی کے ساتھ چہروں پر مسکراہٹ سجائے چشمِ براہ رہتے ہیں۔ جاؤ انہیں اپنی کہانی سناؤ اور آخر میں ان سے عرض کرنا کہ اسلامی جوہری طاقت کے ظل سبحانیوں! قرار دادیں اور مطالبے بااخلاق اور مہذب لوگوں کے لئے ہوا کرتے ہیں' قابضین کے لئے نہیں' ضد کا مقابلہ ضد اور قبضے کا مقابلہ قبضہ ہوتا ہے کیونکہ ظالم صرف ظلم کی زبان سمجھتا ہے۔

آصف کو آج تو یقیناً اسلام آباد میں ہونا چاہئے تھا جہاں امریکی صدارتی الیکشن میں ہارنے والا جان مکین اپنے ساتھیوں کے ساتھ میڈیا کو یہ بتا رہا تھا کہ امریکا ڈرون حملوں کو بند نہیں کرے گا اور امریکا اس بات کی کسی کو اجازت نہیں دے گا کہ کوئی بھی امریکی فوجیوں کے لئے خطرہ بن سکے اور اس سلسلے میں پاکستان کے تعاون کی بھی خوب تعریف کی۔ میڈیا میں سے کسی نے یہ سوال نہیں پوچھا کہ آخر آپ ہزاروں میل دور سے آ کر ان کا تورا بورا بنا دیں' آن کی آن میں آتش و دہن کی بارش برسا کر ان کو خاکستر کر دیں لیکن یہ جواب میں مارنے والے کا ہاتھ بھی نہ روک سکیں' اگر ان میں سے کوئی اپنے اہل و عیال کے ظالمانہ قتل پر احتجاج بھی کرے تو اس کو دہشت گرد قرار دیکر اس کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا لائسنس آپ کو کس نے دیا ہے؟ یہ پریس کانفرنس انہوں نے صدر زرداری اور وزیر اعظم گیلانی کی ملاقات کے بعد کی۔

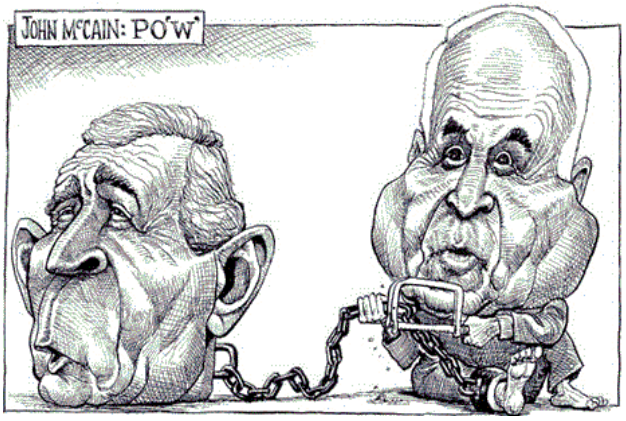

کچھ دن پہلے کشمیریوں سے یکجہتی کا دن مناتے ہوئے ایک دفعہ پھر ایوانِ صدر کے مکیں زرداری خود آزاد کشمیر کی اسمبلی میں جا کر بڑے محتاط انداز میں کشمیر کے حصول کے لئے اپنے ارشادات سے قوم کو ایک دفعہ پھر مخمصے میں ڈال دیا ہے' اسمبلی نے ایک مذمتی قرارداد بھی پاس کر دی کہ بھارت اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیر کا فیصلہ کرے۔ جب یہ قرارداد پاس ہو رہی تھی آصف کو اس وقت وہاں ہونا چاہئے تھا تاکہ وہ ان حکمرانوں کو قبضے چھڑانے کا طریقہ بتا سکتا اور اگر یہ ممکن نہ ہوتا تو کم از کم وہ شہر کے درمیان کھڑے ہو کر قہقہے ہی لگا دیتا۔

اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی نے آخری مرتبہ ملائشیا پتراجایا میں ۱۸/اکتوبر ۲۰۰۳ء کو کشمیر پر بھارت کے خلاف مذمتی قرارداد پاس کی تھی جس میں او آئی سی نے بھارت سے پرزور مطالبہ کیا کہ بھارت اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے مطابق کشمیر کا فیصلہ کرے' اس وقت بھی نجانے آصف کہاں تھا کہ وہ عالمِ اسلام کے ۵۷ بادشاہوں' امیروں اور صدروں کو قبضہ چھڑانے کا طریقہ بتا سکتا' لیکن قصرِ سفید کا قبضہ تو دن بدن بڑھتا ہی جا رہا ہے اور عالمِ اسلام غلامی کے قعرِ مذلت میں تیزی کے ساتھ گرتا جا رہا ہے۔

کشمیر کا مسئلہ ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوا تھا' عربوں سے بھارت کے تعلقات ۵۰ء اور ۶۰ء کی دہائی میں قائم ہوئے تھے' او آئی سی نے ۱۹۶۹ء میں جنم لیا تھا اور ۱۹۶۹ء ہی سے کشمیر او آئی سی کے ایجنڈے پر چلا آ رہا ہے۔ پورا عالمِ اسلام ۶۰ برس سے انفرادی اور ۳۹ سال سے اجتماعی سطح پر بھارت کی مذمت کر رہا ہے لیکن بھارت کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی' کیوں؟ کیونکہ بھارت جانتا ہے عالمِ اسلام کشمیر اور فلسطین کے مسئلے پر سنجیدہ نہیں۔ یہ محض خالی خولی نعرے اور زبانی کلامی مطالبے ہیں۔ بھارت کے یہ خیالات سو فیصد درست ہیں' خود سوچئے جو بھارت سعودی عرب' امارات اور کویت سے نوارب ڈالر کا تیل خریدتا ہو' جو بھارت تیرہ ارب ڈالر کی مصنوعات' سبزیاں اور اناج فروخت کرتا ہو اور جس بھارت کے ۵۴ لاکھ شہری عرب ریاستوں میں کام کر رہے ہوں اور یہ لوگ ہر سال اربوں ڈالر کا زرِ مبادلہ کماتے ہوں' اس بھارت کو کشمیر پر عالمِ اسلام کی سنجیدگی جاننے کے لئے کتنی دیر لگے گی؟

کیا دنیا نہیں جانتی پورا عالمِ اسلام تو رہا ایک طرف صرف عرب ممالک بھارت کو تیل کی سپلائی بند کر دیں، بھارتی مصنوعات شدید مالیاتی، تجارتی اور سفارتی بحران کا شکار ہو جائے گا، چند ہی دنوں میں گھٹنے ٹیک دے گا لیکن کیا کیجئے پورا عالمِ اسلام بھارت کے خلاف مذمتی قرار دادیں بھی پاس کرتا ہے اور ساتھ ہی "موسٹ فیورٹ" قوم بھی قرار دیتا ہے۔ صدر زرداری نے تو حلف اٹھاتے ہی بھارت کو ایسا ہی نہ صرف پیغام بھیجا تھا بلکہ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ بھارت کے ساتھ ہماری کبھی کوئی دشمنی نہیں رہی۔ عرب کشمیریوں کے حمائت میں نعرے اور بیانات بھی جاری کرتے ہیں اور ساتھ ہی بھارتی ٹینکوں کو تیل بھی فراہم کرتے ہیں۔ ہر کانفرنس، ہر اجلاس اور ہر ریفرنس میں مظلوم کشمیریوں کے لئے آنسو بھی بہاتے ہیں اور ساتھ ہی بھارت کے ساتھ تجارتی معاہدے بھی کرتے ہیں، لہٰذا اب ہر مذمتی قرار داد کے بعد نہ صرف بھارت قہقہے لگاتا ہے بلکہ پورا یورپ اور امریکا بھی بغلیں بجاتے ہیں۔

یہ دنیا کا مسلمہ اصول ہے، مطالبہ کمزور کرتے ہیں یا منافق، اور پورا عالمِ اسلام اس وقت دونوں علتوں کا شکار ہے اور یہ بھی اس دنیا کا اصول ہے جو شخص قوتِ بازو سے اپنا حق وصول نہیں کر سکتا اسے وہ حق مطالبوں، قرار دادوں اور میمورنڈمز سے نہیں ملا کرتا۔ ہم ۶۱/اسلامی ممالک کمزوری اور سفارتی منافقت کا شکار ہیں۔ لہٰذا کشمیر ہو یا فلسطین ہر آنے والا دن ہمیں ہمارے حق سے دور لے جا رہا ہے۔ ہر پھیلتی شام اور وسیع ہوتی رات ہمیں ہمارے استحقاق سے محروم کر رہی ہے۔ امریکا اور مغربی ممالک اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ پورا عالمِ اسلام بھارت کا کچھ نہیں بگاڑ سکا بھلا قصرِ سفید کے شکنجے سے کیسے نکل سکیں گے؟ جان مکین جس کو امریکیوں نے مسترد کر دیا تھا، وہ پاکستان کی زمین پر پاکستان کو للکار کر کہہ رہا ہے کہ ڈرون حملے جاری رہیں گے۔ بھارت کی طرف سے جنرل دیپک کی دھمکی اور امریکا کا شدید دباؤ اس امر کی طرف کھلا اشارہ ہے کہ پہلی دفعہ پاکستانی فوج نے اس سارے دباؤ سے نکلنے کا جو تہیہ کیا ہے اس کو ناکام بنایا جائے۔ آخر کبھی نہ کبھی تو اس منافقت کو خیر باد کہنا پڑے گا لیکن کب؟

رہے نام میرے رب کا جو اپنے بندوں کو اتنی ہی تکلیف دیتا ہے جس کو وہ برداشت کر سکے!

کاش، تو حیلہ جاروب کے پر نوچ سکے

کاش، تو سوچ سکے سوچ سکے

بروز بدھ ۲۰ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۶ جنوری ۲۰۱۰ء

ثقافتی فتح

بھارتی دار لحکومت نئی دہلی میں آج (۱۰ جنوری ۲۰۱۰ء) سے ایک مشکوک مقاصد کی حامل سہ روزہ کانفرنس شروع ہو رہی ہے جس کا عنوان ''پاک بھارت امن کانفرنس' امن کی جانب ایک روڈ میپ'' رکھا گیا ہے مگر کانفرنس کے دعوت نامے کے مطابق دوسرے روز یعنی ۱۱ جنوری کو ہونیوالے سیشن کا عنوان ''خود مختاری کا مسئلہ کشمیر اور بلوچستان'' ہوگا۔ میں نے جب یہ عنوان پڑھا تو دل میں ایک ہوک سی اٹھی کہ معاملات کا رخ اب کس جانب نہ صرف موڑ دیا گیا ہے بلکہ اس کانفرنس کے پردہ میں ان مذموم ارادوں کی تکمیل میں خود پاکستانی ''جواہر ریزوں'' کو استعمال کیا جا رہا ہے جس کی طرف میں کئی بار بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ خبر دار بھی کر چکا ہوں۔

وطنِ عزیز میں ایک گروہ ایسے سادہ دلوں کا بھی ہے جو سب کو اپنے جیسا سمجھتے ہوئے ہر پند ھواڑے دیئے جلا کر ہاتھوں میں پھولوں کے ہار اور گجرے لیکر واہگہ بارڈر پر وسی مہمانوں کے استقبال کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر خواتین و حضرات اعلیٰ تعلیم یافتہ' معاشی طور پر آسودہ حال' فیشن ایبل اور وضع قطع کے اعتبار سے ماڈرن اور سیکولر ذہن کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ ملکی یا غیر ملکی سیمینار ہوں یا عالمی مشاعرے' گنگا جمنی تہذیب کے یہ دلدادہ ہر جگہ محبت کے گیت گاتے' ایک تہذیب اور ایک کلچر کا تواتر سے ذکر کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا تمام تر زورِ بیان یہ ثابت کرنے میں صرف ہوتا ہے کہ بھارت اور پاکستان میں دشمنی کی جڑ صرف اور صرف مسئلہ کشمیر ہے' کیونکہ تہذیبی اعتبار سے دونوں اطراف کے عوام بالکل ایک ہیں' دونوں کا رہن سہن' بول چال' کھانا پینا' اوڑھنا بچھونا اور ناچ گانا سب ایک جیسے ہیں۔ اگر مسئلہ کشمیر رستے میں حائل نہ ہو تو تمام دوریاں مٹ سکتی ہیں' ہر طرف امن و آشتی کا دور دورہ ہو سکتا ہے اور برصغیر میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں گی لیکن پاکستانی فوج اور ہم جیسے دل جلے بوجود اس مسئلے کو حل نہیں کرنا چاہتے۔ پھر وہ ہمارے قومی بجٹ میں فوج کے اخراجات کا رونا رونے لگ جاتے ہیں اور اس دلیل کو رد کرنا واقعی مشکل ہے۔

بیشک ان جذبات کی قدر کرنی چاہئے لیکن اس گرمجوشی میں میر کا شعر بھی ملحوظِ خاطر رہے تو بہتوں کا بھلا ہو سکتا ہے!

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

لیکن اس کا کوئی کیا کرے کہ بھارت کے سابقہ وزیر اعظم شری واجپائی خود حقیقتِ حال کہنے سے خود کو باز نہ رکھ سکے' فرمایا ''مسئلہ کشمیر نہ بھی ہوتا تو بھی پاک بھارت اختلاف ہوتے۔'' اب آپ کیونکہ ایک منجھے ہوئے تجربہ کار سیاستدان ہیں اس لئے انہوں نے اشاروں کنایوں میں بات کی لیکن یارانِ نکتہ داں بخوبی سمجھتے ہیں کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان اصل مسئلہ تو کشمیر ہے ہی نہیں (وگرنہ جب اکٹھے تھے کوئی مسئلہ کشمیر نہیں تھا' اس وقت وجہ مخاصمت کیا تھی؟' وضاحت کے لئے بھارت کے ایک صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد (جو کہ دانشور اور مورخ بھی ہیں) کا بیان پیشِ خدمت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ''بھارت اور پاکستان کے تعلقات اس وقت تک درست نہیں ہو سکتے جب تک پاکستان قائم ہے"۔

پتہ یہ چلا کہ بھارت کے پہلو میں کھٹکنے والا کانٹا کشمیر نہیں بلکہ خود مملکتِ پاکستان ہے کیونکہ پاکستان ہی کی ڈھال نے برصغیر کے بے شمار مسلمانوں کو ہندوؤں کی غلامی اور کشمیر اور گجرات جیسے (مکمل نسل کشی) سے محفوظ کر رکھا ہے اور مسلمانوں سے ۸۰۰ سالہ غلامی کا بدلہ چکانے اور اکھنڈ بھارت کے دیرینہ خواب کی راہ میں پاکستان ایک کوہِ گراں کی طرح حائل ہے۔ آج جو ہمارے بہن بھائی خود کو بہت پروگریسو اور آزاد خیال گردانتے ہیں، مت بھولیں کہ تاریخ کا اپنا ایک سبق ہے۔ مت بھولیں کہ شاہ ولی اللہؒ، سر سید احمد خاں، علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ بھی اپنے وقت کے انتہائی ماڈرن اور بہت روشن خیال لوگ تھے۔ آخر کوئی وجہ تو تھی کہ یہ سارے کے سارے عظیم لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے کیونکہ متعصب اور تنگ نظر ہندو برابری اور انصاف کی بنیاد پر مسلمان کو جینے کا حق دینے سے انکاری تھے (اس میں برہمن کا بھی کیا قصور، اس کے نزدیک کم ذاتوں، ملیچھوں (بشمول مسلمان) کو دبا کر رکھنا مذہب کے ایک حکم کی حیثیت رکھتا ہے) اور مسلمانوں سے بدلہ لینے کی خواہش کا جوالا مکھی صرف اسی صورت میں ٹھنڈا ہو سکتا تھا اگر ہندو مسلمانوں کے ساتھ وہی سب کچھ آزادی سے کر سکتے جیسا کہ سپین میں سقوطِ غرناطہ کے بعد ہوا تھا اور اگر آج کی دنیا میں یہ ممکن نہ تھا تو بھی کم سے کم مسلمانوں کو بھارت ورش میں دوسرے درجہ کا شہری قرار دینا تھا۔

دو قومی نظریہ اور پھر تقسیمِ ہند، ہندوؤں کی مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھنے کی خواہش ہی کا شاخسانہ تھا۔ گاندھی جی کے پوتے نے اپنی ایک حالیہ مشہور زمانہ کتاب ''انڈر سٹینڈنگ دی مسلم'' میں لکھا ہے!

''ہندو بھی باہر سے آئے، مگر اپنے بیرونی اقتصادات کو وہیں چھوڑ آئے اور ہند میں انہوں نے اقتصادیات وضع کئے جبکہ مسلمان واحد بڑی قوم ہیں جو مکہ و مدینہ سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ بلاشبہ یہ ہماری غلطی ہے کہ زمینی حقائق کے مطابق مسلمانوں کو قوم کا درجہ نہیں دیا اور ایک غلط مفروضے پر محاذ رائی کرتے رہے، جب کہ وہ ''ڈیفیکٹو'' (پہلے سے شناخت رکھنے والی) قوم ہے اور رہے گی۔ اگر ہم شروع میں دو قومی نظریہ کی حقیقت مان لیتے تو دونوں بڑی اقوام کے مابین تصفیہ ہو سکتا تھا اور تقسیمِ ہند کی نوبت نہ آتی۔''

پارٹیشن نے ہندوؤں کی مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھنے کی خواہش پر پانی پھیر دیا حالانکہ تقسیم ہند کی ذمہ داری بھی خود اعلیٰ ہندو لیڈر شپ تھی۔ (جب انہوں نے دیکھا کہ کیبنٹ مشن کے تحت وہ مسلمانوں کو غلام نہیں بنا سکتے تو نہرو نے تقسیمِ ہند کو قبول کر لیا) لیکن اس کے باوجود ہندوؤں کے لاشعور کی اندرونی تہوں میں دبی ہوئی خواہش سے وہ چھٹکارہ نہ پا سکے اور انہوں نے دوسری حالات اور وقت کی روشنی راہیں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ چانکیائی ذہن کا یہ خاصہ ہے کہ ہندو میں اپنے حربے تبدیل کرتے رہتے ہیں اور خود کو کسی اخلاقی اصول کا پابند نہیں سمجھتے لیکن یہ حقیقت بہر حال مسلم ہے کہ ہندوؤں نے پاکستان کو دل سے کبھی بھی تسلیم نہیں کیا اور پہلے ہی دن سے پاکستان کی بربادی ہندوستان کے ہر حکمران کی پالیسی کا محور رہا ہے اور اس سلسلے میں شروع ہی سے پاکستان کی کمزور اور نوزائیدہ مملکت کو ہر طرح کے مسائل سے دوچار کرنے کی مذموم کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ لاکھوں مہاجرین کا بوجھ، کشمیر پر غاصبانہ قبضہ اس نیت سے کہ پاکستان کی شہ رگ (پانی کے حوالے) سے بھارت کے پنجے میں رہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ فوجی کاروائیوں کی

مستقل دھمکیاں، دراصل ہندو ذہن نے اپنی جغرافیائی، معاشی اور فوجی لحاظ سے کئی گنا برتری کو ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال کر کے شروع ہی سے پاکستان کو ایک انتہائی مہنگا دفاعی نظام رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

بھارت کے منصوبہ ساز اس بات سے بخوبی آگاہ تھے جسے ایک مشہورِ زمانہ مصنف پاؤل کینڈی نے اپنی کتاب "رائز اینڈ فال آف گریٹ پونرز" میں رقم کیا ہے جس کے مطابق بڑی معیشت یا معاشی قوت لمبی محاذ رائی میں بالآخر کمزور پر غلبہ پالیتی ہے کیونکہ کمزور معیشت فوجی محاذ آرائی کو بہت لمبے عرصے تک سہارا نہیں سکتی (اس کا حالیہ ثبوت سوویت یونین ہے) ہمارا یہ چالباز ہمسایہ پہلے دن سے ہی گھات لگائے بیٹھا ہے اور اس تاک میں ہے کہ ہمارے وجود ہی کو مٹا دے، کیونکہ ہندوؤں نے نہ تو پاکستان کے وجود کو گوارا کیا ہے اور نہ کریں گے۔ خود کو دھوکہ دیکر ہندوستان سے محبت کا پرچار کرنے والے کیا انڈین نیشنل کانگریس کے صدر اچاریہ کرپلانی کا ۱۸/اگست ۱۹۴۷ء (تقسیم کے صرف چار دن بعد) کا بیان بھول چکے ہیں کہ ''نہ تو کانگرس اور نہ قوم ابھی تک متحدہ ہندوستان پر اپنے دعوے سے دستبردار ہوئی ہے۔'' تقسیم کے وقت فیلڈ مارشل آکنلک (برطانوی سپریم کمانڈر) کو سامانِ حرب اور افواج کی تقسیم کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اپنے تلخ تجربات کی روشنی میں ۲۸ ستمبر ۱۹۴۷ء میں انہوں نے حکومت یعنی برطانیہ کو رپورٹ پیش کرتے ہوئے لکھا ''بھارتی کابینہ نے سختی سے طے کر رکھا ہے کہ پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر قائم نہ ہونے دیا جائے'' سردار ولبھ بھائی پٹیل، ہندوستان کے مردِ آہن اور وزیرِ داخلہ نے ۲ نومبر ۱۹۵۰ء میں فرمایا ''ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں پاکستان کے باعث پہنچنے والے نقصان کو محسوس کر کے دوبارہ متحد ہو جائیں"۔ ۶ نومبر ۱۹۵۰ء میں اخباروں کی زینت بننے والا ایک اور بیان زیرِ نظر رہے ''اکھنڈ بھارت" میں ہندو راج کا قیام مہاسبھا کا مقصود ہے۔

بھارت ہم سے چار جنگیں لڑ چکا ہے، ہماری تاریخی کوتاہیوں سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کو دولخت کر چکا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ پر ہندوستان کی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کے بیان سے آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ فرماتی ہیں ''آج دو قومی نظریہ ہم نے خلیج بنگال میں ڈبو دیا، ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لے لیا! بے شک میرا باپ پنڈت جواہر لال نہرو ایک بڑا آدمی تھا لیکن اس بات پر میں اسے معاف نہیں کر سکتی کہ اس نے برصغیر کی تقسیم کا فیصلہ قبول کر لیا، بہر حال میں نے آدھا حساب چکا دیا ہے اب یہ دیکھیں کہ میں اب کیا کرتی ہوں۔'' اندرا کے جانشین راجیو نے بھی اپنی والدہ کی پالیسی کو جاری رکھنے کا اعلان کیا اور پاکستان پر دباؤ قائم رکھا اور ہندوستان والے ایٹمی حملوں کی دھمکیاں بھی دیتے رہے۔

صورتحال میں ایک بار پھر ڈرامائی تبدیلی اس وقت آئی جب پاکستان نے جوابی ایٹمی دھماکہ کر کے بھارت کے لئے شائد پاکستان کو بقوت تسخیر کرنا ناممکن بنا دیا۔ چانکیہ کے جانشینوں نے اسی لئے ایک بار پھر پینترہ بدلا، شری واجپائی لاہور تشریف لائے، مینارِ پاکستان پر حاضری دیکر گویا گواہی دی کہ اب بھارت پاکستان کے وجود کو ختم کرنے کے مذموم ارادوں سے تائب ہو چکا ہے لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ بھارتی بنئے کی بغل میں چھری پہلے سے بھی زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ اب کی بار بھارتی نیتاؤں کا زور محبت، امن اور آشتی پر ہے۔ بیشک محبت، دوستی، رواداری، صلح جوئی، بھائی چارہ آفاقی قدریں ہیں اور پاکستانیوں کے لئے بھارت سے دوستی کرنا نہ تو کبھی مسئلہ رہا ہے اور نہ مستقبل میں ایسا کوئی امکان ہے کیونکہ دینِ اسلام تو جوہری طور پر امن و سلامتی کا ہی سبق دیتا ہے اور سب کو ان کے جائز حقوق دینے کا پابند ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا فرمان یاد رہے کہ جس نے غیر مسلموں کو اذیت دی اس نے گویا مجھے اذیت دی۔

علامہ اقبالؒ کا مشہور مصرعہ ہے ''اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم!''(علامہ دانائے راز تھے' وہ ملت ابراہیمی بھی کہہ سکتے تھے) یہ مسئلہ اگر کسی کے لئے ہے تو متعصب ہندو ذہن کے لئے' جس کو پاکستان کی حقیقت کو دل سے قبول کرنے میں شائد ابھی کافی وقت لگے گا۔اس وقت تک اگر ہندو بنیاذ ہنیت پاکستان کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے تو اس کے پیچھے ان کی وہ چانکیہ سازش ہے کہ ''بغل میں چھری اور منہ میں رام رام'' پاکستانیوں کے لئے سبق یہی ہے کہ وہ جاگتے رہیں' اپنے گھر کے حالات کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوششوں میں ڈھیل نہ آنے دیں اور اگر کوئی آپ کو زیادہ ہی خوش فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرے تو کانگرس کی سربراہ سونیا گاندھی کا یہ بیان دکھادیں جو انہوں نے ۱۹۹۶ء میں بمبئی کی ایک تقریب میں ''پاکستانی ثقافتی میلے'' کو بھارت کی ثقافتی فتح سے تعبیر کرتے ہوئے کہا تھا"۔

ہم نے اپنی ثقافت پاکستان میں متعارف کروا کر ایک بڑی جنگ جیت لی ہے جو ہتھیاروں سے جیتنا ناممکن تھا۔اس ثقافتی یلغار نے پاکستان کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنگ کی حکمتِ عملیوں میں تبدیلی آئی ہے پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا کیونکہ چند مذہبی جنونیوں نے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا آج کی تاریخ اور حقائق گواہ ہیں کہ ہم نے اسلامی ملک میں اپنی ثقافت متعارف کرا کے اس دو قومی نظریے کو پاش پاش کر دیا ہے جس کی بنیاد پر یہ ملک قائم ہوا تھا۔آج پاکستان کا بچہ بچہ بھارتی ثقافت کا دلدادہ ہے اب ہمیں پاکستان کو ہتھیاروں کا نشانہ نہیں بنانا پڑے گا اور کچھ عرصہ کے بعد مجھے یقین ہے کہ ہمارے ایک ہی دھکے سے پاکستان شکست وریخت کا شکار ہو جائے گا"۔

یہ ہے اس امن ومحبت اور دوستی کے پیچھے چھپے ہوئے محرکات۔اب بھی اگر کوئی نجم سیٹھی کی قیادت میں جانے والا گروہ عاصمہ جہانگیر' میر حاصل بزنجو' شیری رحمان' اقبال حیدر' اے ایچ نیّر' فاروق طاہر' عائشہ صدیقہ' آئی اے رحمان اور مدیحہ گوہر' مسلم لیگ ن کے احسن اقبال ہی اس سوال کا جواب دیں گے کہ بلوچستان تو پاکستان میں ہے اور اسے مقبوضہ کشمیر کی برابر کی حیثیت میں اور وہ بھی بھارت میں ڈسکس کرنے کا کیا مقصد ہے؟ ہم سب اس بات سے واقف ہیں کہ بلوچستان اور پاکستان کے دوسرے علاقوں میں دہشت گردی کے پیچھے بھارت کا ہاتھ ہے اور اس سلسلے میں ان دہشت گردوں کو ہر قسم کی امداد فراہم کرنے میں اس کو اسرائیل کے علاوہ کچھ دوسری قوتوں کی آشیر باد بھی اسے حاصل ہے۔

''راگ ورنگ'' اور مادر پدر آزاد قسم کی آزادی کے متوالوں کو ہوش میں آنا چاہئے' اپنے جوہر اور اپنی اصل کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ہمیں یقیناً دوستی' رواداری اور محبت بڑھانے اور بھائی چارے کی کوششیں کرتے رہنا چاہئے لیکن اپنی حد یا سرحد کا احترام بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہئے۔جس طرح تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے' اسی طرح دوستی اور محبت بھی اسی صورت میں ممکن بن سکتی ہے اگر فریقین کھلے دل سے برابری کی بنیاد پر' نیک نیتی اور خلوصِ دل سے ایسا چاہتے ہوں۔ایسا نہ ہو کہ یہ جذباتی سادہ دل بندے ''بغل میں چھری اور منہ میں رام رام'' کی طرح کسی المیے کا شکار ہو جائیں۔دوستی سر آنکھوں پر' دشمنی کسی سے بھی نہیں لیکن یہ ایک لمحے کے لئے بھی مت بھولیں کہ اپنی آزادی کی حفاظت نہ کرنے والے غلامی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔رہے نام میرے رب کا جس نے ایک معجزاتی ریاست پاکستان کو ایک خاص مقصد کی تکمیل کے لئے بنایا اور اس کا وجود تا قیامت رہے گا چاہے اس کے دشمنوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو!

بروز جمعرات ۱۲ محرم الحرام ۱۳۴۱ھ ۷ جنوری ۲۰۱۰ء

سرحد پار کے دوست

ان دنوں پاکستان کا ایک خیر سگالی وفد بھارت کے دورے پر ہے جہاں ''خود مختاری کا مسئلہ بلوچستان اور کشمیر'' کے موضوع پر سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس سیشن کی صدارت سابق چیف جسٹس دہلی ہائی کورٹ راجندر اسچر اور مقررین میں پاکستان کی طرف سے عاصمہ جہانگیر، میر حاصل بزنجو اور ایڈیٹر روزنامہ آجکل کوئٹہ سراج مالک نے حصہ لیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے عنوانات پر تبادلہ خیال کے لئے درجن بھر پاکستانی، نجم سیٹھی کی معیت میں بھارت گئے ہیں اور پاکستان میں اس خیال کے سرخیل نجم سیٹھی ہیں جن کے مزاج سے ساری قوم واقف ہے۔ پاکستان میں کچھ اخبارات کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ پنجاب کے گورنر سلمان تاثیر کی شراکت سے ایک ٹیلیویژن چینل کے بھی مالک ہیں اور ان کے اپنے اخبارات سے ان کی پالیسیوں کا پتہ چلتا رہتا ہے بلکہ یہاں تک کہ دوست احباب کو ان کے اخبار سے امریکا اور اس کے تمام اتحادیوں کے عزائم کا پتہ چلتا رہتا ہے۔

کمانڈو پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں بھی ایسے ہی خیر سگالی کے وفود کا ہر آئے دن تبادلہ ہوتا رہتا تھا لیکن اب کچھ دیر سے یہ سلسلہ سست روی کا شکار تھا جس کو نجم سیٹھی نے دوبارہ کسی کے اشارے پر شروع کیا ہے۔ یہ وفد وہاں کیا کارنامہ سرانجام دے گا اس کی اطلاع بھی اگلے چند دنوں میں سامنے آجائے گی لیکن کچھ برس پہلے ایک ایسا ہی خیر سگالی کا پارلیمانی وفد کلدیپ نیئر کی قیادت میں پاکستان آیا تھا۔ اس وفد کے ایک مسلمان رکن نے اپنی تقریر میں کہا کہ پاکستان کو یہ بات نہیں بھولنا چاہئے کہ اگر کشمیر میں چند لاکھ مسلمان بستے ہیں تو انڈیا میں مسلمانوں کی تعداد کروڑوں میں ہے بلکہ پاکستان سے بھی زیادہ ہے، لہٰذا چند لاکھ کشمیری مسلمانوں کی خاطر کروڑوں بھارتی مسلمانوں کی جان کو خطرہ میں ڈالنا کوئی دانشمندی نہ ہوگی۔ کل بھارتی ٹی وی پر ایک دفعہ پھر ایسی ہی رائے کو اسی مسلمان رکن اسمبلی کی طرف سے پاکستانی وفد کے سامنے دہرایا گیا۔ مجھے پتہ نہیں کہ وفد کا کوئی رکن اس کا کیا جواب دے گا لیکن بہتر یہ ہے کہ اس کا جواب ضرور دیا جائے۔

یہ بات بہت مضحکہ خیز ہے اور ایک رکن اسمبلی کی زبان سے یہ بات مجھے اور بھی زیادہ عجیب لگی۔ ۱۹۴۷ء میں بھارتی مسلمانوں نے اپنا حقِ خود ارادیت استعمال کرتے ہوئے بھارت میں رہنے کا فیصلہ کیا جبکہ کشمیری مسلمان اپنے اس حق کے لئے ابھی تک جدوجہد کر رہے ہیں، چنانچہ بجائے اس کے کہ یہ مسلمان رکن اسمبلی اپنے کشمیری مسلمان بھائیوں کو بھی ان کا حق دلانے کے لئے بیس کروڑ بھارتی مسلمانوں کا اخلاقی ووٹ ان کے پلڑے میں ڈالیں، الٹا انہیں کشمیر میں متعین سات لاکھ بھارتی فوج کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔

میرے اس دوست کا استدلال کئی اور حوالوں سے بھی بہت بے معنی ہے، پہلی بات یہ کہ اگر پاکستان اخلاقی، سیاسی اور سفارتی سطح پر کشمیریوں کی حمائت کرتا ہے اور بھارتی حکومت یا وہاں کی کچھ متعصب ہندو سیاسی جماعتیں اس کا بدلہ بھارتی مسلمانوں سے چکاتی ہیں تو اس رکن اسمبلی کو یہ بات بھارت والوں سے کہنا چاہئے کہ آپ کس اصول کی بنا پر ہمیں انتقام کا نشانہ بنا رہے ہیں، ہم تو آپ کے وفادار شہری ہیں، ہم نے اپنا حق خود ارادیت استعمال کرتے ہوئے اپنے لئے ایک سیکولر ملک کا انتخاب کیا تھا، یہ آپ کا کیسا سیکولرازم ہے کہ آپ ہمیں ہی اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنانے لگ گئے ہیں، محض اس لئے کہ پاکستان

کشمیریوں کی حمائت کرتا ہے اور ہم بھی مسلمان ہیں؟ مگر یہ رکن اسمبلی الٹا پاکستان اور پاکستانیوں کو مشورہ دے رہا ہے کہ وہ صرف ''چند لاکھ'' کشمیری مسلمانوں کے لئے ان کی جانیں خطرہ میں نہ ڈالیں۔ ان کا متذکرہ استدلال اس حوالے سے بھی بے معنی ہے کہ اپنی جان بچانے کے لئے دوسروں کو موت کے منہ میں دھکیلنا دنیا کے کسی ملک، کسی قانون اور کسی مذہب میں جائز تو کیا، اس کا تصور بھی محال ہے۔

اس مسلمان رکن اسمبلی کا یہ مفروضہ ہی سرے سے غلط ہے۔ ان سے پوچھا جائے کہ کشمیر میں اب تک ایک لاکھ سے زائد معصوم اور بے گناہوں کو شہید کیا جا چکا ہے، ہزاروں معذور ہو چکے ہیں، کتنی ہی عصمت مآب بیبیوں کی عصمتیں لوٹی جا چکی ہیں، وہ اس ظلم و ستم کا ملبہ کس ''کشمیر'' پر ڈالیں گے؟ بھارت کی سیکولر حکومت میں سکھوں کے مقدس گولڈن ٹیمپل کی بے حرمتی کی گئی، کیا اس کی وجہ بھی پاکستان کی کشمیر پالیسی تھی؟ اسی کی دہائی میں دہلی میں سکھوں کا قتلِ عام کیا گیا، ان کے ہاتھوں کو پیچھے باندھ کر ان کے گلے میں ٹائر ڈال کر اس کو آگ لگا دی گئی، کیا اس کی وجہ بھی پاکستان کی کشمیریوں کی حمائت تھی؟ بھارت میں ہزاروں ہندو شودروں کو زندہ آگ میں جھونک دیا گیا، کیا اس کی وجہ بھی یہ تھی کہ پاکستان کشمیری مسلمانوں کی حمائت کیوں کرتا ہے؟ بے شمار مسیحی انہی متعصب ہندوؤں کے ہاتھوں قتل کر دیئے گئے، ان کی عبادت گاہوں کو جلا دیا گیا، کیا اس کی ذمہ داری بھی پاکستان پر ڈالیں گے؟ بابری مسجد ڈھانے والوں نے کشمیر کی وجہ سے اس مسجد کو ملبے کا ڈھیر بنایا تھا؟ احمد باد کے کسی ہندو بلوائی سے پوچھیں جس کے ہاتھ بیسیوں مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں کہ کیا تم نے بچوں عورتوں اور بوڑھوں کو اس لئے شہید کیا کہ پاکستان کشمیریوں کی حمائت کرتا ہے تو وہ لگی لپٹی رکھے بغیر اس کی نفی کرے گا، اس نے یہ گھناؤنا فعل اس لئے کیا کہ وہ بھارت سے مسلمانوں کا وجود ختم کر کے وہاں رام راج قائم کرنا چاہتا ہے۔

ہندوؤں کی ایک بہت بڑی تعداد کی مسلم دشمنی اور اس حوالے سے پاکستان دشمنی کا ایک ثبوت وہاں چلنے والے کچھ مخصوص ٹی وی چینلز اور پے در پے بننے والی وہ فلمیں ہیں جن میں پاکستان کے خلاف نہائت زہریلا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ نئے سال کی ایک تقریب میں جہاں ممبئی کی فلم انڈسٹری کا ایک ممتاز گیت نگار بھی مدعو تھا، نے بڑی لجاجت کے ساتھ وہی گھسا پٹا پروپیگنڈہ کرنے لگا تو میں نے اس کی توجہ اس شکائت کی طرف مبذول کروائی تو اس نے جواب دیا ''یہ بھیڑ چال ہے، عوام نے اس نوع کی فلموں کو پسند کیا جس کے نتیجے میں ان فلموں کی بہتات ہو گئی۔'' فلمساز انہی موضوعات پر فلمیں بنائیں گے جن موضوعات کی پبلک میں مانگ ہو گی۔ سو بھارتی عوام کو وہاں کے میڈیا نے پاکستان کا دشمن بنایا ہوا ہے چنانچہ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں طلبہ کی یونینوں کے الیکشن پاکستان دشمنی اور رام راج نعروں پر جیتے جا رہے ہیں۔ ایک فرقہ پرست جماعت بھارتی عوام کے ووٹوں سے ہی ہمیشہ برسر اقتدار آتی ہے۔ چنانچہ یہ رکن اسمبلی اگر مظلوم کشمیریوں کی حمائت میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں یا اللہ کی طرف سے ایسی توفیق ہی سلب ہو چکی ہے تو انہیں خاموش رہنا چاہئے یا کم از کم یہ نہیں کہنا چاہئے کہ پاکستان انہیں بھارتی فوج کے ہاتھوں ظلم سہنے کے لئے اکیلا چھوڑ دے۔ یہ ایک ظالمانہ رائے ہے جو خود ایک مظلوم اقلیت کے ایک نمائندہ کی طرف سے ایک شرمناک رائے ہے۔

منیر نیازی کہا کرتے تھے کہ ''نقاد حضرات انہیں پہلے عدم توجہ سے مارتے تھے اور اب توجہ سے مارتے ہیں۔'' پاکستان اور بھارت کے خود ساختہ دانشوروں کا بھی یہی حال ہے۔ پہلے کبھی کشمیر کا نام ان کی زبان پر نہیں آتا تھا اور اب آتا ہے تو تو اس طرح آتا ہے جیسے کونین کی گولی منہ میں آ گئی ہو۔ اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ دونوں ممالک ماضی کی تلخیاں فراموش کرنے کی کوشش کریں اور یہ عمل اسی وقت شروع ہو سکتا ہے جب بھارت

کشمیر سمیت دوسرے اہم مسائل کے حتمی حل پر آمادہ ہو کر سنجیدہ مذاکرات کی میز پر بیٹھے، مگر پاک بھارت تعلقات کی آڑ میں کچھ حلقے پاک بھارت سرحد کی نفی، حیلے بہانے سے کرنے لگے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ ہم بالکل ایک جیسے ہیں، کبھی دیوارِ برلن کی مثال دیتے ہیں، کبھی یورپی یونین کو درمیان میں لے آتے ہیں، حالانکہ ان تمام مثالوں میں کشمیر ایسا تنازع کسی بھی ملک کے درمیان موجود نہیں تھا، ان سب کا کلچر ایک ہے، زبان ایک ہے، مذہب ایک ہے اور ان میں سے کوئی ''بڑا بھائی'' بننے کے چکر میں نہیں جبکہ پاکستان اور بھارت کا معاملہ بہت پیچیدہ ہے، یہ حل ہوتے ہی حل ہو گا بشرطیکہ ان دانشوروں نے بظاہر محبت بھری مگر دراصل نفرت آمیز باتوں اور سیمیناروں سے حل ہونے دیا۔

ایک پوری تاریخ کو یہ کہہ کر جھٹلانے کی کوشش کرنا کہ یہ انگریزوں کی سازش تھی، کروڑوں پاکستانیوں اور ان کے شہیدوں کی توہین کے مترادف ہے۔ سرحدوں کے خلاف باتیں کرنے والے لوگ نہائت سفاک ہیں، وہ نہیں جانتے کہ جب ملکوں کے نقشے بدلتے ہیں تو کتنے لوگ خون میں نہا جاتے ہیں، کتنی عصمتیں لٹ جاتی ہیں اور کتنے دل زخمی ہو جاتے ہیں۔

رہے نام میرے رب کا جو بندوں کے مقابلے میں بہتر تدبیریں جانتا ہے!

سرحد پار کے مرے دوست مجھے کہتے ہیں
سرحد کا جھگڑا ہی کیا ہے
ہم سب ایک ہیں
سب اچھا ہے
ہر ایک سرحد بے معنی ہے
دنیا کی تخلیق سے اب تک
سرحدیں بنتی مٹتی رہی ہیں
یونہی بنتی مٹتی رہیں گی
ان کو چھوڑ
کانوں نے جو آج سنا ہے
اور آنکھیں جو جنم جنم سے دیکھ رہی ہیں
ان کے بیچ کی حد فاضل بہت بڑی ہے
تارے مٹھی میں بھر لینا
اچھا تو لگتا ہے لیکن
کون ستارے چھو سکتا ہے''
''راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے
جذبے کے آفاق بڑے ہیں

لمحے کی سفاکی لیکن اس سے صدیوں آگے کی ہے
خواہش کے کہرے کے پیچھے
درد کی ہر سرحد روشن ہے
اک سرحد کشمیر کی سینہ پیٹتی ماوں کے آنسو ہیں
بہنیں اپنے ماں جایوں کو
بین سے جب رخصت کرتی ہیں
پربت شور مچاتے ہیں
ان نوحوں کو دہراتے ہیں
اک سرحد
گجرات کی گلیوں کی لاشیں ہیں
تھوڑی دفن ہوئی ہیں
باقی دو ٹانگوں پر چلتی ہیں
لاکھوں سرحدیں بے آواز ہجوموں کی ہیں
جن کے ہونٹ تو ہلتے ہیں
لیکن الفاظ نہیں ہوتے
سرحد اور کسے کہتے ہیں؟
خون بہت بولا کرتا ہے
خون کی بولی تیرے میرے
خیر سگالی کے لفظوں سے زور آور ہے
اتنی سرکش، اتنی باغی
جیسے بیچ بھنور کا پانی
پنج تارہ ہوٹل کے دوستی سیمینار میں
آتے جاتے ڈیلیگیٹس کے امرت جیسے میٹھے فقرے
خون کی بولی کے طوفاں میں
تنکے بن کر بہہ جاتے ہیں

بروز جمعۃ المبارک ۲۲ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۸ جنوری ۲۰۱۰ء

پہلوان

ہم سب اسے پہلوان کہتے تھے، وہ ایک لحیم شحیم گرانڈیل جوان تھا، اس کی لمبی لمبی مونچھیں، بھاری بھرکم آواز اور موٹے موٹے ہاتھ تھے۔ وہ جب بوسکی کا کرتہ، رنگین کناری کا لاچہ اور پاوں میں چمکدار کھسہ پہن کر باہر نکلتا تھا تو دور دور تک سنسنی پھیل جاتی تھی۔ پورے محلے میں پہلوان کی بڑی دہشت اور دبدبہ تھا لیکن جونہی پہلوان اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھتا تھا، یہ دبدبہ، یہ دہشت جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی تھی، اس کی آواز بھرا جاتی تھی، مونچھیں لٹک جاتی تھیں اور تنی گردن جھک جاتی تھی۔ پہلوان جتنی دیر گھر رہتا تھا، اندر سے برتن ٹوٹنے، چیخنے چلانے اور رونے دھونے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ اس میں پہلوان کا کوئی قصور نہیں تھا، اللہ نے مسز پہلوان کو ذرا تلخ، غصہ آور اور شکی مزاج بنایا تھا لہٰذا وہ برتن ٹوٹنے، چیخنے چلانے اور رونے دھونے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتی تھی اور بعض اوقات ان آوازوں میں اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی آوازیں بھی کورس کی شکل میں شامل ہو جاتی تھیں۔ ایسے میں پہلوان ہانپتا کانپتا، پسینے میں شرابور ہاتھوں اور چہرے پر خراشوں کا نشان لئے گھر سے باہر چوک میں پان والی دوکان کے ایک سٹول پر پناہ لیتا تھا۔

اگر کبھی بات حد سے گزر جاتی تو ہم سب دوست مل کر پہلوان کو غیرت دلانے کی کوشش کرتے تو وہ آہستہ آہستہ رکے رکے لہجے میں کہتا "چھ بچوں کو لیکر کہاں جاوں گا" اور ہمارے پاس پہلوان کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ پہلوان گھریلو تشدد یا ڈومیسٹک وائلنس کی مکمل مثال تھا۔ پورے شہر میں پہلوان کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن گھر میں قدم رکھتے ہی اس سے وہ سلوک ہوتا تھا جس طرح ہٹلر کے ہاتھوں پیرس کا ہوا تھا یا پھر زرداری صاحب اور ان کے ہمنواوں کے ہاتھوں ملکی خزانے کا۔ ہم لوگ کبھی غلطی سے پہلوان کو چھیڑنے کی خاطر اس معاشرے کو "مین ڈومینٹنگ سوسائٹی" کہہ دیتے تو پہلوان اس کا برا ماننے کی بجائے مسکرا کر کہتا کہ ابھی تم نے اس کڑوے میوہ کا مزا نہیں چکھا اور کبھی تڑپ کر کہتا کہ "یار و تم تو ایسا نہ کہا کرو۔

پاکستانی معاشرے کی ایک تصویر پہلوان ہے، بڑی حد تک ہم یعنی پہلوان کے دوست بھی اس گروہ میں شامل ہیں۔ ہماری بھی "ٹیں" دہلیز پر پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے۔ ہماری جرات بھی گلی تک محدود ہوتی ہے، ہم بھی گھر میں قدم رکھتے ہیں تو عہد قدیم کے غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر بیوی کی بارگاہ میں مودب حاضر ہو جاتے ہیں اور باقی زندگی اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں بسر کرنے کا حلف اٹھاتے ہیں لیکن اس معاشرے میں ایسے ہزاروں لاکھوں مرد ایسے بھی موجود ہیں جو گلی میں قدم رکھتے ہیں تو گھر کے سکون میں زلزلہ آجاتا ہے، جو اپنے ساتھ سسکیوں چیخوں اور آہوں کا سیلاب لیکر آتے ہیں۔ اس ملک میں کتنی عورتیں ہیں جن کے لئے گھر عقوبت خانوں سے بدتر ہیں، جن کی خواب گاہیں ٹارچر سیل ہیں، جن پر جلتے چولہے الٹ دیئے جاتے ہیں، جن کے جسم سگریٹوں سے داغے جاتے ہیں، جنہیں مرد باہر جاتے ہوئے چارپائیوں سے باندھ دیتے ہیں، جنہیں تیزاب سے جلایا جاتا ہے، جن پر کھولتا ہوا پانی اور گرم ہانڈیاں الٹ دی جاتی ہیں، جنہیں جانوروں کے باڑوں میں کھونٹوں سے باندھا جاتا ہے، جو ونی ہوتی ہیں، جو کاروکاری ہوتی ہیں۔

اس ملک میں ماچھکہ کا قبرستان ہے جس میں سینکڑوں عورتیں کفن اور جنازے کے بغیر دفن ہیں، جو کاروکاری قبرستان کہلاتا ہے۔ اسی ملک میں ایسی

ہیں جنہیں جائداد کے لئے قرآن سے بیاہ دیا جاتا ہے، جنہیں شادی کے نام پر جاتی ہیں۔ جہاں ایسے جہنم میں پھینک دیا جاتا ہے جہاں ان کی ہڈیاں تک گل سڑ اس ملک میں علاقے کا ایک سردار زندہ عورتوں کو خونخوار کتوں کے آگے پھینکنے کا نہ صرف حکم دیتا ہے بلکہ ایسے خونخوار منظر سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے، ملک کے حکمرانوں میں اس کا بال تک بیکا کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی اور ایسے لوگ باقاعدہ میڈیا کے سامنے سینہ پھلا کر اپنے علاقوں کے ان قوانین کا باقاعدہ دفاع بھی کرتے ہیں، جہاں اس ملک اس معاشرے میں نو دس سال کی بیٹیاں ستر ستر سال کے بوڑھوں سے بیاہ دی جاتی ہیں۔

اس ملک میں حدود کے نام پر ہر مہینے ۸۰ سے زائد بے گناہ بچیاں قتل کر دی جاتی ہیں، جس میں ۲۰۰۹ء میں ۲۰۳۷۴ لڑکیاں گھریلو تشدد سے مجبور ہو کر گھروں سے بھاگ گئیں، اس ملک اس معاشرے میں نابالغ بچے اور بچیاں ماوں اور باپوں کے تشدد کا شکار ہیں جس میں بیگمات چھوٹے نوکر اور نوکرانیوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیتی ہیں، جس میں ساس سسر بہو کے ہاتھوں تنگ آ کر مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس ملک اس معاشرے میں ایسی ناخلف اولاد بھی موجود ہے جو اپنے بوڑھے والدین کو اپنے ہی گھروں میں نوکر بنا لیتے ہیں، جو اپنی ماں کو لوہے کی گرم سلاخوں سے داغتے ہیں اور جائیداد ہتھیانے کے لئے اپنے بوڑھے والد کو کمرے میں بند کر دیتی ہیں اور وہ بیچارہ بھوک اور پیاس سے بلک بلک کر دم توڑ دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب، کوئی آئین، کوئی قانون اور کوئی معاشرہ اس ظلم کی اجازت نہیں دیتا لیکن ہمارے ملک میں کہیں مذہب، کہیں غیرت، کہیں کہیں روایت اور کہیں رسم کے نام پر یہ ظلم ہو رہا ہے ،عورتیں، بوڑھے اور بچے، چار دیواری اور ایک کمزور سی چھت کے نام پر پوری زندگی بلیک میل ہوتے رہتے ہیں، موت کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کیا یہ لوگ اس ملک کی رعایا نہیں، کیا یہ مظلوم لوگ ہماری، ہمارے معاشرے اور ہماری حکومت کی ذمہ داری نہیں؟؟ ہم بڑے سے بڑے ظلم کو ''گھریلو مسئلہ'' قرار دیکر معاف کیوں کر دیتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں، یہ لاکھوں کروڑوں لوگ کس کی ذمہ داری ہیں؟ مگر افسوس مجھے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملتا۔ این آر او کو جب سے اعلی عدلیہ نے کالعدم کیا ہے حکومت کی ترجیحات اس دن سے بالکل مختلف ہو گئیں ہیں۔ پہلوان رحمان ملک نے بڑے رعب کے ساتھ اسلام آباد میں اعلان کئے لیکن جونہی ایم کیو ایم کے ساتھ کراچی میں ملاقات ہوئی، پہلوان رحمان ملک نے خوب پینترہ بدلا، ایم کیو ایم کو خوش کرنے کے لئے کئی دھمکیوں سے بھی کام لیا، بالکل اسی پہلوان کی طرح جس کا میں نے مضمون کی ابتدائی سطروں میں ذکر کیا اور اب اپنے ہی ساتھیوں سے منہ چھپا چھپا کر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ''یار و تم تو ایسا نہ کہا کرو۔'' لیکن کیا لیاری سے کامیاب ہونے والے پہلوان نبیل گبول، پہلوان عبدالقادر بلوچ پہلوان رحمان ملک کا ''ترلا'' مان لیں گے؟ آخر پہلوان ہی پہلوان کے کام آتے ہیں۔

میں ایک دفعہ پھر اپنے ان مخیر حضرات سے اپیل کرتا ہوں کہ آگے بڑھیں۔ پہلے تجرباتی طور پر کسی پسماندہ شہر کا انتخاب کر کے ایسی کونسل کا قیام عمل میں

لایا جائے جو لوگوں کو گھریلو تشدد سے باز رکھ سکیں، جو گھریلو تشدد کے شکار مردوں، عورتوں بوڑھوں اور بچوں کی دادرسی کر سکیں، انہیں گھروں میں قائم عقوبت خانوں سے نکال سکیں، انہیں آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کا موقع فراہم کریں۔ اپنے اپنے علاقوں کے ایم این ایز کو اس حساس معاملہ پر قانون سازی کے لئے مجبور کریں تاکہ ان قوانین کے تحت سارے ملک میں ایسے ادارے وجود میں آسکیں جہاں ان مجبور و مقہور لوگوں کی دادرسی ہو سکے۔ ان کونسلوں میں ہمدرد اور تجربہ کار پروٹیکشن آفیسر تعینات کئے جائیں، ان کی معاونت کے لئے مقامی عدالتی اہلکار ہوں، مصالحتی ٹیمیں ہوں جو شکایات پر مظلوموں کی فوری مدد کر سکیں، گھروں میں مصالحت کا بندوبست کر سکیں، زخمیوں کی طبّی امداد کا معقول انتظام ہو، جنہیں جان کا خطرہ ہو ان کو مکمل تحفظ فراہم کیا جا سکے۔

جس کے مال کا نقصان ہوا ہو اسے معاوضہ لیکر دیں، جسے قانونی تحفظ درکار ہو اسے قانونی مشاورت دیں، یہ کونسلیں میاں بیوی کے جھگڑوں کو قتل و غارت گری تک پہنچنے سے روکیں، عورتوں کو ونی اور کاروکاری کی مکروہ رسوم سے نجات دلائیں، گھریلو تشدد کے شکار بچوں کو تحفظ دینے کا بندوبست ہو۔ یہ کونسل خود پولیس کا کام قطعی طور نہ کرے لیکن اگر اسے کسی موقع پر پولیس کی مدد درکار ہو تو قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے پولیس کی معاونت بھی انہیں میسر ہو۔ پتہ نہیں ایسا ایکٹ کب قانون ساز اسمبلی سے پاس ہو کر ان مظلوم و مقہور لوگوں کی اشک شوئی کرے گا؟ ایسا نہ ہو کہ یہ ایکٹ بھی غلط فہمی اور بدنیتی کا شکار ہو کر پیدائش سے پہلے ہی انتقال کر جائے یا پھر اسے پھلنے پھولنے کا موقع ہی نہ دیا جائے، یا اس کا حال بھی نے نظیر انکم سپورٹ کی طرح صرف اپنے حواریوں اور سیاسی مقاصد کے لئے استعمال ہونا شروع ہو جائے۔

لیکن جہاں تک اس کے جواز کی بات ہے اس معاشرے کو ایک ایسے قانون، ایک ایسے ادارے، ایک ایسی کونسل اور ایک ایسے ایکٹ کی ضرورت ہے، کیونکہ معاشرے گھروں سے بنا کرتے ہیں اور جن معاشروں میں گھر تشدد، ظلم، جانبداری اور عدمِ مساوات کا شکار ہو، وہ معاشرے کبھی صحت مند نہیں ہو سکتے۔ میرا یہ ایمان ہے جن معاشروں، جن ملکوں کے گھروں میں ایسی اسلامی مساوات کے اصول نہیں ہوتے، جن کی چار دیواریوں میں برداشت، تحمل اور قلبی وسعت نہیں ہوتی وہ ملک، وہ معاشرے کبھی عزت اور احترام نہیں پا سکتے۔ ان کی حکومتوں میں کبھی تحمل، برداشت اور وسعت نہیں آ سکتی۔ جب باپ بچے کے ہاتھ سے بچپن میں پلیٹ چھینتا ہے تو وہ بچہ بڑا ہو کر پورے معاشرے کے ہاتھوں سے پلیٹیں چھینتا ہے اور جس سماج میں عورت مار کھانے کے بعد بچے کو دودھ پلاتی ہے وہ معاشرہ کبھی سکون کی نیند نہیں سو سکتا، اس معاشرے میں کبھی عدل، انصاف اور برابری نہیں آسکتی۔

رہے نام میرے رب کا جس نے بڑی وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ " اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ "انصاف کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔

درد کے قصر میں امید کی قندیلیں ہیں
میں نے آباد کئے درد کے صحرا کیسے

بروز سوموار ۲۵ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۱۱ جنوری ۲۰۱۰ء

خونِ ناحق

آج سے ٹھیک تین سال پہلے اس وقت کے قصرِ سفید کے فرعون جارج بش اور نچلی گلی کے نمرود ٹونی بلیر نے کہا تھا کہ ہم دہشتگردوں کو خواہ وہ کشمیر میں ہوں، فلسطین یا چیچنیا، عراق یا افغانستان یا دنیا کے کسی کونے میں ہوں، ان کے منطقی انجام تک پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ یہ بات انہوں نے لندن میں مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہی۔ دونوں لیڈروں نے کہا کہ دہشتگرد ہمیں ہمارے مؤقف سے پیچھے نہیں ہٹا سکتے، ہم ہر سطح پر اور ہر مقام پر انہیں روکیں گے۔ لیکن ٹھیک تین سال بعد ایسے ہی بیان کو پھر دہرایا گیا لیکن اس دفعہ اپنے اس عزم کو دہرانے والے افراد کے صرف نام بدلے ہیں لیکن پالیسی بالکل نہیں بدلی۔

قصرِ سفید کے نئے مکیں باراک اوبامہ ایک اہم میٹنگ میں مصروف تھے کہ ان کو یہ اہم حادثے کی اطلاع پہنچائی گئی کہ سی آئی اے کا سب سے بڑا غیر ملکی اڈہ جہاں سے ساؤتھ ایشیا اور اس کے گرد و نواح کے درجن سے زائد ملکوں میں ڈرون حملوں کو کنٹرول کرنے والا "بیس" کو خوست افغانستان میں ایک خودکش حملے میں تباہ کر دیا گیا ہے اور وہاں پر کام کرنے والے انتہائی مہارت کے حامل افراد کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ اب اس اڈے پر اڑتی ہوئی راکھ اس سپر طاقت کا مذاق اڑانے کے لئے عبرت کے طور پر موجود ہے۔ چند لمحوں کے بعد اوبامہ نے میڈیا کے سامنے اپنے جس غیض و غضب کا اظہار کیا اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اب سرخ آندھی کی شدت اور اس کا رخ کس طرف کو ہے۔ نچلی گلی کے نمرود نے بھی فوری طور پر اس کی تائید میں ایک دفعہ پھر یقین دلایا ہے کہ وہ اپنی پرانی پالیسیوں پر کاربند رہیں گے"۔

امریکا کو اس وقت افغانستان اور عراق میں ایسی ہی مزاحمت کا سامنا ہے جیسی اس کی دو گماشتہ ریاستوں اسرائیل اور بھارت کو فلسطین اور کشمیر میں ہے۔ تینوں ممالک ظلم، وحشت اور تشدد کے ذریعے عوام کو دبانے اور ان کی سرزمین پر اپنا ناجائز قبضہ برقرار رکھنے کے لئے کوشاں ہیں مگر تحریکِ مزاحمت میں کمی آنے کی بجائے تیزی آ رہی ہے۔ تاہم امریکا عوامی نفسیات کا تجزیہ کرنے اور خواہشات کا احترام کرنے کی بجائے، اسے دہشت گردی کا نام دے کر طاقت کے ذریعے تحریکِ مزاحمت کو کچلنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے اور اسی بناء پر اسرائیل و بھارت کی ریاستی دہشت گردی کی بھی حمائت کر رہا ہے جس کا نتیجہ الٹ نکل رہا ہے۔

افغانستان اور عراق پر امریکی حملے کسی اخلاقی و قانونی جواز سے محروم اور طاقت کی فرمانروائی کا نتیجہ تھے۔ آج تک امریکا ۱۱ ستمبر کے واقعات میں افغانستان کی طالبان حکومت اور اسامہ کی القاعدہ تنظیم کے ملوث ہونے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکا۔ عراق پر حملے کا جواز مہلک کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی کو قرار دیا گیا اور صدام حسین کے القاعدہ سے رابطوں کی کہانی گھڑی گئی مگر آج تک نہ تو کیمیائی ہتھیار برآمد کئے جا سکے اور نہ ہی القاعدہ سے رابطوں کا کوئی ثبوت ملا ہے بلکہ خود امریکی اہلکار و عہدیدار اپنی ناکامی اور غلطی کا اعتراف کرنے لگے ہیں۔

جہاں تک کشمیر اور فلسطین کا تعلق ہے تو ان کے عوام حقِ خود ارادیت کی جدوجہد کر رہے ہیں' اس کا اعتراف اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل الگ الگ قراردادوں کے ذریعے کر چکی ہے۔ تین سال پہلے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اسرائیل کی مذمت میں قرارداد پاس کی' جس پر امریکا نے اپنی نہائت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اس کے بعد اقوام متحدہ نے ایسی جسارت نہیں کی۔ کشمیری عوام کے خود ارادیت کے بارے میں منظور ہونے والی دونوں قراردادوں کو بھارت نے نہ صرف تسلیم کیا بلکہ نہرو اور دوسرے عالمی لیڈروں نے بطور ضامن اس قرارداد پر دستخط کئے کہ بھارت ریاست جموں و کشمیر میں رائے شماری کا پابند ہے جس کو بنیا قیادت پچھلی چھ دہائیوں سے زائد اپنی کہنہ مکرنیوں سے لیت و لعل سے کام لیتے ہوئے ابھی تک وہ وعدہ ایفا نہیں کر سکی۔

کشمیری اور فلسطینی عوام نے بھارت اور اسرائیل کی ریاستی دہشت گردی سے تنگ آ کر اپنے اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لئے ہتھیار اٹھائے جبکہ چیچنیا کی آزاد مسلم ریاست کو ٹینکوں سے روند کر روس نے اپنی مقبوضہ کالونی بنا رکھا ہے مگر امریکا اور اس کے اتحادی ان علاقوں میں اپنے حقِ خود ارادیت کے لئے جدوجہد کرنے والوں کو دہشت گرد قرار دیکر یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ان کی اصل جنگ مسلمانوں کے خلاف ہے اور وہ ہر اس طاقت کے معاون اور سرپرست ہیں جو مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے ریاستی دہشتگردی میں مصروف ہے ں۔ القاعدہ کے ساتھ کشمیری فلسطینی اور چیچن عوام کو دہشت گرد قرار دیکر ہر دو کالونیسٹ ذہنیت کے مالک اینگلو سیکسز او بامہ اور گورڈن براؤن نے بعض مسلم حکمرانوں اور دانشوروں کی یہ غلط فہمی دور کر دی ہے اور اپنے ان دعووں کی بھی نفی کر دی ہے کہ دہشتگردی کے خلاف حالیہ جنگ مسلمانوں کے خلاف نہیں اور امریکی قیادت دہشتگردی اور حقِ خود ارادیت کی جنگ میں فرق کرتی ہے۔

اب عالمِ اسلام بالخصوص پاکستان کے حکمرانوں کے سوچنے کی بات ہے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں اور دہشت گردی کے خلاف تعاون کر کے وہ اپنے ہی مسلمان بھائیوں کہ بلکہ کشمیر میں تو اپنی ہی تحریکِ مزاحمت کچلنے کے درپے ہیں۔ کمانڈو مشرف کے زمانے میں تو ہر قسم کی جہادی تنظیموں پر پابندی لگانے کا مقصد دراصل کشمیر کی حمائت سے ہاتھ اٹھانے کا واضح اشارہ تھا اور موجودہ حکومت تو بھارت کے ساتھ دوستی اور بات چیت کے لئے اپنے ہر اصولی مؤقف کو بھول چکی ہے۔ ہمارے حکمراں اپنے عوام کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے لئے بھارت اور امریکا کی جو صفائیاں دے رہے ہیں اس سے کشمیر کے بارے میں ان کی کوششوں کی حقیقت کا بھی صاف پتہ چل رہا ہے۔

امریکا اور اس کے مغربی اتحادی اس انتہا پسندانہ' یکطرفہ مسلم کش پالیسی کا نتیجہ افغانستان' عراق اور دیگر ممالک امریکی اور برطانوی مفادات پر خودکش حملوں کی صورت میں جہاں نکلا وہاں اس جنگ کو اپنی مکارانہ سیاسی چالوں سے پاکستان کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ امریکا اور برطانیہ نے اپنے ایجنٹوں کو یہ ٹاسک دیا ہے جو ان معصوم لوگوں کو یہ کہہ کر گمراہ کر رہے ہیں کہ ڈرون حملوں اور اتحادی افواج کی طرف سے ڈھائی جانے والی تباہی میں پاکستانی افواج

اور پاکستانی علاقے مددگار ثابت ہو رہے ہیں اس لئے تمہارا ہدف اب پاکستان کے سیکورٹی کے ادارے اور پاکستان میں بسنے والے لوگ ہیں جو امریکا اور اس کے اتحادیوں کی مکمل معاونت کر رہے ہیں۔ ان کے پاس براہِ راست امریکا سے بدلہ لینے کے لئے ایک ہی حل ہے کہ وہ پاکستان کے عوام اور سیکورٹی کے اداروں پر خودکش حملے کریں تاکہ پاکستان اس نقصان سے جان بچانے کے لئے اس جنگ سے علیحدہ ہو جائے۔

حال ہی میں امریکا نے ایک اور مسلمان ملک یمن میں دہشت گردی کے خاتمے کے لئے اپنے اس مذموم پروگرام پر عملدرآمد شروع کر دیا ہے جس کی آڑ میں اب سعودی عرب کو بھی پاکستان جیسی کیفیت پیدا کر کے خانہ جنگی میں مبتلا کرنا مقصود ہے۔ آپ کو اگر یاد ہو تو میں آج سے تین سال پہلے پینٹاگون کے کرنل رالف پیٹر کے اس مجوزہ نقشے کی بابت خبردار کر چکا ہوں جس میں کئی مسلم ممالک کے حصے بخرے کر کے کئی نئی مملکتوں کے قیام کو دکھایا گیا ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ مسلمان حکمران ہوش کے ناخن لیں اور فوری طور پر مسلم سربراہ کانفرنس بلا کر ایک موثر اور پائیدار لائحہ عمل مرتب کریں۔ امریکا کے عزائم کو سمجھیں، اسرائیل اور بھارت کی سرپرستی کے نتائج کا درست اندازہ لگائیں اور فلسطین، کشمیر، عراق، افغانستان اور چیچنیا میں تحریکِ مزاحمت کی ناکامی کے مضمرات پر غور کریں اور پھر مستقبل کا کوئی آبرومندانہ اور ٹھوس لائحہ عمل تیار کریں تاکہ ہر جگہ مسلمانوں کا خونِ ناحق بہانے کی موجودہ امریکی پالیسی میں تبدیلی لائی جا سکے۔

یاسر عرفات کا حشر سب کے سامنے ہے اور یہی حشر ان تمام حکمرانوں کا ہو گا جو امریکی جنگ میں حصہ دار بن رہے ہیں۔ مسلمان بھائیوں کی تحریکِ مزاحمت کو کمزور کرنے اور جہاد کو دہشت گردی اور انتہاپسندی قرار دینے کے درپے ہے، یہ تباہی کا راستہ ہے۔ امریکا اور اس کے اتحادی قوتوں کے خلاف اگر برطانیہ میں ایک لاکھ سے زائد گورے چٹے مرد و زن عوام سڑکوں پر آ کر ان قاتلوں کو آئینہ دکھا سکتے ہیں تو آخر ایک ارب پچیس کروڑ مسلمانوں اور ان کے پانچ درجن کے حکمرانوں کو کیوں سانپ سونگھ گیا ہے اور وہ عراق، افغانستان، کشمیر فلسطین اور چیچنیا کے معصوم اور نہتے عوام کے قاتلوں، عالمی دہشت گردوں اور موجودہ دور کے ہٹلروں کے خلاف کیوں صدائے احتجاج بلند نہیں کرتے، جو مل جل کر مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں آخر سید علی گیلانی جیسے مجاہد سے کچھ تو سبق حاصل کریں جو تن تنہا اس پیرانی سالی میں دنیا کے ایک بہت بڑے عقوبت خانے میں اپنی قوم کو آزادی کی منزل کی طرف لیکر رواں دواں ہے۔ سید صاحب! یوں لگتا ہے دنیا بھر کے مسلمان شائد آپ کی قیادت میں جمع ہو کر ہی اپنی گم گشتہ منزل کا گوہر حاصل کر پائیں گے۔ اللہ آپ کا نگہبان ہو!

رہے نام میرے رب کا جو اپنے بندوں کے لئے کافی ہے!

اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا

آئینہ میں نے دکھایا تھا کہ پتھر برسے

بروز جمعۃ المبارک ۲۹ محرم الحرام ۱۴۳۱ھ ۱۵ جنوری ۲۰۱۰ء

کلیجہ جلتا ہے

کشمیر میں مجاہدین کی اخلاقی مدد بھی ہم نے بند کر دی ہے' بھارتی نیتا کہتے ہیں کہ ۹۰ فیصد درندازی بند ہو گئی ہے لیکن اس کے باوجود بھارت کی سات لاکھ فوج اب بھی کشمیر میں موجود ہے اور گاہے بگاہے ان کے مظالم کی داستانیں باوجود چھپانے کے اخبارات میں شائع ہو جاتی ہیں۔ بے گناہ کشمیریوں کے شہید ہونے کی خبریں روزانہ اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔ پیپلز پارٹی کے سابقہ دور میں مشہور ہوا تھا کہ سکھوں کی لسٹیں پاکستانی حکومت نے بھارتی حکومت کو دے دیں تھیں جن کو بھارتی حکومت نے چن چن کر قتل کر دیا۔ سننے میں آیا ہے کہ اب وہی کہانی بڑی خاموشی کے ساتھ کشمیر میں دہرائی جا رہی ہے۔ اجتماعی قبروں کا انکشاف بھی ہو رہا ہے بلکہ ایک اجتماعی قبر سے ڈھائی سو سے زائد بے گناہ کشمیریوں کو دفن کرنے کی اطلاع بھی ملی ہے۔ کشمیری قیادت چیخ چیخ کر پکار رہی ہے کہ بھارتی درندے عورتوں کی عصمت دری کر رہے ہیں' گاوں کے گاوں نذرِ آتش کئے جا رہے ہیں۔ سویلین کو مجاہدین کا نام دیکر شہید کیا جا رہا ہے۔

کمانڈو صدر پرویز مشرف کے دور میں بھارتی حکومت نے متنازعہ سرحد کنٹرول لائن پر باڑھ کا کام مکمل کر لیا تھا حالانکہ اسرائیل کے فلسطین بارڈر پر باڑ لگانے کے عمل کو اقوامِ متحدہ نے غیر قانونی اور غیر اخلاقی قرار دیا تھا اور شائد انٹرنیشنل عدالت میں مقدمہ بھی دائر ہو چکا ہے لیکن کنٹرول لائن کی باڑ پر کسی نے صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ کشمیری مجاہد اب دہشت گرد کہلائے جاتے ہیں لیکن بھارتی درندے جنہوں نے کشمیر میں قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا ہے' وہ دہشت گرد نہیں باوجودیکہ آزادی کی تحریک کو انٹرنیشنل زبان میں کبھی دہشت گردی نہیں کہا جاتا۔ ہم اتنے بے بس اتحادی ہیں کہ ہم صدائے احتجاج بھی بلند نہیں کر سکتے۔ بھارتی لیڈر کشمیر کو اٹوٹ انگ کی گردان گردانتے ہیں' ہم بے بس لبوں پر مہرِ خاموشی ثبت کئے ہوئے ہیں' اس آس پر کہ بھارت گفت و شنید کے لئے تیار ہو جائے۔

گفت و شنید تو کئی بار ہو چکی ہے' مینارِ پاکستان کے سائے تلے محبت کے گیت بھی گائے جا چکے' تاریخی مصافحہ بھی ہو چکا' آگرہ کی یاترہ نے بھی چند دن بڑی دھوم مچائے رکھی' لیکن ان سب کوششوں کو کس نے سبوتاژ کیا۔ سیکورٹی کونسل میں خود بھارت کشمیر کیس لیکر گیا اور یہ اقرار کیا کہ استصواب رائے کرایا جائے گا جو سیکورٹی کونسل نے منظور کیا اور کچھ عالمی طاقتوں نے بطور ضامن اس پر دستخط بھی کئے لیکن بھارت بتدریج کشمیر پر اپنا تسلط مضبوط کرتا چلا گیا اور بالآخر اپنے وعدے کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے انکاری ہو گیا۔ اس کے بعد گفت و شنید میں ثالث مقرر ہوا' وہ بھی فیل ہو گیا اور عالمی برادری نے بھی اپنے فیصلے کا پاس نہیں کیا۔ معاملہ پچھلے باسٹھ سالوں سے جوں کا توں سیکورٹی کونسل کی فائلوں کی بھاری گرد میں اپنی قسمت پر اشک بہا رہا ہے۔

عالمی طاقتوں کو جب پاکستان کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو پاکستانی حکومت کو ممنون کرتے ہوئے جائنٹ سیکرٹری کے لیول پر بیک ڈور مذاکرات کا آغاز کی ہوتی ہے۔ بھارت میں کروا دیتے ہیں جہاں صرف ایجنڈے کے مندرجات کو طے کرنے میں برسوں گزار دیئے جاتے ہیں۔ بھارت کی پالیسی ہمیشہ گفت و شنید کے دوران اگر الیکشن کا معرکہ آ جائے تو پھر مذاکرات کا سارا دارومدار نئی حکومت پر ہوتا ہے۔ الیکشن جیتنے والی حکومت پر یہ لازم نہیں ہوتا کہ

پہلی حکومت کی کو مانے یا نہ مانے۔ایک حکومت نے کشمیر کنٹرول لائن پر باڑ لگانے اور اس کی تکمیل کے دوران جتنے بھی وعدے وعید کئے' باڑ کی آڑ میں جتنے بھی مجاہدین تہہ تیغ کئے' آنے والی حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔بھارتی بنیا اس پالیسی پر عمل کر رہا ہے کہ کشمیریوں کو باور کرایا جائے کہ پاکستان کو اب اس تحریک سے کوئی سروکار نہیں تاکہ کشمیری پاکستان سے بد ظن ہو جائیں' پاکستان کی طرف دیکھنا بند کر دیں اور بھارت کے اندر رہ کر صوبائی خود مختاری کی بات کریں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کے ہاتھ میں جتنے کارڈ تھے وہ اب آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے نکلتے جا رہے ہیں۔

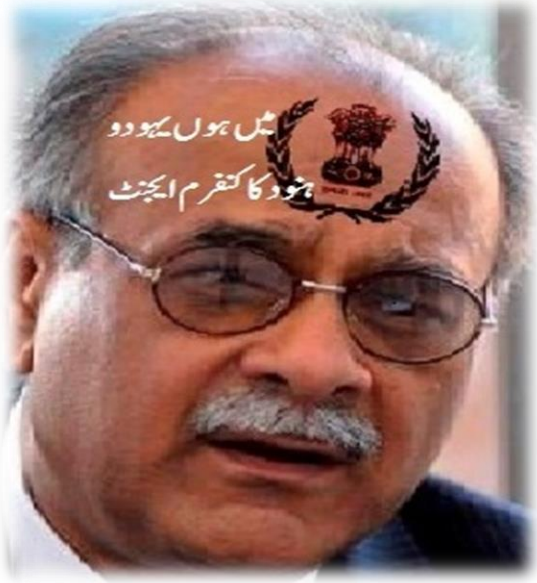

اب بھی وقت ہے کہ سابقہ بھارتی تاریخ کو مد نظر رکھتے ہوئے کشمیر پالیسی بنائی جائے۔زبان سے کہنا کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے' اس پر سمجھوتا نہیں ہو گا' بے معنی الفاظ ہیں جب تک اس پر واقعی عمل نہ ہو۔جب ہم اتحادی بنے تھے تو اس وقت مشرف نے کہا تھا کہ اب ہم چونکہ اتحادی ہیں' کشمیر کا مسئلہ صحیح طور پر حل ہو جائے گا۔مجاہدین دہشت گرد نہیں کہلائے جائیں گے لیکن سب نے دیکھا کہ اتحادی تو مکمل طور پر بھارتی زبان بول رہے ہیں۔انہوں نے پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ پہلے دراندازی بند کرو اس کے بعد بات ہو گی' ہم ہیں کہ رعائت پر رعائت دیتے چلے گئے اور اب حالات یہاں تک آن پہنچے ہیں کہ بھارت پاکستانی کشمیر کا بھی مطالبہ کرنے لگ گیا ہے۔افغانستان میں طالبان کی حکومت پاکستان کے حق میں تھی' ہم نے طالبان کے خلاف ۸۰۱ ڈگری یوٹرن لیکر اعلانِ جنگ کر کے بھارتی تسلط کو افغانستان میں دعوت دے دی' افغان بارڈر جو ہمیشہ سے محفوظ تھا اس کو انتہائی غیر محفوظ کر کے پاکستان کے ہر شہر کو خود کش حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

مشرف نے کہا کہ افغانستان میں اتحادی افواج کابل نہیں پہنچیں گی لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوا۔اب آئے دن پاکستانی علاقوں پر ڈرون حملے ہو رہے ہیں' ان حملوں میں سینکڑوں بے گناہ افراد کو لقمہ اجل بنا دیا جاتا ہے اور انہی کے لواحقین کو خود کش بمبار بنا کر پاکستان کے مختلف شہروں میں قیامت ڈھائی جا رہی ہے۔پاکستانی افواج کے امیج کو بری طرح تباہ کرنے کی سازشیں جاری ہیں۔سوات اور جنوبی وزیرستان کے بعد اورکزئی ایجنسی اور خیبر ایجنسی میں آپریشن جاری ہیں۔پاکستانی افواج نے جس دلیری اور قربانی کے بعد اب تک جن علاقوں سے دہشت گردوں کو قلع قمع کیا ہے وہاں سے بھارت' اسرائیل اور خود اتحادی طاقتوں کی مداخلت کے ثبوت و شواہد مل رہے ہیں۔سننے میں آیا ہے کہ پاکستانی افواج کے پالیسی سازافراد نے بڑے واضح الفاظ میں نہ صرف احتجاج کیا ہے بلکہ امریکا کی ''ڈومور'' پالیسی کو بھی مسترد کر دیا ہے۔

اب ایک دفعہ پھر پاک بھارت مذاکرات کا ڈول ڈالنے کی کوشش ہو رہی ہے اور اسی سلسلے کی ایک کڑی ''کشمیر اور بلوچستان'' کا دہلی میں منعقد ہونے والا سیمینار ہے جس کی قیادت بدنام زمانہ نجم سیٹھی کے سپرد کی گئیں ہیں اور اس میں شریک افراد کی شہرت سے بھی پوری قوم واقف ہے۔یحییٰ خان نکسن کو چین پہنچا کر اس خوش فہمی میں تھا کہ ساتواں امریکی بحری بیڑہ مشرقی پاکستان کو بچالے گا لیکن پاکستان کو دولخت کرنے میں امریکا نے جو کردار ادا کیا اب وہ

بھی ہمارے سامنے آچکا ہے۔امریکی صدر کینیڈی نے بھی ایوب خان سے وعدہ کیا تھا کہ چین بھارت جنگ میں خاموش رہنے پر کشمیر کا مسئلہ حل کروادیا جائے گا لیکن جب چین کی افواج بھارت سے واپس چلی گئیں تو امریکا نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔

تاریخ انسان کو سبق دیتی ہے'اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ہمارے حکمران تو اب اس قدر آگے نکل چکے ہیں کہ بھارتی حکمران کہتے ہیں کہ پاکستان کو تاریخ کو بھولنا ہوگا اور نیا دور شروع کرنا ہوگا جس کے جواب میں امریکی اور بھارتی ایجنٹ یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کررہے کہ دو قومی نظریہ ختم ہو چکا 'اب تو ایک قومی نظریہ ہے۔ کیا ہماری حکومت دو قومی نظریہ کو چھوڑ کر اکھنڈ بھارت تسلیم کرنے کی طرف گامزن ہے؟ کیا مسلمانوں کو شودر بنانے کے ارادے ہیں؟ بھارتی مسلمانوں سے پوچھو کہ بھارت میں ان کی قدر شودروں سے بہتر ہے یا کہ بدتر۔ایسے اتحادی بننے سے کیا فائدہ جس سے ہم ملک ہی گنوا بیٹھیں (خاکم بدہن)۔ ہوش کے دامن کو کبھی نہیں چھوڑنا چاہئے۔ بھارت نے کشمیر پر قبضہ محض اس لئے نہیں کیا کہ پاکستان کا پانی بند کر کے اس کو صحرا میں تبدیل کر دیا جائے بلکہ وہ امریکا اور اسرائیل کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے وجود کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں'انہیں اس بات کا علم ہے کہ پاکستان ہی دنیا میں پہلی جوہری طاقت ہے جس کی وجہ سے عالمِ اسلام کے خلاف اپنے مذموم ارادوں کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا جاسکتا۔

ہم کدھر جارہے ہیں'ملک عزیز کے ساتھ کیا ہونے جارہا ہے'ہر ذی ہوش انسان پریشان ہے کہ اربابِ حکومت کی ترجیحات قوم کی لوٹی ہوئی دولت کو ہر قیمت پر بچانے پر مرکوز ہے چاہے اس کے لئے ملک کے اداروں کو تباہ و برباد ہی کیوں نہ کر دیا جائے۔ پاکستان کے دوستوں اور محسنوں سے ناروا سلوک بند کر کے ملک کے دشمنوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ہوگا۔ یاد رکھیں دشمنوں نے اپنی بھرپور کاروائی کا آغاز کراچی سے شروع کر دیا ہے۔ جس بڑی تعداد میں سیاسی جماعتوں نے اپنے لوگوں میں غیر ممنوعہ بور کے لائسنس تقسیم کئے ہیں اس سے صوبے میں خانہ جنگی کی سی کیفیت کے آثار پیدا ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ حساس اداروں نے بھی اس پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ حکومتِ وقت کو ہر قسم کے اسلحے پر پابندی لگا کر تمام موجودہ اسلحہ فوری واپس لینے میں تاخیر سے کام نہیں لینا چاہئے۔

رہے نام میرے رب کا جو دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے!

چپ ہوں تو کلیجہ جلتا ہے
بولوں تو تری رسوائی ہے

بروز اتوار یکم صفر ۱۴۳۱ھ ۱۷ جنوری ۲۰۱۰ء

فائدہ کس کا؟

مفلسی میں آٹا گیلا ہوتا ہے اور غلامی میں موزے بھیگتے ہیں۔ لیکن اسامہ کی تلاش میں کھوجیوں کے جوتے تلک پھٹ گئے ہیں اور وہ ستم گران کے مرنے پر بھی راضی نہیں ہے۔ کہا جارہا ہے کہ اسامہ اور ان کے ساتھیوں کو افغانستان اور وزیرستان کے ان علاقوں کو بھی کھنگالا گیا ہے جہاں پہلے کبھی کوئی نہیں گیا تھا اور اب سنا ہے کہ سعودی عرب کے پڑوس یمن میں اسامہ اور اس کے جانثاروں کی تلاش شروع ہو چکی ہے۔ دونوں اطراف کے علماء نے مختلف جہتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے فتوے دینا بھی شروع کر دیئے ہیں۔ سعودی عرب کے علماء نے القاعدہ میں شمولیت کو کفر قرار دیا ہے تو یمن کے علماء نے آئندہ حاالات کی پیش بندی کرتے ہوئے ہر بیرونی طاقت کی مداخلت کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا ہے۔

یہ فخر کا نہیں افسوس کا مقام ہے۔ جو علاقے مثالی امن کا مرکز تھے انہیں جوتوں کی دھمک' ڈالر کی کھنک اور میزائل کی لپک سے بھر دیا گیا ہے اور وہاں کے لوگوں کو خود اپنی فوج سے دور کر دیا گیا ہے۔ اہم سوال یہ نہیں کہ ہمارے آپریشن کامیاب رہے ہیں اور ابھی تک ہم مسلسل سایوں کا تعاقب کر رہے ہیں لیکن یہ بات تو اظہر من الشمس کی طرح ہمارے سامنے ہے کہ ہم اسامہ یا اس کا کوئی بھی قریبی ساتھی ان علاقوں سے زندہ یا مردہ گرفتار نہیں کر سکے۔ ان علاقوں میں آپریشن کی اطلاعات کے بعد تو کوئی احمق ہو گا کہ جو وزیرستان یا گردونواح کے کسی علاقے میں بیٹھا فوجیوں کے انتظار میں چلم پی رہا ہو گا۔ دنیا کی سپر طاقت سے مقابلہ کرنے والے اتنے بیوقوف نہیں بلکہ افغان جہاد میں فراستِ مومن کی دولت سے مالا مال لوگ گوریلا جنگ کے تمام رازوں سے بخوبی واقف ہیں الا یہ کہ اللہ کی طرف سے کوئی آزمائش آجائے لیکن اب تک کی تمامتر اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی تک ایسی کوئی آزمائش انہیں چھو کر بھی نہیں گزری۔

اب سوال یہ ہے کہ اسامہ کی گرفتاری سے پاکستان کو کیا فائدہ ہو گا اور اسے کیا ملے گا اور اس کا مستقبل کیسے سنورے گا؟؟؟ ہم سب جانتے ہیں کہ قصر سفید کے فرعون بش نے اپنے تمام وسائل اسامہ کی گرفتاری کی آگ میں اس لئے جھونک دیئے تھے کہ وہ الیکشن جیتنا چاہتا تھا لیکن باوجود تمام کوششوں اور سازشوں کے وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا بلکہ امریکی عوام نے بھی اس کو بے آبرو کر کے قصر سفید سے رخصت کر دیا۔ اب یہ ذمہ داری باراک اوبامہ کے سر آن گری ہے اور اوبامہ بھی ان صہیونی طاقتوں کے شکنجے میں دن بدن پھنستے جارہے ہیں جن کا مقصد اوبامہ کی گرفتاری کے پردے کے پیچھے کچھ اور ہے۔

ایک لحظہ کے لئے ہم تمام انسانی اور اسلامی روایات کو حسبِ روایت پامال کر دیں اور خالص کاروباری ذہن سے سوچیں تو بھی یہ سوال اٹھے گا کہ اسامہ پکڑا گیا تو پھر پاکستان کس چیز پر سودے بازی کرے گا؟ ہماری ضروریات اور افادیت تو خود بخود ختم یا کم ہو جائے گی' تب امریکا کو ہماری ضرورت نہیں رہے گی' نہ صرف یہ کہ ضرورت نہیں رہے گی بلکہ اسے ہمارے ایٹمی پروگرام اور ڈاکٹر قدیر کا اعترافی بیان بھی بے طرح یاد آئے گا اور سب جانتے ہیں کہ کہ ایسا موقع آجائے تو آنکھیں پھیرنے میں امریکا خود اپنا والدِ محترم ہے۔ آزاد اسامہ پاکستان کے لئے بارگینگ فیکٹر ہے۔ یہ فیکٹر عالمی تبدیلیوں کی تمام

ترہولناکیوں سے پاکستان کو بچائے رکھ سکتا ہے۔اسامہ کی سلامتی ہمارے ایٹمی پروگرام کی سلامتی ہے' کشمیر کی تحریک آزادی کو بچا کر رکھنے کی ضمانت ہے اور بھارت واسرائیل کی ممکنہ مہم جوئی کا بلیو پرنٹ ڈرائنگ ٹیبل تک محدود رکھنے کی اہلیت ہے۔

پھر یہ کہ جب تک اسامہ آزاد ہے' دنیا بھر کی اسلامی' انقلابی اور جہادی تحریکیں پاکستان کے بارے میں مخالفانہ یا مخاصمانہ رویہ نہیں رکھیں گی۔چند انفرادی واقعات کو چھوڑ کر مجموعی طور پر دنیا بھر کی دینی اور اسلامی تحریکیں پاکستان کی مجبوری کو سمجھتی ہیں۔وہ افغانستان میں ہماری بے وفائی کے کردار کو نظر انداز کرتی ہیں اور باور کرتی ہیں کہ ہم سے یہ کام بے پناہ دباؤ ڈال کر کروایا گیا ہے لیکن اسامہ کی گرفتاری کی صورت میں ہمدردی کا دھارا پلٹ سکتا ہے۔ساری تحریکیں اس کام میں معاونت کا الزام پاکستان پر لگا سکتی ہیں' وہ پاکستان کے حوالے سے اپنی رائے بدل سکتی ہیں' پھر کیا ہماری فوج یا حکومت اتنے بڑے خطرے کا سامنا کرنے کی اہلیت اور ہمت رکھتی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔وہ تحریکیں جن پر امریکا اپنی تمام تر قہرمانی اور قوت کے باوجود قابو نہیں پا سکا' پاکستان کو شدید مشکلات سے دوچار کر سکتی ہیں۔فوج کی بھی سب سے بڑی طاقت عوام کی پشت پناہی ہوتی ہے اور اس عمل سے عوام بھی کھل کر میدان میں کود جائیں گے اور ہمارے ازلی دشمن ایسے حالات کا بڑی شدت سے منتظر ہیں۔

اسامہ کا اسٹیٹس امریکا جس بلندی پر لے گیا ہے وہاں پہنچنا ہر پرجوش اور مضبوط مسلمان نوجوان کا خواب بن گیا ہے اور امریکا سے لڑنا اس خواب کی تعبیر ہے۔بھارت، اسرائیل اور امریکا نے بڑی مکاری کے ساتھ افغانستان میں اپنی شکست کا ملبہ پاکستان پر گرانے کا منصوبہ بنایا ہے جس طرح ویت نام کی جنگ میں شکست کا ملبہ کمبوڈیا پر ڈالا گیا تھا۔انہوں نے پاکستان میں کئی جنگجوؤں گروپوں کو یکجا کر کے پاکستانی طالبان کے پلیٹ فارم کو محض اس لئے استعمال کرنا شروع کیا کہ ممکن ہے کہ افغان طالبان کے اندر اپنے یہی ایجنٹ داخل کر کے افغانستان میں اپنی ہاری ہوئی جنگ کا پانسہ بدل سکیں اور ممکنہ طور پر القاعدہ کے قائدین کا بھی کوئی سراغ مل سکے لیکن افغان طالبان اس سازش کا شکار ہونے سے بچ گئے۔یہی وجہ ہے کہ افغانستان میں امریکہ سے لڑنے والے طالبان کئی مرتبہ پاکستانی طالبان کی مذمت کر چکے ہیں۔

ان صہیونی طاقتوں اور بھارتی بنئے نے اپنی ان مکروہ چالوں کا ناکام ہوتے دیکھ کر اپنے دوسرے ایجنڈے پر عمل کرتے ہوئے ہمارے قبائلی علاقوں میں شورش پیدا کر کے پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی مکروہ چالوں کا آغاز کر دیا۔ہم سب کو معلوم ہے کہ قبائل کے لوگ ایک مخصوص نفسیات کے حامل ہیں' ان کا ایک اپنا ضابطہ اخلاق ہے جس کی بنیاد مذہب اور رواج پر ہے۔مذہب اسلام رواج مہمان نوازی' پناہ اور انتقام پر مشتمل ہے، یہ پشتون ''کوڈ آف ایتھکس'' کہلاتا ہے جسے پختون ولی بھی کہتے ہیں۔کوئی پٹھان پٹھان کہلوانے کا حقدار نہیں اگر وہ اس ضابطہ کو تسلیم نہیں کرتا یا اس پر عمل نہیں کرتا۔عمل کرنے کی مدت کا تعین عمل کرنے والے کی اپنی سہولت پر ہے لیکن اسے ہر صورت میں یہ قانون ماننا ہے۔

روس کے خلاف جہاد کرنے والے عرب مجاہدوں کی ایک بڑی تعداد نے قبائلی علاقوں میں شادیاں کر لیں تھیں' وہ افغان جہاد کے ختم ہونے کے بعد ان قبائلی علاقوں میں انہی قبائلی معاشروں میں رچ بس گئے تھے' انہی کی زبان بولتے تھے' انہی کے رسوم ورواج کو ادا کرتے تھے' انہی کی مساجد میں نماز پڑھتے اور پڑھاتے تھے' انہی کی طرح کھاتے پیتے تھے' انہیں قبائل نے ضم کر کے وہی درجہ عطا کیا تھا جو کسی قبائلی خاندان کا ہوتا ہے اور یہ سب ہماری مائی لارڈ حکومتوں کے علم' اجازت اور مرضی سے ہوا تھا۔ بعض کیسوں میں تو خود سرکاری عمائدین نے ان کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ ان کے پاس قبائلی علاقوں کی شہریت تھی' شناخت تھی' پاس اور پرمٹ تھے۔ انہیں ہماری حکومتوں نے آنے جانے کی سہولتیں دیں تھیں لیکن وہ اچانک ان صہیونی طاقتوں کے حکم پر دہشت گرد قرار پا گئے اور مشرف انہیں روندنے اور کھدیڑنے کے لئے ساری حکومتی مشینری کو حرکت میں لے آیا اور ایک ایسا آپریشن شروع ہو گیا جس نے ''جیو'' کو کھلا چھوڑا اور ''جینے دو'' ختم کر دیا۔

وہ لوگ جو امن وسکون سے بیٹھے اپنے خاندانوں کے لئے رزقِ حلال کما رہے تھے' کو برا ہیلی کاپٹر کے ڈنک کی زد میں آ گئے اور انہیں دربدر ہونے یا ہتھیار اٹھا کر پہاڑوں پر جا چھپنے پر مجبور کر دیا گیا۔ دوسری طرف اس بھونڈے آپریشن میں قبائل کی عزتِ نفس پامال کر دی گئی اور ان کا ضابطہ اخلاق کچل دیا گیا ۔ جن قبائل نے انہیں پناہ دی تھی' زمینیں دی تھیں' بچیوں کے رشتے دیئے تھے' تحفظ کی چھتری مہیا کی تھی' انہیں ذلیل ورسوا کر کے ان کے گھر گرا دیئے گئے' ان کے بڑوں کو گرفتار کیا گیا اور بھاری جرمانوں عائد کر کے ان کی کمر توڑ دی گئی۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ قبائل خاموشی سے یہ سب پی جائیں گے' اپنے ضابطہ اخلاق کو ملیامیٹ ہوتا دیکھیں گے اور کچھ نہ کہیں گے ؟؟ جو شخص اس سوال کا ہاں میں جواب دیتا ہے وہ قبائل کے بارے میں اس سے بھی کم جانتا ہے جتنا برازیل کا بچہ ۱۰ ۷ ملی میٹر دہانے والے ملٹی بیرل راکٹ لانچر کے بارے میں۔ قبائلی اپنی ہتک برداشت نہیں کرتے' وہ توہین کا جواب دینے کے پابند ہیں' یہ الگ بات ہے کہ اس کے لئے وہ کتنا انتظار کرتے ہیں' یہ بات وہ اور ان کا رب جانتا ہے۔

ابھی تک ہر طرح کی دھونس' دھمکی یاد باو کے باوجود کسی قبائلی نے کوئی عرب مجاہد رضاکارانہ طور پر حکومت کے حوالے نہیں کیا' انہوں گھر جلوا لئے' جرمانے کروا لئے' گرفتاریاں دے دیں لیکن دھوکہ نہیں دیا' کیا موجودہ حکومت بھی یہ اشارے سمجھنے سے قاصر ہے ؟ صہیونی طاقتیں اس راز سے واقف تھیں اسی لئے ڈرون حملوں کا سلسلہ شروع کیا گیا پشتون قبائل کے انتقام لینے کی عار دسے وہ واقف ہیں۔ ان ڈرون حملوں میں شہید ہونے والوں کے عزیزوں کو پاکستانی طالبان فوری ہر طرح کی مدد فراہم کر کے اپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں۔ ان کو فرطِ انتقام میں صرف یہ بات یاد رہتی ہے کہ امریکا اور اس کے تمام دوستوں کو اسی طرح صفحہ ہستی سے مٹانا ہے جس طرح ان کے پیارے ان کی آنکھوں کے سامنے بڑی بے رحمی سے مارے گئے چاہے اس کے لئے خود کش جیکٹ کا ستعمال ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

پارلیمنٹ میں ڈرون حملوں کو بند کرنے کی ایک کھلی وارننگ دیں' عملدرآمد نہ ہونے کی بعد اپنی ائر فورس کو حکم دیں کہ ان ڈرون طیاروں کو مار گرانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اگر ایک دفعہ ایسا ہو گیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پاکستانی طالبان اور خود کش بمبار سے ہمیشہ کے لئے جان چھوٹ جائے گی۔ رہے نام میرے رب کا' جس کو ایک سجدہ کرنے سے باقی تمام سجدوں سے نجات مل جائے گی!

قدم قدم پر صلیبوں کے جال پھیلا دو کہ سرکشوں کو تو عادت ہے سر اٹھانے کی

بروز منگل ۳ صفر ۱۴۳۱ھ ۱۹ جنوری ۲۰۱۰ء

توکل

جب نمرود نے آگ کا الاؤ دہکایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس الاؤ میں جھونک دیا تو چشمِ فلک نے ایک عجیب نظارہ دیکھا کہ ایک ننھا سا ابابیل اپنی چھوٹی سی چونچ میں پانی کے دو تین قطرے دبائے آگ کی طرف بھاگ رہا ہے۔ کسی نے پوچھا ''بھئی ابابیل! اتنی بے تابی میں کہاں اڑے جا رہے ہو؟'' بولا ''نمرود کی دہکائی ہوئی آگ کو بجھانے جا رہا ہوں'' سننے والے نے قہقہہ لگایا اور کہا ''اے ناسمجھ پرندے، تمہاری چونچ میں دبے ان چند قطروں سے نمرود کی آگ کا کیا بگڑے گا؟'' ننھے ابابیل نے جواب دیا ''میں جانتا ہوں میری کمزور سعی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا لیکن مجھے اتنا معلوم ہے کہ جب حشر کے دن نمرود کی آگ بجھانے والوں کی فہرست بنائی جائے گی تو اس میں میرا نام بھی ضرور شامل ہوگا اور ایک ابابیل کے لئے اتنا ہی کافی ہے"۔

دنیا میں مسائل اور معاملات سے نمٹنے کے دو طریقے ہیں، ایک زاویہ نظر ابابیل سے سوال کرنے والوں کا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر مسئلہ آپ کی استطاعت سے بڑا ہے، اگر آپ میں مسئلہ حل کرنے کی صلاحیت موجود نہیں تو پھر آپ کو سرے سے کوشش ہی نہیں کرنی چاہئے، بس خود کو حالات پر چھوڑ دیں اور اللہ کی مدد کا انتظار کریں جب کہ دوسرا مکتبہ فکر ابابیل کی طرح سوچتا ہے، اس کا خیال ہے کہ آپ میں مسئلہ سلجھانے کی قدرت ہو یا نہ ہو بس آپ ابابیل کی طرح چونچ میں دو قطرے پانی بھریں اور آتشِ نمرود کی طرف دوڑ پڑیں، اللہ کرم کرے گا، اگر اس کوشش میں مسئلہ سلجھ گیا تو آپ سرخرو ہو گئے، نہ سلجھا تو کم از کم آپ کا نام نمرود کی آگ بجھانے والوں میں تو ضرور آ جائے گا اور آپ کی بخشش کے لئے کافی ہوگا۔ یہ دوسرا مکتبہ فکر انبیاء کرام، اولیاء کرام اور ان کے ماننے اور چاہنے والوں پر مشتمل ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب انسان کو نیکی کی تلقین کرتے ہیں، اسے اندھیرے میں ایک دیا جلانے، لق و دق صحرا میں ایک گھونٹ پانی سے ایک بیج بونے اور سیلاب کے راستے میں ایک پتھر رکھنے کا حکم دیتے ہیں۔ خود نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ اگر دنیا میں صور پھونکا جا رہا ہو اور میرے ہاتھ میں کسی درخت کی قلم ہو تو میں فوراً وہ قلم زمیں میں گاڑھ دوں گا۔ اسے کہتے ہیں ''کوشش'' اسے کہتے ہیں مثبت پیش رفت۔ یہ حقیقت ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ امر ربی ہے، یہ صرف اللہ کا حکم ہے جس کے باعث بھوک غربت بیماری جہالت اور موت ہے، اللہ ہی حکم سے بادلوں کا رخ پھرتا ہے اور سرسبز شاداب وادیوں میں ریت اڑتی ہے اور اس کے حکم سے چشمے سوکھتے، نہریں خشک ہوتیں اور دریا راستے بدلتے ہیں، اس کی اجازت سے ہڈیوں سے بیماریاں پھوٹتی ہیں اور اس کی رضامندی سے زوال پذیر قومیں عروج پاتی ہیں اور عروج پر کھڑی اقوام زوال کی ڈھلوانوں میں لڑھکتی ہیں لیکن اللہ کے حکم، رب کی رضامندی کے باوجود انسان پر کوشش فرض ہے۔ دنیا کو بہتر بنانے، اپنے حالات، اپنی غربت، افلاس بیماری بھوک کے خلاف لڑنا انسان کا فرض بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔

آپ میڈیکل سائنس کو لیجئے، دنیا کا ہر طبیب جانتا ہے کہ اگر کسی انسان کو کینسر یا ایڈز ہو جائے تو اس کا انجام موت ہے لیکن اس کے باوجود تمام ڈاکٹر آخری وقت تک مریض کا علاج کرتے ہیں، ہارٹ اٹیک کی صورت میں جب مریض کا دل خاموش ہو جاتا ہے، نبض تھم جاتی ہے اور سانس رک جاتی ہے تو اس وقت بھی مریض کو زندہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کے دل میں انجکشن لگایا جاتا ہے، اس کو برقی جھٹکے دیئے جاتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ

میڈیکل سائنس دل کے خاموش ہونے کے بعد بھی مریض کی زندگی سے مایوس نہیں ہوتی، مرنے کے بعد بھی زندگی کی ایک موہوم سی امید قائم رہتی ہے اور یہ امید اسے آخری کوشش پر ابھارتی ہے۔ یہ تو ہے انسان کی کوشش، انسان کی امید، لیکن کیا کیجئے ہمارے صدر زرداری جو کہ چند سالوں میں ۸۱ بلین ڈالر (ایک کھرب ۳۵/ارب روپے) کے اثاثوں کے مالک ہیں، لاہور میں اپنے دربار میں یہ فرمایا ہے کہ ''غربت ختم کرنا میرے بس میں نہیں۔ یقیناً ان کی بات درست ہے، غربت، افلاس، بھوک بیماری صرف اللہ ہی دور کر سکتا ہے، کسی انسان میں اتنی استطاعت نہیں لیکن اس کے باوجود کوشش انسان پر فرض ہے اور جب انسان بے لوث ہو کر کوشش کرتا ہے تو کسی خوشگوار لمحے میں اللہ کو انسان پر پیار آجاتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ یہ ایک کمزور بے بس ابابیل ہے، یہ ابابیل اپنی کمزوری اور بے بسی سے بھی واقف ہے لیکن اس کے باوجود اپنی چونچ میں پانی کے دو قطرے بھر کر آتشِ نمرود چل پڑا ہے، اللہ کو اپنے اس ابابیل کی اطاعت، اس فرمانبرداری پر پیار آجاتا ہے اور وہ آتشِ نمرود کو گلزار ہونے کا حکم دے دیتا ہے اور پھر وہ ابابیل تاریخ کا حصہ بن جاتی ہے۔ خلوص، عاجزی اور اس انکساری میں لپٹی ہوئی کوشش اور دعا اتنی قیمتی ہوتی ہے کہ اللہ سوت کی اٹی میں یوسف تک عنائت کر دیتا ہے، پھر یہ غربت کیا چیز ہے۔

قوموں کو کوشش درکار ہوتی ہے، اعترافِ شکست نہیں، ناکامی کا اعتراف نہیں۔ اس وقت ہمارے حکمرانوں کے ہاں خلوص نام کی کوئی شئے موجود نہیں۔ اپنی حکومت کو بچانے کے لئے اگر تمام ادارے بھی داؤ پر لگانے پڑیں تو بعید نہیں کہ وہ ایسا کر گزریں گے۔ اعلیٰ عدلیہ نے بدنامِ زمانہ این آر او کے بارے میں ۱۶/دسمبر ۲۰۰۹ء کو جو فیصلہ دیا ہے حکومت اس فیصلے کے خلاف نظر ثانی کی اپیل دائر کر چکی ہے اور اب آنے والے حالات اور واقعات کسی نئے سیاسی طوفانوں کا پتہ دے رہے ہیں۔ پچھلے کئی ہفتوں سے عدلیہ کے فیصلوں پر ڈھکے چھپے انداز میں زرداری صاحب اور ان کے ہمنواؤں نے جو کھلی کھلی دھمکیاں دیں، اعلیٰ عدلیہ نے اس کا کیا اثر لیا ہے اس کا پتہ تو چند دن میں پتہ چل جائے گا۔ آصف زرداری تو کبھی آنکھیں نکال لینے کی دھمکی دیتے ہیں اور کبھی اپنی ذات کو ملک کی سلامتی کے لئے لازم و ملزوم قرار دیکر قوم کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ میرا احتساب گویا اس ملک کے خلاف ایک سازش ہے حالانکہ زرداری صاحب اور ان کے ہمنواؤں کو اس بات کی خبر ہے کہ آزاد عدلیہ کی جنگ عوام نے لڑی ہے اور اس جنگ میں سندھ کے افراد نے بھی قربانیاں دی ہیں، اس لئے پاکستانی عوام اب اس ملک میں بلا تخصیص انصاف کا بول بالا دیکھنا چاہتی ہے، وہ کسی سندھ کارڈ کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ ان کے چہیتے وزیر داخلہ سندھ ذوالفقار مرزا نے پاکستان کے بارے میں جو ہرزہ سرائی کی تھی اس کے مضمرات کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا۔

صدر زرداری صاحب نے اپنی ذات کو ''باز'' سے تشبیہ دی ہے اور ترنگ میں آکر اپنی نگاہوں کو خوردبیں قرار دیتے ہوئے چوروں کی وارداتوں کو پیشگی پکڑنے اور خطرے کو ختم کرنے کی صلاحیت کا اعلان بھی کیا ہے تو یاد رکھیں قوم علامہ اقبالؒ کے اس باز سے تو بہت محبت کرتی ہے جو درویش صفات کا مالک ہوتے ہوئے کبھی اپنا گھر نہیں بناتا، جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر اپنا نشیمن بناتا ہے لیکن یہ کیسا باز ہے جس کے رہنے کے لئے سرے محل، بلاول ہاؤس اور دوسرے کئی ممالک میں پر تعیش محلات ہیں۔ کیا یہ وہ باز تو نہیں جو صرف اپنے آقا کے حکم پر معصوم پرندوں کا شکار کرتا ہے؟ باز ہمیشہ آزاد فضاؤں میں بلندیوں میں پرواز کرتا ہے لیکن کچھ باز ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو شکاریوں نے اپنی مرضی سے سدھا کر ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہوتی ہے اور

انہیں اپنے آقا کی مرضی کے مطابق ہی شکار پر جھپٹنا ہوتا ہے اور شکار کو اپنے آقا کے قدموں میں لا کر سرخرو ہوتا ہے۔

جن آقاؤں نے این آر او کے تحت اس باز کو پاکستان کی فضاؤں میں اڑنے کا حکم دیا ہے' کیا وہ پاکستان کے اداروں کو تباہ کرنے کا کام اس باز سے لینا چاہتے ہیں؟ قوم کو ایک بار پھر کھلی آنکھوں سے ملک کے معاملات پر گہری نظر رکھنی ہو گی' اپنی کاوشوں اور کوششوں کو مہمیز کرنا ہو گا اور پھر اس کے بعد ان معاملات کی ڈوری اللہ پر چھوڑنا ہو گی۔ ویسے تو یہ کام حکمرانوں کا ہے کہ وہ خلوص سے لبریز کوششیں کریں اور باقی کام اللہ پر چھوڑ دیں لیکن افسوس ہمارے حکمرانوں میں چولستان کے اس غریب کسان جتنا ''توکل'' نہیں' جو ریت میں بیج پھینکتا ہے اور پھر جھولی پھیلا کر اللہ سے بارش کی دعا کرتا ہے اور اللہ کا کرم دیکھئے' وہ اگر بارش نہیں برساتا تو کسی نہ کسی طریقے' کسی نہ کسی ذریعے سے اسے ایک سال کا رزق ضرور پہنچا دیتا ہے اور یہ بھی دیکھئے جس سال وہ کسان اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر بیج نہیں بوتا' اسے اس سال رزق بھی نہیں ملتا' اس کے حصے کا اناج بھی اس تک نہیں پہنچتا اور یہ وہی سال ہوتا ہے جب چولستان کے لوگ نقل مکانی کرتے ہیں۔

برطانیہ کے شمالی ساحل سمندر کے ایک خاص علاقے میں ہر سال ہزاروں من خوراک سائبیریا کے ان مہمان پرندوں کے لئے پھیلا دی جاتی ہے جو شدید سردیوں کی تعطیلات یہاں منانے کے لئے آتے ہیں اور تین مہینوں کے بعد اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ آنکھیں کھولنے کے لئے صرف یہی ایک واقعہ کافی ہے۔

رہے نام میرے رب کا جو رزاق بھی ہے!
اچھی گزر رہی ہے دلِ خود کفیل سے
لنگر سے روٹی لیتے ہیں پانی سبیل سے
دنیا مرے پڑوس میں رہتی تو ہے
مگر میری دعا سلام نہیں اس ذلیل سے

بروز بدھ ۴ صفر ۱۴۳۱ھ ۲۰ جنوری ۲۰۱۰ء

نفع کی پوٹلی

یہ تو وہ لوگ تھے جن کے مفادات تاجِ برطانیہ سے وابستہ تھے۔ جن کے آباواجداد نے سر، نائٹ اور لارڈز کے خطابات سے اپنی زندگیوں کو آراستہ کیا۔ انگلستانوں میں بڑی بڑی جاگیروں، جائیدادوں اور محلات کے مالک اور دریائے ٹیمز کے کنارے بگ بین کے سائے میں واقع پارلیمنٹ کی عمارت کے ہاؤس آف لارڈز میں بیٹھنے والے، برادرم لارڈ نذیر احمد کے پہلو میں براجمان۔ برطانیہ کے چرچ سے وابستہ اور دنیا بھر کی مشنریوں کے سرپرست، لیکن ان کی اولادوں کو یہ کیا ہو گیا!

اس خاتون کا پردادا ہربرٹ ہنری ایسکوتھ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۶ء تک اس زمانے کے برطانیہ کا وزیر اعظم رہا ہے جب اس سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ جنگِ عظیم اوّل میں برطانوی قوم کو فتح کی منزل کی طرف لیجانے والا، مسلمانوں کی عظیم سلطنتِ عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کے لئے لارنس آف عریبیہ سے سازشوں کا جال پھیلانے والا، اور برطانیہ کی بحری افواج کا نقشہ بدلنے والا اور اس کی پوتی ایما کلارک چند سال پہلے برطانوی پریس کے سامنے آئی اور بڑے فخر کے ساتھ اعلان کیا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے اور پھر ساتھ ہی کہا کہ میں نے اسلام مغرب کی منافقانہ اقدار سے نفرت اور اس کے ارد گرد بکھری غلاظت سے دور ہونے کے لئے قبول کیا ہے۔ پورے پریس میں سنسنی دوڑ گئی جب اس خاتون نے کہا کہ میں وہ واحد خاتون نہیں ہوں بلکہ برطانیہ کے ہزاروں بڑے بڑے خاندانوں کے افراد جن کی بنیاد پر برطانیہ کی اشرافیہ قائم ہے، اسلام قبول کر چکے ہیں اور یہ کوئی بدلنے والا فیشن نہیں، دلوں میں اترنے والی حقیقت ہے۔

اس خاتون کے اعلان کے بعد بی بی سی کے سابق ڈائریکٹر ایک تحقیقی فہرست لیکر میدان میں آ گیا، اس نے کہا کہ میرا نام یحییٰ ہے اور اس نے ایسے تمام بڑے بڑے سر، نائٹ اور لارڈز حضرات کے ناموں کی ایک فہرست لوگوں کے سامنے پیش کر دی جو اسلام قبول کر چکے ہیں۔ یحییٰ نے کہا کہ میری معلومات کے مطابق اس وقت تک (۱۴۲۰۰) اعلیٰ مناصب کے حامل افراد حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں (اب ان کی تعداد تقریباً دگنی ہو چکی ہے)۔ یہ سن کے سب نسلاً شکلاً اور عزت و مرتبہ کے لحاظ سے خالص انگریز ہیں، نہ کبھی محکوم رہے ہیں اور نہ کوئی معاشی، نفسیاتی یا غلامی مجبوری انھیں اس طرف مائل کرنے کا راستہ بنی ہے بلکہ سب کے سب یہ کہتے ہیں کہ ہم نے سکونِ قلب کا بہترین راستہ اسلام میں تلاش کیا ہے۔ یحییٰ برٹ نے کہا کہ ان سب کا کہنا ہے کہ یہ صرف اسلام کے مناسب، جامع روحانیت سے پُر پیغام کا اعجاز ہے کہ ہم اس روشنی سے آشنا ہوئے۔ ادھر ہربرٹ ہنری ایسکوتھ کی پوتی نے ہائی گرو کے علاقے میں ایک اسلامی باغ بنایا ہے جس میں مسجد اور اسلامی تعلیمات کا انتظام موجود ہے اور پردہ کے ساتھ سیر بھی، اور اب وہ سرے کے علاقے ووکنگ میں ایک کار پارک خرید کر اسے بھی ویسے ہی پارک میں منتقل کرنے کے آخری مراحل میں پہنچ چکی ہے ں۔ چالیس سال کا یہ انگریز ایرل آف بار بروگ جو برطانیہ میں اٹھائیس ہزار ایکڑ اراضی کا مالک ہے جو شائد ہی چند لوگوں کے پاس ہوتی ہے، مسلمان ہوا تو اپنا نام عبدالمتین رکھا۔ پریس کے لوگ حیرانی سے پوچھنے لگے تو کہنے لگا تم اسلام کو پڑھ کر تو دیکھو۔

کرسٹینا بیکر جس کا نام کبھی عمران خان کے ساتھ لیا جاتا تھا' کہنے لگی کہ اس نے اسلام کا ذکر عمران خان سے سنا لیکن اس کو پڑھنے کے بعد حیرت میں ڈوبتی چلی گئی' کتنی دیر تک اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہ کر سکی کہ میرے ارد گرد متعصب ذہن انگریز تھے جو کبھی سفید چمڑی والے اور خصوصاً اعلیٰ نسل کے انگریز کا مسلمان ہونا برداشت نہ کر سکتے تھے۔

برطانیہ کے ایک بہت ہی سنیئر بیوروکریٹ فرینک ڈوبسن یٹا احمد ڈوبسن' جس نے اسلام قبول کیا' آج اسلام کا ایک بہت شعلہ بیاں وکیل بن چکا ہے اور اس نے برطانیہ کی مسلم کونسل میں ایک کمیٹی بنائی ہے جسے کہتے ہیں' جس کا کام ہی اعلیٰ نسل کے گوروں کو اسلام کی حقانیت سے آگاہ کرنا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سب اعلیٰ نسل انگریز ایک وزارتِ خارجہ کے سابقہ سفیر اور برطانیہ کے خارجہ امور کے ماہر کی کتاب اسلام اور انسان کی منزل پڑھ کر مسلمان ہوئے ہیں۔ یہ شخص چارلس ایسٹن کہتا ہے کہ مجھے ہزاروں خطوط ایسے ملتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائیت اور مغرب کے غلیظ اور بھیانک روپ کے ساتھ منافقانہ رویّے سے بیزار ہیں' ہمیں کوئی ایسا مذہب بتاؤ جو ان سب روایات اور اقدار کو یکسر رد کرتا ہو اور وہ پھر اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں اور انہیں کوئی مسلمان ہونے سے نہیں روک سکتا۔

ادھر ایسکوتھ کی پڑپوتی ایما کلارک نے کہا ہے کہ برطانیہ کو صرف ایک میلکم ایکس جیسے روحانی رہنما کی ضرورت ہے اور پھر دیکھئے جیسے اس نے امریکا کے کالوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا' کس طرح برطانیہ کے گورے جوق در جوق مسلمان ہونگے' یوں لگے گا جیسے ایک ہجوم جلوس کی صورت میں مسلمان ہونے کے لئے روانہ ہوا ہے۔ ان اعلیٰ نسل گوروں کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ملکہ برطانیہ کو بکنگھم پیلس میں بھی جمعے کی نماز کے لئے وقفہ کرنا پڑتا ہے تاکہ مسلمان نماز ادا کر سکیں۔ یہ وہ قوم ہے جن کی راہ پر چلنے پر میرے ملک کے نواب' وڈیرے' صنعتکار' دانشور' ادیب اور حکمراں فخر کیا کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں۔ عام آدمی اس زمین کے خواب دیکھتا تھا اور باوجود لاکھ پابندیوں کے اب بھی ان کی اولادیں یہاں آباد ہونے کا خواب دیکھتی رہتی ہیں' بڑوں بڑوں کا قبلہ اس طرف مڑتا ہے لیکن حیرت ہے کہ جب انہی حقیقی کی طرف منہ موڑنے میں صرف چند لمحے لگے جو دنیا کے بتکدوں میں خدا کا پہلا گھر مغرب کے رہنے والوں نے اپنے ارد گرد دیکھا تو انھیں اس قبلہ تھا۔

وہ قوم تو آج بھی فخر سے کہہ سکتی ہے کہ ہمارے لوگوں نے حق کا راستہ اختیار کیا تو ہم نے قبول کر لیا لیکن پتہ نہیں کیوں میری شرمندگی' میری ذلت' میری ندامت ختم ہونے کو نہیں آتی۔ (۱۴۲۰۰) اعلیٰ نسل کے گورے مسلمان ہوتے ہیں تو بکنگھم پیلس میں جمعہ کے اوقات میں چھٹی ہو جاتی ہے اور جہاں ایوانِ صدر اور وزرائے اعظم اور اسمبلیاں مسلمانوں سے بھری پڑی ہیں' وہاں جمعہ کی چھٹی پر یہ کہہ کر طنز کیا جاتا ہے کہ ہم پسماندہ کہلائیں گے' ہمارے ان داتا ہم سے روٹھ جائیں گے' ہم کاروبار میں گھاٹے کا سودا نہیں کر سکتے۔ یہ تو میرے رب کا فضل ہے وہ جسے چاہے دنیا کی حرص و ہوس کا سودا دے دے اور جسے چاہے آخرت کے نفع کی پوٹلی پکڑا دے۔

رہے نام میرے رب کا جس نے اس دنیا کے امتحان سے انسان کی آخرت کو جوڑ دیا ہے!

جوہری کو کیا معلوم، کس طرح کی مٹی میں
کیسے پھول ہوتے ہیں
کس طرح کے پھولوں میں کیسی یاس ہوتی ہے
جوہری کو کیا معلوم
جوہری تو ساری عمر پتھروں میں رہتا ہے
زر گروں میں رہتا ہے
جوہری کو کیا معلوم
یہ تو بس وہی جانے
جس نے اپنی مٹی سے
اپنا ایک اک پیماں، استوار رکھا ہو
جس نے حرفِ پیما کا اعتبار رکھا ہو
جوہری کو کیا معلوم
کس طرح کی مٹی میں کیسے پھول ہوتے ہیں
کس طرح کے پھولوں میں کیسی باس ہوتی ہے

بروز ہفتہ ۷ صفر ۱۴۳۱ھ ۲۳ جنوری ۲۰۱۰ء

گور پیا کوئی ہور

ایک مرتبہ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک مدینہ طیبہ پہنچے اور چند روز قیام کیا اور لوگوں سے دریافت کیا مدینہ میں اب کوئی ایسا آدمی موجود ہے جس نے کسی صحابی کی صحبت پائی ہو۔ لوگوں نے بتایا: ہاں ابواز حامؒ ایسے شخص ہیں۔ سلیمان نے اپنا آدمی بھیج کر ان کو بلایا۔ جب وہ تشریف لائے تو سلیمان نے کہا ''اے ابواز حامؒ یہ کیا بے مروتی اور بے وفائی ہے؟'' ابواز حامؒ نے پوچھا کہ ''آپ نے میری کیا بے مروتی اور بے وفائی دیکھی ہے؟'' خلیفہ نے کہا کہ مدینے کے سب مشہور لوگ مجھ سے ملنے آئے' آپ نہیں آئے؟

''

ابواز حامؒ نے کہا: ''امیر المومنین میں آپ کو اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں اس سے کہ آپ کوئی ایسی بات کہیں جو واقعہ کے خلاف ہے' آج سے پہلے نہ آپ مجھ سے واقف تھے اور نہ میں نے آپ کو کبھی دیکھا تھا' ایسے حالات میں خود ملاقات کے لئے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' بے وفائی کیسی؟'' خلیفہ سلیمان نے جواب سن کر ابنِ شہاب زہری اور حاضرینِ مجلس کی طرف دیکھا تو امام زہریؒ نے فرمایا کہ ابواز حامؒ نے صحیح فرمایا آپ نے غلطی کی۔ اس کے بعد خلیفہ نے روئے سخن بدل کر کچھ سوالات شروع کر دیئے اور کہا کہ اے ابواز حازمؒ! یہ کیا بات ہے کہ ہم موت سے گھبراتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنی آخرت کو ویران اور دنیا کو آباد کر لیا ہے' اس لئے آبادی سے ویرانے کی طرف جانا پسند نہیں کرتے۔ خلیفہ نے تسلیم کیا اور پوچھا: کل اللہ کے سامنے حاضری کیسے ہو گی؟ ابواز حامؒ نے فرمایا: نیک عمل کرنے والا تو اللہ کے سامنے اس طرح جائے گا جیسے کوئی مسافر سفر سے واپس اپنے گھر والوں کے پاس جاتا ہے اور برے عمل کرنے والا اس طرح پیش ہو گا جیسے کوئی بھاگا ہوا غلام پکڑ کر آقا کے سامنے حاضر کیا جائے۔ خلیفہ یہ سن کر رو پڑا اور کہنے لگا کہ کاش ہمیں معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے کیا صورت تجویز کر رکھی ہے؟ ابواز حامؒ نے فرمایا کہ اپنے اعمال کو اللہ کی کتاب پر پیش کرو تو پتہ لگ جائے گا۔

خلیفہ نے دریافت کیا کہ قرآن کی کس آیت سے پتہ لگے گا؟ فرمایا اس آیت سے ''لایستوی اصحب النار واصحب الجنتہ ط اصحب الجنتہ ھم الفائزون'' دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے' جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں۔'' خلیفہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی ہے' وہ بدکاروں پر بھی حاوی ہے۔ ابواز حامؒ نے فرمایا ''قرآن میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نیک عمل کرنے والوں سے قریب ہے۔'' خلیفہ سلیمان نے پوچھا' اے ابواز حامؒ! اللہ کے بندوں میں زیادہ عزت والا کون ہے' فرمایا ''وہ لوگ جو مروت اور عقلِ سلیم رکھنے والے ہیں'' پھر پوچھا' کونسا عمل افضل ہے تو فرمایا کہ ''فرائض اور واجبات کی ادائیگی حرام چیزوں سے بچنے کے ساتھ'' پھر دریافت کیا کہ کون سی دعا زیادہ قابل قبول ہے۔'' تو فرمایا کہ ''جس شخص پر احسان کیا گیا ہو' اس کی دعا اپنے محسن کے حق میں قبولیت رکھتی ہے'' پھر دریافت کیا کہ صدقہ کون سا افضل ہے؟ تو فرمایا کہ مصیبت زدہ سائل کے لئے باوجود اپنے افلاس کے جو کچھ ہو سکے اس طرح خرچ کرنا کہ نہ اس سے پہلے احسان جتائے اور نہ ٹال مٹول کر کے ایذا پہنچائے۔

خلیفہ نے پھر دریافت کیا' کلام کون سا افضل ہے؟ ابواز حامؒ نے فرمایا کہ ''جس شخص سے تم کو خوف ہو یا جس سے تمہاری کوئی حاجت ہو اور امید وابستہ ہو

'اس کے سامنے بغیر کسی رورعائت کے حق بات کہہ دینا۔ پھر دریافت کیا کہ کون سا مسلمان زیادہ ہوشیار ہے ؟فرمایا وہ شخص جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت کام کیا ہو اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دی ہو۔ پھر پوچھا مسلمانوں میں کون سا شخص احمق ہے ؟فرمایا وہ آدمی جو اپنے کسی بھائی کی اس کے ظلم میں امداد کرے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اس نے دوسرے کی دنیا درست کرنے کے لئے اپنا دین بیچ دیا۔ خلیفہ سلیمان نے کہا کہ صحیح فرمایا۔اس کے بعد خلیفہ نے اور واضح الفاظ میں دریافت کیا کہ ہمارے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟ابواز حامؒ نے فرمایا کہ مجھے اس سوال سے معاف رکھیں تو بہتر ہے ۔ خلیفہ نے کہا' نہیں' آپ ضرور کوئی نصیحت کا کلمہ کہیں۔ابواز حامؒ نے فرمایا:

اے امیر المومنین ! تمہارے آباؤاجداد نے بزور شمشیر لوگوں پر تسلط حاصل کیا اور زبردستی ان کی مرضی کے خلاف ان پر حکومت کی اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کاش ! آپ کو معلوم ہوتا کہ وہ اب مرنے کے بعد کیا کہتے ہیں اور ان کو کیا کہا جاتا ہے !

حاشیہ نشینوں میں سے ایک شخص نے بادشاہ کے مزاج کے خلاف ابواز حامؒ کی اس صاف گوئی کو سن کر کہا کہ ابواز حامؒ ! تم نے یہ بہت بری بات کہی ہے۔ ابواز حامؒ نے فرمایا کہ تم غلط کہتے ہو' بری بات نہیں کہی بلکہ وہ بات کہی ہے جس کا ہمیں حکم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء سے اس کا عہد لیا ہے کہ حق بات لوگوں کو بتائیں گے چھپائیں گے نہیں۔ خلیفہ سلیمان نے پھر سوال کیا کہ اچھا اب ہمارے درست ہونے کا کیا طریقہ ہے ؟

فرمایا' تکبر چھوڑو' مروت اختیار کرو اور حقوق والوں کو ان کے حقوق انصاف کے ساتھ تقسیم کرو۔ خلیفہ نے کہا ابواز حامؒ کیا ہو سکتا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ رہیں۔ فرمایا! اللہ کی پناہ ! خلیفہ نے پوچھا یہ کیوں ؟فرمایا کہ اس لئے کہ مجھے خطرہ یہ ہے کہ میں تمہارے مال و دولت اور عزت و جاہ کی طرف کچھ مائل ہو جاؤں جس کے نتیجے میں مجھے عذاب بھگتنا پڑے۔ خلیفہ سلیمان نے کہا کہ اچھا آپ کی کوئی حاجت ہو تو بتلایئے کہ ہم اس کو پورا کریں۔ فرمایا: ہاں ! ایک حاجت ہے کہ جہنم سے نجات دلا دو اور جنت میں داخل کر دو۔ خلیفہ نے کہا یہ تو میرے اختیار میں نہیں۔ فرمایا کہ پھر مجھے آپ سے اور کوئی حاجت مطلوب نہیں۔ آخر میں خلیفہ نے کہا کہ اچھا میرے لئے دعا کیجئے تو ابواز حامؒ نے یہ دعا کی یا اللہ ! اگر سلیمان آپ کا پسندیدہ ہے تو اس کے لئے دنیا و آخرت کی بہتری کا کام کرنا آسان فرما!

خلیفہ نے التجا کی کہ مجھے کچھ وصیت فرما دیں۔ ارشاد فرمایا: مختصر یہ ہے کہ اپنے رب کی عظمت و جلال اس درجہ میں رکھو کہ وہ تمہیں اس مقام پر نہ دیکھے جس سے منع کیا ہے اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جس کی طرف آنے کا حکم دیا ہے۔ خلیفہ نے اس مجلس سے فارغ ہونے کے بعد سو دینار بطور ہدیہ کے ابواز حامؒ کے پاس بھیجے۔ ابواز حامؒ نے ایک خط کے ساتھ ان کو واپس کر دیا۔ خط میں لکھا تھا کہ اگر یہ سو دینار میرے کلمات کا معاوضہ ہیں تو میرے نزدیک خون اور خنزیر کا گوشت اس سے بہتر ہے اور اگر اس لئے بھیجے ہیں کہ بیت المال میں میرا حق ہے تو مجھ جیسے ہزاروں علماء اور دین کی خدمت کرنے والے ہیں' اگر آپ نے سب کو اتنا ہی دیا ہے تو میں بھی لے سکتا ہوں' ورنہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع نے معارف القرآن جلد اوّل میں امام قرطبیؒ کی تفسیر کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا ہے اور مجھے اس بارے میں اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کرنا کہ صدرِ مملکت نے مولانا حامد سعید کاظمی کو مذہبی امور کا وفاقی وزیر مقرر کر رکھا ہے اور ان کی وساطت سے اس ملک کے کئی علماء و مشائخ کو طلب فرما کر شرفِ ملاقات کا عزاز بھی بخشتے ہیں لیکن کیا کوئی عالمِ دین یا کوئی مرشد و شیخ ایسا ہے جو اس طرح صف زرداری کو مخاطب کر سکے جس طرح ابواز حامؒ تابعی نے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کو کیا! یہ مقام لمحہ فکریہ ہے! علماء اور مشائخ کے لئے! کیا کوئی عالم یا شیخ آج میڈیا پر یا کسی نجی ملاقات میں آصف زرداری اور ان تمام طاقتور افراد کو اس بات کی تلقین کر سکتا ہے کہ اس ملک کی لوٹی ہوئی تمام دولت کو واپس ملک کے خزانے میں جمع کروا دو کہ اسی میں تمہاری عافیت ہے! اسلامی ملک کے قاضی اور حکمرانوں کے تعلقات کیسے ہوتے ہیں اور ان کے احکام اور فیصلوں کی تعمیل کس طرح کی جاتی ہے!

سنا ہے کہ پاکستانی کابینہ میں ایک وفاقی وزیر بابر اعوان جن کو قانون کی وزارت کے ساتھ ساتھ کئی اور محکموں کا قلمدان بھی عنائت کیا گیا ہے، درسِ قرآن کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ کیا وہ بھی آخرت کی جوابدہی فراموش کر چکے کہ قرآن تو بڑی صراحت کے ساتھ مطالبہ کرتا ہے" لِمَ تَقُولُونَ مَالَا تَفْعَلُونَ"، تم وہ بات کیوں کہتے ہو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے۔ کیا اسلامی تاریخ یا کسی بھی مہذب معاشرے میں ایسی کوئی ادنیٰ سی بھی مثال موجود ہے جہاں ملک کا سربراہ عوامی اجتماع میں آنکھیں نکال دینے کی دھمکیاں محض اس لئے دے کہ اس کو اعلیٰ عدلیہ نے ملک سے لوٹی ہوئی دولت کا حساب مانگ لیا ہے۔ ایک عوامی اجتماع میں خود کو شہیدوں کے قبرستان میں دفن ہونے کی وصیت بھی فرماتے ہوئے برصغیر کے ایک صوفی کا قول بھی دہرایا کہ " بلھیا گور پیا کوئی ہور"۔ نجانے مجھے کیوں یقین ہو چلا ہے کہ اب گور کے ساتھ کوئی دھوکہ نہ ہو پائے گا۔ قبر اپنی اپنی، اعمال اپنے اپنے!

رہے نام میرے رب کا جس کی لاٹھی بڑی بے آواز ہے!

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذر و دلقِ اویس و چادرِ زہرا

بروز سوموار ۹ صفر ۱۴۳۱ھ ۵۲ جنوری ۲۰۱۰ء

نیٹ ورک

امریکااور دوسرے مغربی ممالک کی سیاست پر چھاجانے والااور تمام موجودہ امریکی پالیسیوں کو متاثر کرنے والا گروپ جسے نیو کنزرویٹو عرفِ عام میں نیو کونز کہتے ہیں، کوئی بہت بڑا گروپ نہیں ہے۔ تعداد کے اعتبار سے اس گروپ میں شامل لوگوں کی عددی حیثیت سینکڑوں سے زیادہ نہیں ہوگی مگر وہ باہم شادیوں، رشتوں، نظریاتی اصولوں اور کاروباری مفادات کے یکجاہونے کی وجہ سے ایک نہائت ہی موثر گروپ بن چکا ہے جس نے امریکی خارجہ پالیسی کو اپنے سخت شکنجے میں لے رکھا ہے جو ہر پارٹی کے دور حکومت میں اپنا موثر نیٹ ورک بڑی عمدگی اور کامیابی کے ساتھ چلا رہا ہے۔

سابقہ دور کے نائب صدر ڈک چینی خود حکومت میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے جبکہ ان کی بیٹی الزبتھ چینی ڈپٹی نائب وزیر خارجہ برائے مشرق قریب اوران کی اہلیہ لین چینی نیو کونز کے ایک تھنک ٹینک امریکن انٹیر پرائز انسٹیوٹ میں آج بھی ریسرچ اسکالر ہیں۔ اسی انسٹیٹوٹ کے ریذیڈنٹ اسکالر مائیکل لیڈبن کی شادی بار برالہ لیڈبن سے ہوئی ہے جو عورتوں کے حقوق سے متعلق انڈیپنڈنٹ فورم کی سربراہ ہے۔ باربراری پبلکن پارٹی کی اہم ترین خواتین میں شمار ہوتی ہیں۔ ڈیویڈورمسراوراس کی بیوی مے رونیو کونز کے انتہائی طاقتور شادی شدہ جوڑوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان دونوں نے ۱۹۹۶ء میں اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو کے لئے کلین بیرک نامی میمورنڈم لکھنے میں مدد کی تھی۔

ڈیوڈامریکن انٹرپرائزز انسٹی ٹیوٹ میں مڈل ایسٹ اسٹڈیز کاڈائریکٹر رہا ہے جہاں اس کی کتاب ٹائے رن الائے چھپ چکی ہے۔ ڈیوڈ کی بیوی نے اسرائیلی ایجنٹ کی مدد سے ایک اور تھنک ٹینک کو جنم دیا جس کا نام میمری ہے، جہاں اس نے ڈائریکٹر کے طور پر چار سال تک کام کیا۔ اس کے علاوہ ایک اور طاقتور جوڑا رابرٹ کیکن اور اس کی بیوی وکٹوریہ نیولینڈ کا ہے۔ رابرٹ آف پیراڈائز کا مصنف ہے اور خارجہ پالیسی کا ماہر مانا جاتا ہے جب کہ اس کی بیوی نیٹو میں ڈپٹی ایمبیسیڈر تھی اور بعد میں ڈک چینی جب نائب صدر تھے ان کی ٹاپ ایڈوائزر کی عہدے پر تعینات ہوئیں۔ نیو کنزرویٹو تحریک کے مشہور یہودی النسل شریک بانی نارمن پڈہٹز کا بیٹا جان روبرٹ مرڈاک کے اخبار نیویارک پوسٹ کا کالم نگار ہے اور اسی حوالے سے اکثر روبرٹ مرڈاک کے فاکس نیوز چینل کے پروگراموں میں دکھائی دیتا ہے اور اس سے پہلے وہ صدر ریگن اور صدر بش سنیئر کی تقاریر بھی لکھتا رہا ہے۔ وہ اپنے کالموں میں امریکی انتظامیہ کو کہتا رہتا ہے کہ وہ اسرائیل پر بے جا دباؤ نہ ڈالے۔

تیرہ سال قبل ۱۹۹۷ء میں نیو سٹیزن پراجیکٹ کے زیرِاہتمام ایک منصوبہ تیار کیا گیا جس کا نام ''پروجیکٹ فار دی نیو امریکن سنچری'' (پی این اے سی) رکھا گیا اور آجکل تمام نیو کانز کا متفقہ چارٹر ہے۔ اس پراجیکٹ کا براہِ راست تعلق نیو کانز کے تھنک ٹینک امریکن انٹرپرائزز انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ ہے۔ ان دونوں پراجیکٹس کی فنڈنگ کا کام بریڈلی فاونڈیشن نامی ادارہ کرتا ہے۔ پی این اے سی کا چیئرمین ولیم کرسٹل ہے جو نیو کانز کے اخبار ویکلی اسٹینڈرڈ کا ایڈیٹر بھی ہے۔ اس کے ڈائریکٹروں میں رابرٹ کیکن، بروس جیکسن، لیوس لیبر مین اور مارک گرسن شامل ہیں۔ اس پراجیکٹ کے روح رواں ڈونلڈ رمز فیلڈ اور ڈک چینی تھے جو اس وقت کے صدر بل کلنٹن پر اسرائیلی حمائت کے لئے دباؤ ڈالنا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ امریکی خارجہ اور دفاعی پالیسی غلط راستے

پر چل نکلی ہے۔ وہ جنگ کے ذریعے پوری دنیا میں امریکی تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔

اس پراجیکٹ کے مقاصد پر دستخط کرنے والوں میں ڈونلڈ رمز فیلڈ' ڈک چینی' ایلیٹ ابرمز' سابقہ صدر بش کے بھائی جیب بش' ارب پتی سابقہ صدارتی امیدوار اسٹیو فور بز اور حیران کن طور پر افغان نژاد امریکی زالمے خلیل زاد (افغانستان اور عراق میں سابقہ امریکی سفیر) بھی شامل ہیں۔ ۲۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو پی این اے سی کی طرف سے اس وقت کے صدر بش کے نام ایک کھلا خط لکھا گیا' جس میں ان سے کہا گیا کہ افغانستان کے ساتھ عراق کے خلاف بھی جنگ کی جائے اور پھر شام' ایران اور لبنان کی حزب اللہ کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے' اپنے مقاصد کی طرف کامیابی دیکھتے ہوئے ۱۳ اپریل ۲۰۰۲ء کو پی این اے سی نے ایک اور کھلا خط لکھا' جس میں صدر بش کی پالیسیوں کی تائید اور حمائت کی گئی۔ پی این اے سی نے ستمبر ۲۰۰۱ء میں ایک رپورٹ شائع کی جس کا نام تھا ''امریکی دفاع کی تعمیر نو''۔ اس رپورٹ میں امریکی انتظامیہ پر زور دیا گیا کہ دنیا میں امریکی موجودگی اور طاقت ہر جگہ ضروری ہے اور بالخصوص خلیج اور دنیا کے امن کے لئے بالعموم ضروری ہے کہ صدام حسین کی حکومت کو ہر صورت ختم کیا جائے اور اگر وہ ختم بھی ہو جائے تو امریکی فوجوں کو علاقے میں رکھنا چاہئے۔ (یہی وجہ ہے کہ صدام اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی بھی دے دی گئی اور عراق میں بے پناہ نقصان کے باوجود بھی عراق سے فوجوں کو نہیں نکالا جا رہا کیونکہ یہ گرینڈ ڈیزائن کے خلاف ہے)۔

نیو کونز کی اس جنگی پالیسی سے متاثر ہوتے ہوئے امریکی انتظامیہ نے ۲۰ ستمبر ۲۰۰۲ء کو نیشنل سیکورٹی اسٹرٹیجی کا اعلان کیا جو بنیادی طور پر یہ بتاتی ہے کہ ۱۱ ستمبر کے واقعے کے بعد کی دنیا میں امریکا کا کردار کیا ہوگا۔ اسی اسٹرٹیجی میں مدافعتی جنگ پری ایمپیٹو اٹیک کا اصول پیش کیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا کہ امریکی جنگی طاقت کو چیلنج نہیں کرنے دیا جائے گا' یونی لیٹرل ازم کا اصول بھی سامنے آیا اور مسلم دنیا میں جمہوریت کو متعارف کرانے کا عندیہ بھی دیا گیا۔ نیو کونز کے تمام منصوبوں کو تقویت دینے کے لئے مختلف تھنک ٹینکس اب بھی اسی طرح قائم و دائم ہیں اور پوری تندہی سے سازشی کاموں میں مصروف ہیں جو موجودہ حکومت کی رہنمائی کے لئے ہر وقت پیش پیش رہتے ہیں' ان میں ایک ''سینٹر فار سیکورٹی پالیسی'' ہے جس کا سربراہ فرینک ہے جس نے حالیہ سیکورٹی پلان میں پاکستان کا نام بھی شامل کیا ہے جس پر ساری پاکستانی قوم ہیجان میں مبتلا ہے۔ اس تھنک ٹینک کے ۲۱/ارکان سابقہ صدر بش کی انتظامیہ میں اہم عہدوں پر فائز تھے جن میں ایلیٹ ابرمز' رچرڈ پرل' ڈگلس فیتھ اور آرمی سیکرٹری جیمز روش شامل تھے۔ ایک اور تھنک ٹینک امریکن انٹرپرائز انسٹی ٹیوٹ ہے جو نیو کانز کا گڑھ کہلاتا ہے۔ اس کے چودہ ارکان بھی بش انتظامیہ میں شامل تھے اور آج بھی ان کا خاصا عمل دخل ہے۔ یہ امریکا کے بڑے تھنک ٹینکس میں شامل ہوتا ہے جس کے ۶۰ ریذیڈنٹ اسکالر کے علاوہ ۱۸۰/عارضی اسکالرز ہیں۔

نڈیشن نیو کانز کے فلسفے کو پروموٹ کرنے والا ایک اور ادارہ ہے جو نہائت ہی متمول افراد پر مشتمل ہے۔ یہ ۱۹۰۳ء میں قائم کیا گیا اور آج تک بریڈلی فاؤ ان گنت پراجیکٹس کی مالی معاونت کر چکا ہے۔ مڈل ایسٹ فورم ۱۹۹۰ء میں بنایا گیا جس کا بنیادی مقصد ہی مشرقِ وسطیٰ میں امریکی مفادات کی نگرانی اور نگہبانی کرنا ہے۔ یہ ادارہ ترکی، اسرائیل اور علاقے کی دیگر جمہوریتوں کے ساتھ امریکی تعلقات بڑھانے کی حمائت کرتا ہے اور اس کا سربراہ نہائت متنازع ڈینیل پائپس ہے جو مسلمانوں اور اسلام کے خلاف اپنے زہر آلود بیانات کی وجہ سے مشہور ہے۔ ۱۹۸۵ء میں ایک ادارہ واشنگٹن انسٹی ٹیوٹ فار نیئر ایسٹ پالیسی بنایا گیا، جس کا مقصد بھی مشرقِ وسطیٰ میں امریکی مفادات کے بارے میں دانشورانہ سطح پر شعور اجاگر کرنا تھا، اس کے سربراہ ڈینس راس ہیں جو مشرقِ وسطیٰ میں امریکی نمائندے رہے ہیں۔

مڈل ایسٹ میڈیا ریسرچ نسٹی ٹیوٹ میمری ۱۹۷۸ء میں قائم کیا گیا، جس کے بانیوں میں مے رووِر مسر کے علاوہ سابق اسرائیلی ایجنٹ یوگل کیرمن شامل تھے۔ مشرقِ وسطیٰ کے اخبارات میں شائع ہونے والی تمام رپورٹوں تجزیوں اور کالموں کا ترجمہ اس کے فرائض میں شامل ہے۔ ۱۱ ستمبر کے بعد ''امریکنز فار وکٹری اوور لیٹرازم'' بنایا گیا، جس کے سربراہ سابق وزیرِ تعلیم ولیم بینٹ ہیں۔ اس کے علاوہ ہڈسن انسٹی ٹیوٹ بھی اپنا کردار ادا کر رہا ہے، جیوئش انسٹی ٹیوٹ فار نیشنل سیکورٹی افیئرز یعنی جنسا امریکی، اسرائیلی تعلقات اور دفاعی تعاون کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے بورڈ آف ایڈوائزر میں نیو کونز کے صفِ اول کے تمام لوگ شامل ہیں۔ فاونڈیشن فار ڈیفنس آف ڈیموکریسیز بھی ۱۱ ستمبر کے بعد بنایا گیا اور نیو کونز کی معاونت کر رہا ہے۔ یہ ہے وہ نیٹ ورک جو موجودہ امریکی پالیسیوں کو چلا رہا ہے۔

اگر آپ کو یاد ہو تو انہی کالموں میں تحریر کر چکا ہوں کہ کس طرح رحمان ملک نے زالمے خلیل زاد کے تعاون سے بے نظیر بھٹو کو نیو کانز کے اکابرین سے ملوایا جس کے نتیجے میں این آر او وجود میں آیا اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ نیو کانز کا جوہری پاکستان کے بارے میں کیا پروگرام ہے اور ان سے کن معاملات پر واضح یقین دہانیاں حاصل کی گئی تھیں۔ اس کا تسلسل موجودہ حکومت کی پالیسیوں سے صاف نظر آ رہا ہے۔ زرداری صاحب کی شدید خواہش ہے کہ اب اداروں کے تصادم میں وہ شہید بن کر سرخرو ہو سکیں اور پاکستان کو کمزور کرنے کی یہی دیرینہ آرزو پاکستان کے ان دشمنوں کی ہے جو اس آڑ میں خدانخواستہ کوئی اور بڑا طوفان برپا کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ کاش کے مسلمان بھی اس صورتحال کا صحیح جائزہ لگا کر اپنی راہ اور مقاصد کا تعین بہتر انداز میں کر سکیں۔

رہے نام میرے رب کا جو دشمنوں کی ان چالوں کے مقابلے میں بہترین تدبیروں کا مالک ہے!

کئی درختوں کی شاخیں لہو پہ پلتی ہیں
مجھے تو خوف سا آنے لگا ہے چھاؤں سے

بروز منگل ۱۰ صفر ۱۴۳۱ھ ۲۶ جنوری ۲۰۱۰ء

جاودانی حقیقت

مغربی کنارے کی ایک مسجد میں نماز جمعہ کے بعد سو کے لگ بھگ پر جوش نوجوان امریکا اور اسرائیل کے خلاف نعرے لگاتے اس باڑ کی طرف بڑھے جس نے ان کی بستیوں' ان کے گھروں اور ان کے کھیتوں کو تقسیم کر دیا ہے۔ ان میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ گلی کے روڑے پتھر اچھالتا یہ چھوٹا سا ہجوم آگے بڑھنے لگا۔ پندرہ سالہ نوخیز فلسطینی بچہ حسین محمد عود آگے آگے تھا۔ ایک اسرائیلی فوجی کی طبیعت گدگدائی' اس نے نشانہ بازی کی مشق کے لئے حسین محمد کے سر کا نشانہ لیا' گولی اس کی کھوپڑی کے عین وسط میں سوراخ کرتی ہوئی دوسری طرف سے نکل گئی اور حسین محمد عود وہیں ڈھیر ہو گیا۔ چمنستانِ جس وقت حسین محمد عود کا بھیجا سڑک پر بکھرا پڑا تھا اور اس کا لہو تپتی ہوئی سیاہ رنگ تار کول پر نقش و نگار بنا رہا تھا' عین اس وقت قصرِ سفید کے گلاب میں فاتحین کابل و بغداد' کندھے سے کندھا ملائے اخبار نویسوں سے ہمکلام تھے۔

چمکتی دھوپ میں لہکتے گلابوں کا رنگ حسین محمد کے خون کی طرح گہرا عنابی ہو رہا تھا اور اوبامہ اپنے پیشرو کی طرح اسرائیلی وزیراعظم کی عالمی امن کے لئے کئے گئے اقدامات کی تعریف و توصیف فرما رہے تھے کہ انہوں نے ایک تاریخی اور جرات مند قدم اٹھایا ہے اور اب آزاد فلسطینی ریاست کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔ امریکا کا اندھا دھند مقلد برطانیہ بہادر نے اپنے ماسٹر کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک تاریخی موقع اور فلسطینی ریاست کے قیام کے لئے مثبت پیش رفت ہے۔ اوبامہ نے تان اٹھائی دنیا کو یہ تاریخی لمحہ ضائع نہیں کرنا چاہئے اور فلسطینی ریاست کو حقیقت کا روپ دینے میں مدد کرنی چاہئے۔ گورڈن نے گرہ لگائی کہ میں ان لوگوں سے اتفاق نہیں کرتا جو اس منصوبے کو ''روڈمیپ'' سے انحراف کہتے ہیں۔ دونوں فاتحین اس بات پر متفق تھے کہ اسرائیل اور فلسطین کے حوالے سے ''زمینی حقائق'' کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

دو بڑی طاقتوں کے فرمانروا ''دن دیہاڑے'' بھری دنیا کے سامنے فریب کاری کے کرتب دکھا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ندامت کی کوئی پرچھائیں نہ تھی۔ مکروہ ترین دہشت گردی کو انعام و کرام سے نوازتے وقت ان کی پیشانیوں پر ندامت کا ایک قطرہ تک نہ تھا۔ نیتن یاہو نامی سفاک شخص کو ''جرات مند اور تاریخ ساز'' قرار دیتے وقت ان کی زبانیں ایک دفعہ بھی نہیں لڑکھڑائیں۔ آدھے سے زیادہ فلسطینی سرزمین اسرائیل کے حوالے کرتے وقت ان کے ضمیر نے اتنی سی بھی جھرجھری نہیں لی جتنی جھرجھری دو گز زمین کسی ناجائز قابض کے نام کرتے وقت ایک خائن اور بدعنوان پٹواری کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود دونوں کا اصرار ہے کہ انہیں امن' انصاف آزادی' جمہوریت' انسانی حقوق' احترامِ آدمیت' اصول پرستی اور انسان دوستی کا دیوتا مانا جائے۔

جس وقت برطانیہ کی قیادت میں دنیا کے منصفوں نے عالمِ عرب کے عین ملک میں ایک ناسور کی تخم ریزی کی تو صاحبانِ نظر کو خبر تھی کہ آنے والے موسموں کے تیور کیا ہوں گے کیونکہ اس سے ایک سال پہلے برصغیر کی تقسیم کے وقت بھی انہی منصفوں نے اس برصغیر کے سینے پر مسئلہ کشمیر ایسا داغ چھوڑا ہے جو لاکھوں انسانوں کے خون کی قربانی کے بعد بھی دھلنے کی بجائے گہرا ہی ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس ناسور کو اپنی جڑیں پھیلانے اور نس نس میں زہر

بھرنے کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے اور ادھر فلسطین کی بھی ۷۸٪ زمین پر اسرائیل نے ناجائز قبضہ جما لیا ہے تو اس کے سرپرستوں نے کہا کہ بقیہ ۲۲٪ علاقہ فلسطینیوں کے پاس رہے گا جہاں ان کی آزاد فلسطین ریاست قائم ہو گی لیکن غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے کا یہ چھوٹا سا منطقہ بھی فلسطینیوں کے لئے جہنم بنا دیا گیا۔ اسرائیل نے دونوں فلسطینی علاقوں میں بستیاں بنانے اور یہودیوں کو بسانے کا عمل شروع کر رکھا ہے۔ امریکا' برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک حلق سے اوپر اوپر اس اقدام کی مخالفت کرتے اور اندر سے اسرائیل کو تھپکیاں دیتے رہتے ہیں۔ اس دوران اقوام متحدہ نے درجنوں قراردادیں منظور کیں جنہیں اسرائیل نے پرزے بنا کر عالمی ضمیر کے کوڑے دان میں پھینک دیا ہے اور مسلمانوں کی بے بسی کو دیکھتے ہوئے بھارت بھی اسرائیل کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔

عراق پر یلغار کے وقت دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ایک نام نہاد ''روڈ میپ'' کا اعلان کیا گیا تھا جسے ٹونی بلیئر نے اپنی کامیابی کے طور پر استعمال کیا تھا۔ روڈ میپ میں کہا گیا تھا کہ اسرائیل ضزہ اور مغربی کنارے سے نکل جائے' وہاں کوئی نئی بستی نہ بنائے اور پہلے سے تعمیر شدہ بستیاں گرا دے۔ اسرائیل نے نہ صرف تمام بستیاں برقرار رکھیں بلکہ اس روڈ میپ کے اعلان کے بعد صرف ایک سال میں ۵۴٪ اضافہ کر دیا اور تاحال اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس دوران امریکا اور برطانیہ مل کر فلوجہ و نجف کے ''باغیوں'' اور کابل و قندھار کے ''دہشت گردوں'' کو کچلتے رہے۔ اقوام متحدہ کی ہر قرارداد ویٹو کر دی گئی جس میں اسرائیل کے لئے کوئی ہلکا سا ''حرفِ مذمت'' بھی درج تھا۔ ۱۸/دسمبر ۲۰۰۳ء کو ظالم شیرون نے سارا الزام فلسطینی مزاحمت کے سر تھوپ کر ''روڈ میپ'' سے یکطرفہ بریت کا اعلان کر دیا تھا اس پر امریکا نے بظاہر ''شدید برہمی'' کا اظہار کرتے ہوئے اسرائیل کے اعلان کردہ گیارہ ارب ڈالر کی امداد میں سے ۳۰ کروڑ ڈالر روک لئے تھے جو بعد ازاں کسی اور مد میں ادا کر دیئے گئے۔

اسرائیل کو غزہ کے غربت گزیدہ اور شورش زدہ علاقے سے زیادہ دلچسپی نہیں' وہ مغربی کنارے کے بہتر انفراسٹرکچر اور شاداب زمین پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔ اس نے ایک منظم منصوبے کے تحت وسیع رقبے پر کم و بیش پانچ بڑی بستیاں تعمیر کیں جن میں دو لاکھ سے زائد یہودیوں کو آباد کر دیا۔ اس سارے عمل کے دوران امریکا اسے اربوں ڈالر فراہم کرتا رہا لیکن گزشتہ چار ہائیوں سے واشنگٹن کا اعلان شدہ سرکاری مؤقف یہی رہا کہ ''فلسطینی زمین پر یہودی بستیاں غیر قانونی اور امن کی راہ میں رکاوٹ ہیں'' اور اب یہ رکاوٹ دور ہو گئی ہے۔ امریکی حکومت نے ۴۰ سال سے زائد امریکی موقف سے انحراف کرتے ہوئے اسرائیل کے سامراجی منصوبے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور برطانیہ نے بھی اس کی حمائت کر دی ہے۔ صابرہ و شتیلہ کے مہاجر کیمپوں میں ہزاروں فلسطینیوں کو سفاکی سے قتل کرنے والے ایریل شیرون اور اس کے ماننے والوں کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ بش اور اوبامہ تو پہلے ہی ایسے لوگوں کے سینوں پر ''مردِ امن'' کا تمغہ اعزاز سجا چکے ہیں۔ اب مغربی کنارے کا ۵۵٪ علاقہ اسرائیل لے جائے گا اور مجموعی طور پر فلسطین نامی خطے کے ۹۰٪ پر اسرائیل اور دس فیصد پر فلسطینی ریاست بنے گی۔ امریکا نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ دنیا بھر میں دربدر بھٹکتے لاکھوں فلسطینیوں میں سے

کوئی اسرائیل واپس نہیں جاسکے گا' انہیں آباد کرنے کی یہ ذمہ داری بالشت بھر فلسطینی ریاست پر ہوگی۔

یہ ہے وہ امریکا جو اہلِ حرم کو دہشت گرد' فتنہ پرور' انتہاپسند' مذہبی جنونی اور بے رحم قاتل قرار دیتا ہے اور جس کا اپنا رویہ نسل پرستی' مذہبی تفریق اور تعصب کی انتہا کو چھو رہا ہے۔ امریکا میں آباد ۶۰ لاکھ یہودیوں اور چار کروڑ کے لگ بھگ یہودی نواز' بنیاد پرست عیسائیوں کے ووٹوں کی خاطر اوبامہ نے بھی اپنے پیشرووں کی طرح مکروہ ترین دہشت گردی میں ملوث ریاست کے سامراجی عزائم کی توثیق کردی ہے۔ اوباما اور گورڈن کا ہر اقدام ''کروسیڈ'' کے تصور کو قوی کر رہا ہے اور ان کی ہر واردات ''تہذیبوں کے تصادم'' کے نظریئے کو توانا کر رہی ہے۔ ادھر ہماری نسل نو کی ذہنی و فکری تربیت کرنے والے روشن خیالوں کا کہنا ہے کہ نصابِ تعلیم کو نفرتوں سے پاک کرنا ناگریز ہے اور ادھر یہود و ہنود کا گٹھ جوڑ ایسے کچوکے لگا رہا ہے کہ فکر و احساس رکھنے والے انگاروں پر لوٹ رہے ہیں۔

معروف صحافی رابرٹ فسک بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکا کہ ''اسرائیل کی حمائت کر کے امریکا نے دہشت گردی کو سندِ قبولیت عطا کردی ہے اور اسامہ بن لادن کا یہ نظریہ درست ثابت ہو رہا ہے کہ امریکا اور یہودی مسلمانوں کی سرزمین پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں"۔

تاریخ دم سادھے اس عہد کے فرعونوں کی ''عدل گستری'' اور ''انصاف پروری'' کا تماشہ کر رہی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی نس نس میں بھرا زہر قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے' ''زمینی حقائق'' کے نام پر ظلم و شقاوت اور جبر و ناانصافی کی سیاہ آندھیوں کو غارت گری کا اذن دے دیا گیا ہے اور ان کی باگیں بلند میناروں اور حسین گنبدوں والی بستیوں کی طرف موڑ دی گئی ہیں۔ اسرائیل اور فلسطین کے حوالے سے تراشا گیا ''زمینی حقائق'' کا نیا تصور کشمیر کے لئے خطرے کی گھنٹی ہے اور ہم اس ''زمینی حقیقت'' کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں کہ عافیت کی راہیں وائٹ ہاوس سے پھوٹتی ہیں۔ ہم بھی کیا لوگ ہیں جو زمینی حقیقتوں کی دہلیز پر سر رکھے اس آسمانی اور جاودانی حقیقت کو بھلا بیٹھے ہیں جس کا درس ہمیں خالق ارض و سما نے دیا تھا۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَـٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيرًا

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو'' اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کردے (النساء:۷۵)

رہے نام میرے رب کا جس کے ہاں دیر تو ہے مگر اندھیر نہیں!

اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا

آئینہ میں نے دکھایا تھا کہ پتھر برسے

بروز جمعرات ۱۱ صفر ۱۴۳۱ھ ۲۷ جنوری ۲۰۱۰ء

بھکاری ملک کا سخی

آج تک صرف تین آدمی ایسے ملے ہیں جن کو مل کر حقیقی خوشی ہوئی اور اب بھی میں ایسے لوگوں کی تلاش میں ہوں تاکہ آجکل کی گھٹن اور آسیب زدہ معاشرہ میں کسی کی کوئی مثال دی جاسکے۔ ایک صاحب نے کراچی سے ای میل کے توسط سے رابطہ کیا کہ ''میں معمولی درجے کا کاروباری شخص ہوں، اپنی تمام ضروریات پوری کرنے کے بعد مجھے ہر مہینے پانچ ہزار بچ جاتے ہیں، آپ کی نظر میں کوئی ضرورت مند ہو تو مہربانی فرما کر اس کا نام و پتہ لکھ بھیجئے، میں چپ چاپ اس کی خدمت کرتا رہوں گا۔'' مجھے یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے یہ پڑھ کر کیوں خوشی ہوئی یہ ذرا آگے چل کر بیان کروں گا۔

دوسرے صاحب لاہور کے ایک کلرک تھے۔ کسی نے ان کے بارے میں بتایا کہ وہ دفتر سے واپسی کے بعد کاغذ چننے والے بچوں کو جمع کرتے ہیں، انہیں الف بے تے اور ایک دو تین سکھاتے ہیں۔ میں جب پاکستان گیا تو ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ دھرم پورہ میں ریلوے لائن کے ساتھ رہتے تھے۔ میں ان کے گھر پہنچا تو ان کے دروازے پر کاغذ جمع کرنے والے بچوں کی گٹھڑیاں اور تھیلے موجود تھے۔ میں ان گٹھڑیوں اور تھیلوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا ان کی بیٹھک میں داخل ہو گیا۔ بیٹھک میں دری بچھی ہوئی تھی۔ دری پر پچیس سے تیس کے قریب بچے بیٹھے الف سے انار اور بے سے بکری اور دوسرا گروپ ایک دوسرے کو حساب کے ''پہاڑے'' دو دونی چار اور تین دونی چھ الاپ رہے تھے۔ وہ ایک کونے میں بیٹھے سماعت اور گویائی سے محروم دو بچیوں اور تین لڑکوں کو اشاروں کے ساتھ پڑھا رہے تھے۔

میں ان کے قریب بیٹھ گیا، ان کے چہرے پر ایک عجیب نور اور ذات میں ایک انوکھا اطمینان تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ روز تین بجے ان کی بیٹھک کھل جاتی ہے، بچے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ بچے سب سے پہلے غسل خانے میں جاتے ہیں، وضو کرتے ہیں، انہی میں سے ایک بچے کی امامت میں نماز ظہر پڑھتے ہیں، گھر میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کھاتے ہیں، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پڑھتے ہیں، عصر کی نماز کے بعد اپنے اپنے تھیلے اور گٹھڑیاں اپنے کندھوں پر اٹھائے اپنے استاد کو مؤدبانہ سلام کرتے ہوئے رخصت ہو جاتے ہیں اور استاد فرداً فرداً سب کو سلام کو جواب دیتے ہوئے دعائیں بھی دیتا ہے۔

یہ دنیا کا واحد اسکول تھا جس میں حاضری کا کوئی رجسٹر نہیں تھا لیکن اس کے باوجود جس بچے نے ایک دفعہ اس دہلیز پر قدم رکھ دیا وہ پھر اس پیر خانے کا ہو کر رہ گیا۔ میں وہاں تقریباً دو گھنٹے بیٹھا رہا۔ معلوم ہوا اب تک اس اسکول کی سینکڑوں برانچیں کھل چکی ہیں۔ حضرت صاحب ہر ٹیم میں سے دو تین بچوں کو منتخب کرتے ہیں، انہیں دو دو تین تین گھنٹے پڑھاتے ہیں، جب وہ ان کے معیار کے مطابق ''عالم'' ہو جاتے ہیں تو وہ انہیں اپنے پاس بٹھاتے ہیں، سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میٹھی آواز میں کہتے ہیں ''بیٹا جاؤ اور اپنے جیسے دوسروں بچوں کو یہ سب کچھ محبت سے سکھاؤ وہ بچے اٹھتے ہیں اور کسی گندے نالے، کسی جوہڑ کے کنارے، پرانے کاغذوں کے کسی گودام کے باہر یا کسی بدبودار آبادی کے کسی ٹنڈ منڈ درخت کے نیچے اس اسکول کی برانچ کھول لیتے ہیں۔ یہ دنیا کا واحد ادارہ ہے جس میں پورے اسکول کے لئے ایک کتاب کافی سمجھی جاتی ہے۔

یہ بچے کانے، چھڑی کے کسی ٹکڑے یا درخت کی شاخ کو قلم بناتے ہیں اور زمین کو سلیٹ اور پھر یہی سلیٹ اور قلم انہیں روشنی کی نہ ختم ہونے والی وادی میں لے جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ کسی سے ایک پیسہ عطیہ قبول نہیں کرتے۔ اپنی معمولی سی آمدنی سے بچوں کو کھانا کھلاتے ہیں، انہیں چائے بنا کر پلاتے ہیں۔ میں نے ان کا ہاتھ چوما جس کے جواب میں انہوں نے دعاوں کے ساتھ میرے سر کو بوسہ دیا، اور میں باہر آ گیا۔

تیسرا واقعہ ایک ایسے خوددار بچے کا ہے کہ جس کو دیکھ کر میری آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور میں نے بے ساختگی میں اس کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ مجھے بتایا گیا کہ اس بچے نے میٹرک اور ایف ایس سی میں اپنے اسکول اور کالج میں ٹاپ کیا اور اب یونیورسٹی کے تعلیمی اخراجات اس کی استطاعت سے باہر ہیں۔ یہ ہونہار بچہ میرے اس دوست کا عزیز تھا اس لئے اس نے اس کے تمام تعلیمی اخراجات کی ذمہ داری اٹھاتے ہوئے اس کو اپنی تعلیم مکمل کرنے کا عندیہ دیا۔ اس بچے نے پہلے تعلیمی سال مکمل ہونے کے بعد اپنے اس محسن کو خط لکھا کہ آپ براہِ مہربانی مجھے آئندہ سے مقرر کردہ رقم نہ بھیجا کریں کہ میں نے یہاں ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی ہے اور اب میں اپنے اخراجات میں خود کفیل ہوں۔ اگر یہ بچہ چاہتا تو ابھی اور تین سال اس رقم کو وصول کرتا رہتا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی لیکن اس کی ایمانداری اور غیرت نے یہ برداشت نہ کیا کہ وہ کسی کے اعتماد کو دھوکہ دے۔ یہ بات بتانے والے کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس ہونہار ایماندار بچے کی کامیابی کے لئے لاکھوں دعائیں تھیں۔

مجھے ان سب سے مل کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ مجھے کیوں خوشی ہوئی، میں اب آپ کو اس کی وجہ بتانا چاہتا ہوں۔ جب بھی ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے، میں جو بھی خط کھولتا ہوں، جو بھی ای میل پڑھتا ہوں، اس میں یا تو امداد کی درخواست ہوتی ہے یا کسی این جی او کا تعارف یا پھر کالم لکھنے کا ملفوف مطالبہ۔ کوئی کہتا ہے کہ میں پچاس لاکھ کا مقروض ہوں، مجھے کسی سے پچیس تیس لاکھ ادھار لے دیں، کوئی کہتا ہے کہ میں ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں، میرے لئے کسی اسپانسر کا بندوبست کر دیں، کوئی کہتا ہے کہ آمدنی بہت کم ہے اور بچوں کا بوجھ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے، مجھے برطانیہ یا امریکا کے ویزے کا کوئی بندوبست کر دیں، کوئی کہتا ہے کہ فلاں بڑا شخص آپ کا واقف ہے یا آپ نے بیرونِ ملک فلاں شخص کے بارے میں کالم لکھا تھا، آپ اس سے کہہ کر مجھے قرضِ حسنہ لے دیں یا مجھے باہر سیٹ کرا دیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ہم نے فلاں ہسپتال بنایا، فلاں تعلیمی ادارہ قائم کیا، آپ کالم میں اس کی تعریف کر دیں، ہمیں قربانی کی کھالیں مل جائیں گی، اہلِ خیر ہماری امداد فرما دیں گے اور یوں ہمارا ادارہ پھل پھول جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

یہ سلسلہ جب دنوں سے مہینوں اور مہینوں سے برسوں تک پھیلتا ہے تو انسانی صبر جواب دے دیتا ہے اور اس وقت شدید خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس ہجوم میں کوئی نہ کوئی ایسی آواز ہو جو قریب آ کر کہے ''میں امداد لینے والا نہیں بلکہ امداد دینے والا ہوں'' کوئی نہ کوئی ایسا ضرور ہو جو کسی مدد امداد کے بغیر کوئی ادارہ چلا رہا ہو، جسے کچھ حاصل کرنے کا لالچ نہ ہو، جس نے باہر چندے کا بکس نہ رکھا ہو۔ یقین فرمایئے مجھے آج تک صرف یہی تین حضرات ملے ہیں

۔پہلے صاحب نے جب یہ کہا کہ ''میں ضرورت مندوں کی اتنی ضرورت پوری کر سکتا ہوں''تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔

اور جب میں نے دوسرے سے عرض کیا''حضور میں بچوں کے لئے پانی کا ایک کولر اور بیٹھنے کے لئے ایک نئی دری پیش کرنا چاہتا ہوں''وہ مسکرائے اور آہستہ آواز میں بولے''میرے محترم! ہمیں اس کی ضرورت نہیں' پانی کا گھڑا موجود ہے' اس کا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے اور میٹھا بھی' آپ جس دری پر اس وقت بیٹھے ہیں وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے' ایک دو سال نکال جائے گی۔اس دوران میری بیوی نئی دری بن لے گی اور ہم اس کی جگہ وہ بچھا لیں گے۔ چھت پر پنکھا موجود ہے' جب بجلی ہوتی ہے تو اس کی ہوا سے بھی لطف اندوز ہو جاتے ہیں و گرنہ کھلے دروازوں سے اللہ تعالیٰ کی ٹھنڈی ہوا کافی ہے۔کتابوں کی ہمیں ضرورت نہیں ہوتی' ایک کتاب دو تین سال نکال جاتی ہے' لکھنے کے لئے کاغذ اور پنسلیں بچوں کو کوڑے میں سے مل جاتی ہیں۔آپ یقین کریں کہ ان بچوں میں ایک دوسرے کے لئے ایثار و قربانی کا بہت جذبہ ہے خود بھوکے رہ کر بھی اپنے ساتھی کو اپنے حصے کا کھانا کھلا دیتے ہیں۔

بچوں کی دال روٹی اور چائے کے لئے میری تنخواہ کافی ہے۔ہاں البتہ کبھی وضو کے لئے پانی کم پڑ جاتا ہے لیکن وہ بھی بچے سرکاری نلکے سے بھر لاتے ہیں۔ بس اللہ کا کرم ہے' ہم بہت سکھی اور خوش ہیں۔میں نے رقم کے لئے اصرار کیا تو خوشبودار لہجے میں بولے''برادرِ محترم! اللہ کو اوپر والا ہاتھ نیچے والے سے زیادہ پسند ہے' آپ نہیں چاہتے کہ ہم لوگ اللہ کے پسندیدہ لوگوں میں شامل رہیں۔''میں نے عرض کیا کہ''میں اللہ کے لئے دینا چاہتا ہوں۔'' انہوں نے قہقہہ لگایا''لینے والا ہاتھ اللہ کا نہیں ہوتا' یہ ہاتھ''انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا''یہ ہاتھ جس دن پھیل گیا یہ اللہ کا ہاتھ نہیں رہے گا''میری آنکھوں میں آنسو آ گئے' میں نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا کہ آنکھوں کی بیتابی کا راز نہ کھل جائے۔انہوں نے اپنا ایک چھوٹا سا رومال میری طرف بڑھایا اور میں نے اپنے وہ آنسو اس رومال میں سنبھال لئے' یہ رومال آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔وہ شخص بھکاریوں کے اس ملک میں میری زندگی کا پہلا سخی تھا۔

رہے نام میرے رب کا جو دلوں کے حال سے بھی واقف ہے!

بروز جمعۃ المبارک ۱۲/صفر ۱۴۳۱ھ ۲۸ جنوری ۲۰۱۰ء

خونی لکیر

خواب دیکھنے والوں اور مسکراہٹوں، پھولوں کے ہاروں اور ہزاروں سال پرنی موسیقی کی تانوں پر جھومنے والے اس مختصر ہجوم کو جو آج کل میرے ملک کے اخبارات اور ٹیلی ویژن اسکرین پر چھایا ہوا ہے، میں صرف چند لمحوں کے لئے حقیقت کی دنیا کے ایک جہنم میں لیجانا چاہتا ہوں۔ یہ وہ عبرت کدہ ہے جو اس برصغیر کی تاریخ ہے۔ یہ وہ زخم ہے جو کئی سالوں سے رس رہا ہے، یہ وہ چیخ ہے جو مسلسل گونج رہی ہے۔ یہ منظر نہ تو اگست ۱۹۴۷ء کا ہے جب ملک کے طول و عرض میں لاشوں سے بھری ٹرینیں وصول ہو رہی تھیں اور کوئی اجڑا ہوا گھر ایسا نہیں تھا جو اپنے عزیزوں، پیاروں کے تڑپتے لاشے چھوڑ کر نہ آیا ہو بلکہ ہم نے تو اس دن اپنی غیرت کو ایسی نیند سلا دیا کہ اب تک آنکھ نہیں کھل رہی۔ ہماری سوا لاکھ سے زائد بچیاں آج بھی آسمانوں کی طرف اشکبار آنکھوں سے اپنے رب سے ضرور راز و نیاز کرتی ہونگی کہ کہاں ہیں ہمارے والی وارث جو ہمارے سروں کو گھروں میں بھی ننگا نہیں دیکھتے تھے اور نہ ہی یہ منظر اس دور کا ہے کہ جب ہمارے اور بھارت کے درمیان نفرتیں عروج پر تھیں، یہ آج کے شب و روز کا چیختا چلاتا منظر ہے۔

یہ جوہاپورہ کی کچی آبادی ہے جسے بھارت میں رہنے والے جھونپڑی کا نام دیتے ہیں، یہ جوہاپور آج سے آٹھ سال پہلے آباد نہیں تھا۔ فروری ۲۰۰۲ء سے پہلے یہاں کسی بستی کا نام و نشان نہ تھا، یہ بے خانماں، اجڑے، لٹے پٹے مسلمانوں کی بستی ہے جو احمد آباد سے صرف ۵ کلو میٹر دور خوف کے عالم میں آباد ہو گئی تھی۔ اس بستی میں زمینوں پر بچھانے والے بستر بیچنے والا ایک انیس سالہ نوجوان تیمور علی ایک انگریز صحافی ''رچرڈ برنز'' کے سامنے صرف چند دن پہلے ہچکیوں سے رونے لگ گیا۔ اس نے کہا کہ میں گجرات کے پچاس لاکھ مسلمانوں میں سے ایک ہوں۔ میرے پچیس رشتہ دار بلوائیوں نے قتل کر دیئے، میری ستر سالہ دادی کو زندہ جلا دیا اور یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہوا، میں زخمی حالت میں بچ کر اس متعفن علاقے میں آگیا ہوں لیکن آج بھی رات کو آگ میں پھینکے ہوئے بچوں اور عورتوں کی وہ آوازیں سنائی دیتی ہیں جو وہ بار بار اللہ کے نام پر مدد کے لئے بلند کر رہی تھیں۔

تیمور علی صرف ایک نہیں اس جیسے ہزاروں لٹے پٹے لوگ یہاں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ ان مسلمانوں میں ڈاکٹر بھی ہیں انجینئر بھی اور سرکاری ملازم بھی۔ یہ سب اسی کچی آبادی سے روزانہ اسی احمد آباد شہر میں جا کر ملازمت کرتے ہیں جہاں اب مسلمانوں کا ٹھکانہ تک نظر نہیں آتا ہے البتہ مسلمانوں کے کچھ جلے ہوئے گھر اور دوکانیں آج بھی عبرت کے طور پر موجود ہیں جبکہ مسلمانوں کے مکانوں کی ایک کثیر تعداد پر ہندوؤں نے قبضہ جما لیا ہے۔ گلبرگ کے علاقے میں مسلمان ممبر اسمبلی احسان جعفری کا گھر وہ تماشہ گاہ ہے جس کی جلی ہوئی خاکستر سے اس کے خاندان کے ۳۸ مرد و زن کی لاشیں نکلی تھیں۔ اس گھر کے دروازے اور کھڑکیاں آج بھی ملک کی سب سے بڑی سیکولر جمہوریت کے منہ پر طمانچہ ہے اور عین اس گھر کے سامنے ہندوؤں کی ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی دکانیں ہیں جہاں دن رات وہ گیت اونچی آواز میں بلند ہوتے رہتے ہیں جن سے اب میرے ملک کا ہر کوچہ اور ہر محلہ بھی آشنا ہو چکا ہے اور ایک خاص چینل ہر چند منٹ کے بعد ''آشا'' کے عنوان سے ایک خاص گیت نشر کر رہا ہے۔

جوہاپورہ کی بدبودار اور ناقابل رہائشی آبادی کے بالکل ساتھ ساتھ ہندوؤں کے مکانات کی ایک لمبی قطار ہے جس کے ارد گرد خاردار تار کی باڑ ہے، اونچی

اونچی دیواریں ہیں اور ان دیواروں پر سیمنٹ میں شیشے کے ٹکڑے کاٹ کر لگائے گئے ہیں۔ احمد آباد شہر کے وہ مکانات جو جلا دیئے گئے ہیں جن کے کھلے دریچوں اور صحنوں میں خزاں کے گرتے پتوں اور پھینکے جانے والے کوڑا کرکٹ کے سوا اب کچھ نظر نہیں آتا' ہاں اگر کوئی جوہاپورہ کا مسلمان وہاں آنکلتا ہے تو اسے دلدوز چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں' ہندو غنڈوں کے ہاتھوں لٹتی ہوئی مسلمان عورتوں کی آہ وبکا سے اس کے کان پھٹتے ہیں' جلتے ہوئے معصوم بچوں کے چہرے اسے یاد آجاتے ہیں اور وہ اس منظر سے بھاگ کر اس بستی میں جا چھپتا ہے جسے مسلمانوں کی بستی کہنے میں اور جس کے چہرے پر بے خانماں اور بے یار و مددگار ہونے کا دکھ لکھا ہوا ہے۔

یہ وہ دو قومی نظریہ ہے جو آج احمد آباد کی سرزمین پر تحریر ہوا ہے لیکن اس سارے المیے میں ایک واقعہ مجھے خوف کے ایک عجیب عالم میں لے جاتا ہے۔ احمد آباد سے تھوڑی دور مسلمانوں کی ایک بستی نارودہ پاتیہ ہے' اسی چھوٹی سی بستی ۹۱ مسلمان بچے اور عورتیں قتل کر دیئے گئے تھے' اس بستی میں کوئی اسکول نہیں تھا۔ یہ معصوم بچے اور بچیاں احمد آباد کے علاقے میں پڑھنے جاتے تھے۔ اس حادثے کے چند دن بعد اس بستی کے مسلمان اینٹ اور گارے میں لت پت کھڑے تھے اور اس بستی کے بالکل مرکز میں اپنے بچوں کے لئے اسکول تعمیر کر رہے تھے۔ ایک سماجی کارکن عبدالستار جو اس اسکول کی تعمیر میں پیش پیش تھا' جب اس سے انگریز صحافی ''رچرڈ برنز'' نے پوچھا کہ صرف چند سو گز پر اسکول واقع ہے تو ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ اس نے تڑپ کر سہمے ہوئے جواب دیا کہ دنیا کی کوئی تسلی کوئی وعدہ مسلمانوں کے دلوں سے یہ خوف نہیں نکال سکتا کہ ان کے بچے اور بچیاں اگر ہندوؤں کے علاقے میں پڑھنے جائیں تو شام کو زندہ گھر واپس آئیں گے بھی یا نہیں' ان کی عزتیں بھی محفوظ ہونگی یا نہیں۔

اس انگریز صحافی نے مضمون کے آخر میں ایک چونکا دینے والا واقعہ بھی تحریر کیا ہے کہ میں نے جب تیمور یا اس جیسے دوسرے غمزدہ افراد کی مالی مدد کرنا چاہی تو انہوں نے بڑی محبت سے میری اس مدد کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اگر بھیک مانگنا ہی مقصود ہوتا تو آج ہم اقتدار کے ایوانوں میں ہوتے' اعلیٰ مناصب کے مزے لوٹ رہے ہوتے۔ ان مسلمانوں کو تو اس بات کی سزا ملی ہے کہ انہوں نے باوجود استحقاق کے ملازمتیں نہ ملنے پر اپنے چھوٹے چھوٹے کاروبار شروع کر لئے' ترقی کرتے کرتے دنیا کے کاروباری اداروں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے دوسرے کاروبار کے ساتھ ساتھ ''ڈائمنڈ'' کی تراش خراش جیسے کام پر بھی اپنا سکہ جما لیا تو ان متعصب ہندوؤں نے اس ترقی سے خوفزدہ ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کل کلاں یہ مضبوط اور طاقتور مسلمان بھارت کی سیاست پر قبضہ نہ کر لیں' جس کی بناء پر بھارت کے مسلمانوں کو اس عذاب سے دوچار کر دیا گیا۔

مجھے معلوم ہے کہ میرے ملک کے بہت سے صاحبان جاہ و حشم کو نوجوانوں کی ٹولیوں کو' دانشوروں کے گروہوں کو ایشور یا رائے کی مسکراہٹ اچھی لگتی ہے' ارمیلا کی آمد پر ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں' سونو نگم اور دلیر مہدی کے گانوں پر ان کا بے اختیار رقص کرنے کو جی چاہتا ہے مگر میں اپنی اس بے خوابی کا

کیا کروں جو صرف اس لئے میرے گھر میں بسیرا کر لیتی ہے کہ عین ان مسکراہٹوں، گیتوں اور رقص کرتی خوبصورتیوں کے ساتھ ساتھ وہ جھونپڑپٹی ہے جس میں پچھلے آٹھ سالوں سے ایک لٹی پٹی قوم آباد ہے، خوف زدہ ہے، مجبور ہے، تعفن زدہ علاقے میں رہتی ہے، بس میرا اور ان کا ایک ہی رشتہ ہے کہ وہ اسی اللہ پر ایمان رکھتی ہے، اسی رسول اکرم ﷺ کا کلمہ پڑھتی ہے، اسی دین سے وابستہ ہے، جس سے میں ہوں۔ پتا نہیں کیوں میرے آنسو نکل آتے ہیں جب میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ ارمیلا، میرا، ریشم اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں کے لئے واہگہ عبور کرنا کتنا آسان ہے لیکن جوہاپورہ، نارودہ پاتیہ کا مسلمان احمد آباد کے ہندو علاقے میں جاتے ہوئے خوف سے کانپ اٹھتا ہے۔ گھر والے اس کی واپسی تک دستِ بدعا رہتے ہیں۔ دو قومی نظریے کی جو لکیر ہم پھولوں کے ہاروں سے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں، اسے بھارت کے تنگ نظر ہندو مسلمانوں کے خون سے پھر کھینچ دیتے ہیں۔

پاکستان کے ایک بہت بڑے چینل پر دن رات بھارت کی دوستی کا جو محبت بھرا ترانہ دہرایا جا رہا ہے اس کے آخر میں ہمیں یہ تلقین کی جا رہی ہے کہ ان لکیروں کو زمین پر ہی رہنے دو، دلوں میں نہ رہنے دو۔ بھلا آپ ہی مجھ کم عقل کو بتائیں کہ جس ملک کا صدر اور اقتدار کے مزے لوٹنے والے دن رات جس بھارت کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھانے کے لئے چہروں پر عاجزی سجائے دنیا کے ہر پلیٹ فارم پر مذاکرات کی بھیک مانگتے پھریں، بھارت کے ایک چینل کی اینکر پرسن ملک کے وزیرِ خارجہ شاہ محمود قریشی کو پاکستانی وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کے بیان پر جھاڑ پلا دیں اور شاہ محمود قریشی شرمندگی کے اظہار کے لئے الفاظ ڈھونڈتے پھریں تو پھر قومی غیرت کے ان لٹیروں کو حکمرانی کا حق کس نے دیا ہے۔ یہ لمحہ فکریہ پارٹی کے ان جیالوں کے لئے بھی ہے جو آنکھیں بند کر کے ایسے افراد کو اقتدار کے ایوانوں تک پہنچاتے ہیں۔

رہے نام میرے رب کا جس نے حقوق العباد پورے کرنے کا حکم دے رکھا ہے!

چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب
اجڑ گئے ہیں پرانی محبتوں کے مزار

بروز اتوار ۱۴/صفر ۱۳۴۱ھ ۳۰ جنوری ۲۰۱۰ء

وفاداری کے داغ

آج سے بائیس سال قبل سنہرے بالوں، تیکھے نقوش اور خوبصورت شہد کے رنگ جیسی آنکھوں والی ایک لڑکی سنڈی لندن میں ایک شخص کی دیوانی ہو گئی۔ دن رات اس کے ساتھ گھومنے لگی۔ یہ شخص یوں تو معمولی شکل وشباہت رکھتا تھا۔ اس میں شہرت، دولت یا لڑکیوں کو دل موہ لینے والی جسمانی خوبصورتی نام کو نہ تھی مگر یہ لڑکی اسے لئے شہر بہ شہر گھومنے لگی اور پھر ایک دن وہ اپنے اس رومانوی سفر کے دوران اٹلی کے شہر روم پہنچی۔ یہ شہر اس بیچارے مورڈی چالی دینونو کی آزاد زندگی کا آخری شہر ثابت ہوا۔ سنڈی کی اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کے ایجنٹ رات کے اندھیرے میں ان کے محبتوں بھرے کمرے میں داخل ہوئے اور اگلے دن یہ شخص تل ابیب کے ایک جیل خانے میں تھا جہاں اس وقت سے لیکر آج تک طویل ترین قیدِ تنہائی کاٹ رہا ہے۔

دینونو ایک عام سا معمولی صلاحیت رکھنے والا سائنسداں تھا جس نے فزکس کی تعلیم کے دوران اپنے لئے ایٹمی ٹیکنالوجی کا شعبہ چن لیا اور پھر اس نے کسی حد تک مہارت بھی حاصل کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مصر سے صحرائے سینا میں شکست کھانے کے بعد اسرائیل ایٹمی طاقت بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں دینونو کو اسرائیلی ایٹمی پلانٹ ڈیمونا میں ملازمت مل گئی۔ ادھر اسرائیل اپنی ایٹمی طاقت کو مضبوط بنانے میں مصروف ہو گیا اور ادھر فلسطینیوں پر ظلم و تشدد کی انتہا کر دی گئی۔ بچے، عورتیں، نوجوان اسرائیلی گولیوں کا نشانہ بنتے تو دینونو کا دل بہت کڑھتا اور وہ اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر اس دکھ کا اظہار بھی کرتا اور پھر ایک دن وہ اسرائیل کے ایٹمی پروگرام کی دستاویز اور تصاویر لیکر وہاں سے بھاگ گیا اور ٹائمز آف لندن کے دفتر میں سب معلومات پہنچا دیں۔

اگلے ہی شمارے میں ۱۹۸۶ء کے اوائل میں یہ معلومات اور تصاویر ایک دھماکے کی صورت میں شائع ہوئیں۔ اخبار نے ان دستاویز کی بنیاد پر بتایا کہ اسرائیل کے پاس اس وقت دو سو کے قریب ایٹمی ہتھیار ہیں جن میں ہائیڈروجن بم بھی شامل ہیں اور اسرائیل کا ہتھیار لیجانے کا نظام اتنا مضبوط ہے کہ وہ تمام قریبی مسلمان ممالک کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ دنیا اس بات پر مزید حیران رہ گئی کہ اسرائیل اتنا چھوٹا سا ملک ہے کہ وہاں ایٹمی دھماکے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تو پھر یہ کیا ہو گیا۔ دینونو نے جب کہا کہ ۱۹۷۹ء میں اسرائیل نے نسل پرست جنوبی افریقہ کی حکومت کے تعاون سے بحرِ ہند کے ساحلوں پر یہ ایٹمی ٹیسٹ کئے تھے تو دنیا کو یاد آ گیا کہ امریکی سیٹلائٹ نے اسے ریکارڈ بھی کیا اور پھر یوں خاموش ہو گئے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

یہ شخص اسرائیل کی عدالت میں پیش ہوا، دنیا کو اسرائیل کی ایٹمی صلاحیت کا پتہ دینے والے شخص کو دنیا کا کوئی ملک بچانے کے لئے نہیں آیا، کسی حکومت نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ اسے اٹھارہ سال قیدِ تنہائی کی سزا دے دی گئی۔ ان سالوں میں وہ صرف اس وقت خوش ہوتا جب حماس کا کوئی خودکش حملہ آور کسی اسرائیلی کی جان لیتا، وہ قید خانے میں ناچنے لگ جاتا، اپنے چھوٹے سے سیل میں گھوم گھوم کر ڈانس کرتا اور جس دن اسرائیل کے ہاتھوں کوئی فلسطینی شہادت کی موت حاصل کرتا، وہ دن اس کے لئے غم واندوہ کا دن ہوتا، کھانا پینا چھوڑ دیتا اور بس ایک کونے میں پڑا رہتا۔

جب اس قید خانے کی تنہائی میں ۱۸ سال بیت چکے اور اس کی رہائی کے دن قریب آئے تو اس نے کہا کہ اگر دنیا امن چاہتی ہے تو اسے فوراً اسرائیل کا خفیہ ایٹمی ری ایکٹر ڈانمو تباہ کر دینا چاہئے ورنہ اس سرزمین پر ہر انسان خوف میں زندگی بسر کر رہا ہو گا۔ ۲۱/اپریل ۲۰۰۵ء اس کی رہائی کا دن تھا۔ اس کا خوفزدہ بھائی اسرائیل کے شہر پہنچا اور جافا کے اک فلیٹ میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ اگر جیل سے رہائی کے بعد میرے بھائی کو کچھ ہوا تو اس کے خون کی ذمہ دار برطانیہ کی بزدل حکومت ہو گی۔ ۲۲/اپریل کی شام وہ جیل سے باہر آیا تو وہ اس وقت بھی ایک آزاد شخص نہیں تھا۔ دنیا کی کوئی حکومت اسے قبول کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اسے چھ نکات پر مشتمل ایک آرڈر بتا دیا گیا۔ وہ خوفزدہ ہو یا نہیں اسے اسرائیل کے کسی شہر میں رہنا ہو گا۔ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر سفر نہیں کر سکے گا' وہ ٹیلیفون پر کسی غیر اسرائیلی سے بات نہیں کرے گا۔ وہ کسی سفارت خانے کے سو میٹر' سرحد کے تین سو میٹر کے اندر اور کسی ائرپورٹ کے نزدیک داخل نہیں ہو گا' اسے صرف محدود آزادی دی گئی ہے اور اسرائیلی حکومت طویل عرصے تک ایک ایسا قانون کی منظوری میں مصروف رہی کہ کس طرح اسے دوبارہ عمر بھر کے لئے زندان کی نذر کر دیا جائے۔

دینو نوامریکی ماں باپ کا لے پالک بچہ ہے' اس کی رگوں میں ایک یہودی کا خون ہے' اس کے باوجود دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کے کارنامے پر نہ تو خوش ہوئی' نہ اسے بچانے آئی۔ ایسے میں مجھے اپنے ملک کے وہ سائنسدان بہت یاد آئے جن پر یہ سب کچھ بیتا لیکن انہوں نے اپنے ملک کے پروگرام کے بارے میں ایک لفظ منہ سے نہ نکالا۔ سوچئے اگر کوئی ایسا کر دیتا تو کتنے ملک اس کو بچانے کے لئے دوڑ رہے ہوتے' کتنی انسانی حقوق کی تنظیمیں اس کے لئے امن مارچ کر رہی ہوتیں' شائد کئی سال پہلے انہیں امن کا نوبل امن انعام مل چکا ہوتا۔ دہرے معیار کی اس دنیا میں جو ذلت و رسوائی بھی مقدر میں آئے کسی انعام سے کم نہیں خواہ وطن سے محبت کے صلے میں آئے یا دشمنوں کی آنکھ میں چبھتے کانٹے کی صورت میں۔ یہ تو وہ داغ ہیں جن سے آج نہیں تو کل روشنی پھوٹے گی' وطن سے محبت کی' وفاداری کی

پاکستان کے قومی ہیروز کے سردار ڈاکٹر عبدالقدیر پر اپنے ہی ملک میں کیا گزری' اس شریف النفس اور ملی محبت سے سرشار کو مجبور کیا گیا کہ وہ ٹیلیویژن پر آکر سارا الزام قبول کرتے ہوئے اپنی بھیگی آنکھوں سے نوجوان سائنسدانوں کو یہ پیغام دے کہ آئندہ وہ پاکستان کو مضبوط کرنے کی کوئی ایسی کوشش نہیں کریں گے جس کی بناء پر انہیں بھی اس طرح ذلیل و رسوا کیا جائے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستانیوں کے دلوں میں ڈاکٹر عبدالقدیر اب بھی اسی طرح مقبول اور پسندیدہ ہیں جس طرح وہ پہلے تھے لیکن اب ان خبروں سے دل پریشان ہے کہ ہمارا ہیرو اس بات کی کھلی دہائی دے رہا ہے کہ بلیک واٹر کے لوگ اس کی جان کے درپے ہیں اور اس خبر کو اس وقت زیادہ تقویت ملی جب ایک امریکی اخبار میں یہ خبر چھپی کہ پینٹاگون نے بلیک واٹر والوں کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر کو آسان موت سے ختم کر دیا جائے۔

رے نام میرے رب کا جو زندگی اور موت کا مالک ہے!

جوہری کو کیا معلوم، کس طرح کی مٹی میں
کیسے پھول ہوتے ہیں
کس طرح کے پھولوں میں کیسی باس ہوتی ہے
جوہری کو کیا معلوم
جوہری تو ساری عمر پتھروں میں رہتا ہے
زر گروں میں رہتا ہے
جوہری کو کیا معلوم
یہ تو بس وہی جانے
جس نے اپنی مٹی سے
اپنا ایک اک پیماں، استوار رکھا ہو
جس نے حرفِ پیما کا اعتبار رکھا ہو
جوہری کو کیا معلوم
کس طرح کی مٹی ہیں کیسے پھول ہوتے ہیں
کس طرح کے پھولوں میں کیسی باس ہوتی ہے

بروز سوموار ۱۵ صفر ۱۳۴۱ھ ۳۱ جنوری ۲۰۱۰ء

سچا کون؟

ایوان ریڈلی کا تعلق برطانوی مشہور اخبار ''سنڈے ایکسپریس تھا۔ وہ دو افغان شہریوں کے ساتھ ستمبر ۲۰۰۱ء میں افغانستان میں داخل ہوئی۔ اس نے افغان عورت کا روپ دھار رکھا تھا۔ ان دنوں افغانستان پر طالبان کی حکومت تھی۔ امریکا میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا واقعہ تازہ ہوا تھا۔ بش انتظامیہ افغانستان پر حملے کی پلاننگ کر رہی تھی اور دنیا بھر کا میڈیا پاکستان میں جمع تھا۔ یہ لوگ افغانستان جانا چاہتے تھے لیکن افغان حکومت نے صحافیوں کے داخلے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ ان سنسنی خیز لمحوں میں ''ایوان ریڈلی'' بہروپ بدل کر افغانستان میں داخل ہو گئی لیکن بد قسمتی سے ۲۸ ستمبر کو وہ پکڑی گئی۔ وہ ۸/اکتوبر ۲۰۰۱ء تک طالبان کی قید میں رہی۔ ان دس دنوں نے ریڈلی کی کایا پلٹ دی۔ اسے طالبان اور طالبان کے ذریعے اسلام کا وہ رخ نظر آیا جس سے مغربی دنیا محروم چلی آ رہی تھی۔ اس نے قید سے رہائی کے بعد طالبان کی شرافت 'نیک نیتی' مہمان نوازی اور خلوص کی ایسی تصویر کھینچی کہ دنیا حیران رہ گئی۔

ریڈلی نے "ان دی ہینڈ آف دی طالبان" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی جو ۸ دسمبر ۲۰۰۱ء کو منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب میں اس نے لکھا ''میں پاسپورٹ اور ویزے کے بغیر ان کے ملک میں داخل ہوئی تھی جو یقیناً جرم تھا لیکن طالبان نے گرفتاری کے بعد مجھے بہت عزت و آبرو سے رکھا۔ وہ مجھے مہمان یا بہن کہتے تھے۔ وہ لوگ نیچے سوتے تھے لیکن میرے لئے انہوں نے آرام دہ پلنگ کا بندوبست کیا ہوا تھا' خود گرمی میں رہتے تھے لیکن مجھے انہوں نے اے سی لگا کر دیا۔ میں کھانا نہیں کھاتی تھی تو وہ پریشان ہو جاتے تھے اور باری باری آ کر نیچی نگاہوں سے میرا حال پوچھتے تھے۔ وہ نیلی آنکھوں والے انتہائی خوبصورت جوان تھے لیکن کیا مجال ہے کہ کسی نے ان دس دنوں میں آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی ہو۔ میں نے خود کو جتنا محفوظ ان دس دنوں میں پایا' اتنی ''سیکور'' محفوظ میں پچھلے ۴۳ برسوں میں نہیں رہی تھی"۔

ریڈلی نے آخر میں لکھا ''میری ایک بیٹی ہے' اگر کوئی شخص مجھے چوائس دے تو میں اس کے لئے لندن کی بجائے کابل کا انتخاب کروں گی کیونکہ جتنی محفوظ وہ پسماندہ کابل میں ہو گی اتنی جدید اور ترقی یافتہ لندن میں نہیں رہے گی۔'' ریڈلی کے خیالات سے امریکا اور برطانیہ بوکھلا گئے۔ برطانوی پریس نے اسے ایک نفسیاتی بیماری کا شکار قرار دے دیا جس میں مغوی اپنے اغواء کنندہ کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس کی نقل و حرکت پر پابندی لگ گئی اور اس کے فون ٹیپ ہونے لگے۔ اسے اس قدر خوفزدہ کیا گیا کہ ایک روز اس نے یہ تک کہہ دیا ''سی آئی اے مجھے قتل کروانا چاہتی ہے۔'' ریڈلی کا قصور یہ تھا کہ کہ اس نے ایک ایسے ملک کی حقیقی تصویر پیش کر دی تھی جسے امریکا اپنا دشمن کہتا تھا' مغربی دنیا کے لئے اس کے خیالات زلزلہ تھے۔

وہ دنیا حیران تھی جنہیں ظالم' جاہل' ہٹ دھرم' ضدی اور ناسمجھ کہا گیا' جنہیں پورا مغرب غیر مہذب' ظالم اور دہشت گرد ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس مغرب کی ایک بیٹی غیر قانونی طریقے سے ان کے ملک میں داخل ہوتی ہے تو وہ اس کی اتنی تواضع کرتے ہیں کہ وہ واپسی پر سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ خریدتی ہے' اس کا مطالعہ کرتی ہے اور پھر دنیا کو بتاتی ہے' اسلام وہ نہیں ہے جو بش اور ٹونی بتا رہے ہیں بلکہ اسلام وہ ہے جو قرآن حکیم بتاتا اور طالبان دکھاتے ہیں۔

یہ ایک جاہل، غیر مہذب اور بد اخلاق قوم کی اخلاقیات تھیں۔ اب آپ دنیا کی مہذب ترین، پڑھی لکھی، جدید اور ترقی یافتہ قوم کی اخلاقیات ملاحظہ کیجئے۔ امریکی فوج نے ۲۰۰۳ء میں عراق کے معصوم اور بے گناہ شہری پکڑے، انہیں ۸۰۰ بریگیڈ ملٹری پولیس کے حوالے کیا، وہ انہیں ابو غریب جیل میں لے گیا۔ وہاں ان کو برہنہ کیا گیا، عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ ۴۱ سالہ لڑکی کو برہنہ کر کے اس کے بھائی کے سامنے کھڑا کیا گیا، حساس اعضاء پر بجلی کا کرنٹ لگایا گیا۔ مردوں کے منہ پر عورتوں کے انڈرویئر چڑھائے گئے، گردنوں میں کتے کے پٹے باندھ کر انہیں گھسیٹا گیا، ان پر کتے چھوڑے گئے، انہیں مکے، ٹھڈے اور تھپڑ مارے گئے اور انہیں غلاظت کھانے پر مجبور کیا گیا۔ امریکا اور برطانیہ کی یہ اخلاقیات سب سے پہلے امریکی چینل سی بی ایس نے دکھائی، پھر ڈیلی مرر نے اور اس کے بعد نیویارک ٹائم، واشنگٹن پوسٹ، نیویارکر اور ٹائم نے اور اس کے بعد پوری دنیا کے میڈیا نے۔ اس وقت دنیا کی چھ ارب سے زائد آبادی دنیا کی مہذب ترین اقوام کی اخلاقیات، تہذیب، شائستگی اور انسانی حقوق پر یقین کی تصویر دیکھ چکی ہے۔

ذرا دیکھئے ایک طرف ریڈلی کے غیر مہذب اور جاہل طالبان تھے اور دوسری طرف ابو غریب کے مہذب، بااخلاق اور انسان دوست ٹام، ڈک اور ہنری۔ ایک طرف پسماندہ ترین قوم تھی اور دوسری طرف مہذب لوگ۔ میں نے امریکا کی ایک اور خاتون صحافی کا مضمون بھی پڑھا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ۲۴ دسمبر ۱۹۹۹ء میں بھارت کا ایک مسافر طیارہ کٹھمنڈو سے اغوا ہوا تھا جسے بعد ازاں قندھار لایا گیا تھا۔ ان دنوں طالبان نے چند صحافیوں کو قندھار آنے کی اجازت دی تھی۔ ان صحافیوں میں یہ خاتون بھی شامل تھی۔ اس خاتون نے لکھا، میں رات کو قندھار ایئرپورٹ پر طیارے کے قریب بیٹھی تھی۔ شدید سردی تھی، خون ہڈیوں میں جم رہا تھا۔ طالبان کا وزیرِ خارجہ سائیکل پر طیارے کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا، میں سردی سے کپکپا رہی تھی، اس نے سائیکل روکا اور اپنی چادر اتار کر مجھے دے دی۔ اس کے بعد وہ پوری رات تن کے تین کپڑوں میں طیارے کی حفاظت کرتا رہا اور میں اس کی موٹی اور گرم چادر اوڑھ کر بیٹھی رہی۔ آخر میں اس صحافی نے لکھا "دے آر گریٹ"۔

قارئین! اگر آپ کو یاد ہو تو ۷ جولائی ۲۰۰۸ء کو ریڈلی ایوان نے ایک کالم "قیدی ۶۵۰" لکھ کر ساری دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا کہ کس طرح ایک بے گناہ اور کمزور ڈاکٹر عافیہ بگرام افغانستان کی جیل میں قید ہے اور اس کی چیخوں سے جیل کے در و دیوار بھی لرز رہے ہیں۔ اس کے تین معصوم بچوں کو بھی اسی کے ساتھ کراچی سے اغوا کر کے بگرام کی جیل میں ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر عافیہ پر اس ظلم و تشدد کے بارے میں انہی کالموں میں کئی دفعہ ذکر ہو چکا لیکن کل جب ڈاکٹر عافیہ کے مقدمے کے فیصلے کی اطلاع ملی تو میرے لئے کوئی اچنبھے یا حیرانی کی بات بالکل نہیں تھی۔ میرا وجدان تو اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اب ظلم کی سیاہ رات ختم ہونے کو ہے اور ظلم جب بڑھ جائے تو نیست و نابود ہو جاتا ہے لیکن شرم کی بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر عافیہ کو میرے ملک کے سب سے بڑے شہر کراچی سے اغوا کیا گیا اور اگر ریڈلی اپنے کالم میں اس کا تذکرہ نہ کرتی تو ہم کیسے بے خبر لوگ ہیں کہ اپنی ایک بیٹی کے غائب ہونے پر بھی اقتدار کے نشے میں مدہوش تھے۔

ڈاکٹر عافیہ کے دو معصوم بچوں کی ابھی تک کوئی خبر نہیں کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔اسی کراچی کے ساحل سے ایک مسلمان بیٹی نے دہائی دی تھی تو یوسف بن حجاج نے اپنے نوجوان بھتیجے محمد بن قاسم کو راجہ داہر کو سبق دینے کے لئے بھیجا تھا اور تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس سے پہلے کفر، فسق و فجور ہی راجہ داہر کی حکومت کے وزیر اور مشیر تھے لیکن شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تو اب آیا کہ ہم نے کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ صدیوں بعد اسی زمین پر پھر ایسے راجہ داہر بھی اقتدار میں ہونگے جو اپنی بچیاں خود قصرِ سفید کے فرعونوں کے حوالے کر دیں گے اور اسی راجہ داہر کو گارڈ آف آنر کے ساتھ اس ملک سے رخصت کیا جائے گا اور ّج بھی وہ راجہ داہر اپنے آقاوں کی بدولت اپنے ان کارناموں کو انہی مغربی ممالک میں بڑے فخر سے بیان کرتا پھر رہا ہے اور ہمارے ملک کے صدر آصف زرداری ابھی تک اسی کی بنائی ہوئی پالیسیوں پر عمل کرتے ہوئے قصرِ سفید کے فرعون، مغربی ممالک کے نمرودوں اور بھارتی شداد بنئے کے سامنے اپنی جبیں جھکائے راجہ داہر سے کہیں زیادہ اپنی وفاداری کا یقین دلا رہے ہیں۔

میری شدید خواہش ہے کہ کاش! اس وقت دنیا کی کوئی طاقت ان دو خواتین کو ابو غریب کے سامنے کھڑا کر دے، دنیا بھر کے کیمرے ان پر لگا دیئے جائیں ، دنیا کے تمام ٹیلی ویژن آن کر دیئے جائیں اور پھر ان سے پوچھا جائے ''آپ کے ہم مذہب اچھے ہیں یا پھر غریب، جاہل اور دہشت گرد مسلمان'' اور پھر جو کچھ دو عورتیں کہیں اس کو سچ مان لیا جائے!

رہے نام میرے رب کا جو ارض و سما کا حقیقی مالک ہے اور اسی کی حاکمیت کو دوام ہے چاہے مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو!

دنیا کی معراج کو دیکھ اس کو کہتے ہیں پاتال
صحرا میں بھی پھینک دیا مایوسی نے آخر جال
مغرب کی پیشانی پر کس نے لکھا ہے دجال

بروز بدھ ۱۷ صفر ۱۴۳۱ھ ۲ فروری ۲۰۱۰ء

مہذب دنیا

عالمی امن جس قدر آج خطرات کی زد میں ہے اتنا شائد پہلے کبھی نہیں رہا ہوگا۔ ماضی کی سرد جنگ کے دوران بھی عالمی امن کے لئے کئی خطرناک موڑ آئے مگر دنیائے انسانیت کے لئے امید کی صورتیں بھی سامنے آتی رہیں اور اس قدر بے بسی اور بے کسی کا عالم کبھی نہ تھا' جو آج ہے۔ ایک تو ماضی میں دو برابر کی سپر پاور کے درمیان توازن کی صورت موجود تھی' دوسرے ایسے غیر ذمہ دار گروہ سامنے نہیں آئے تھے جو حرص ولالچ کی تسکین کے لئے اپنے بغض وعناد اور عداوت میں کسی بھی انتہا تک پہنچنے کے لئے اتنے آزاد ہوتے جیسے آج ہیں۔ جس طرح نو دولتیہ دولت نہیں پچا سکتا' اسی طرح نو حکومتیہ بھی اقتدار مشکل سے بچا سکتا ہے۔

ہندو کو صدیوں کے بعد اقتدار ملا اور اتنی بڑی سلطنت تو تاریخ میں کبھی نصیب نہیں ہوئی' جتنا بڑا بھارت ہے۔ قائدِ اعظمؒ کی توقع کے عین مطابق برہمن واقعی انتہائی خونخوار اکثریت ثابت ہوئی' جس نے اپنے ہاں کی اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں' عیسائیوں اور سکھوں پر مظالم کی انتہا کر دی۔ یہود کو بھی ہزاروں سال بعد سامراجیوں کے دھوکے سے ایک گٹھلی جتنا اسرائیل ملا تو وہ آپے سے باہر ہو گئے اور فلسطین کے مسلمانوں اور عیسائیوں پر ظلم و بربریت کے پہاڑ ڈھا دیئے گئے تاہم تشویش اور خطرے کی صورت اس وقت پیدا ہوئی ہے جب واحد سپر پاور کی باگ ڈور ایک لالچی اور غیر ذمہ دار گروہ کے ہاتھ میں آگئی جو ہر آنے والی حکومت کو اپنی مرضی پر چلانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ظلم و تشدد اور دھونس دھاندلی سے نہ کبھی امن قائم ہوا ہے اور نہ ظلم کرنے والے بچے ہیں۔ ظلم کے دن تھوڑے ہوتے ہیں مگر خطرات کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی۔

یہودی بزعم خویش خدا کی محبوب قوم ہیں اس لئے باقی سب انسان ان سے کمتر ہیں۔ برہمن نے جو طبقاتی معاشرہ قائم کیا' اس میں وہ خود بھگوان کا محبوب ہے۔ بت پرست معاشرے میں ہوتا ہی ایسا ہے کہ پروہت برابری کے قائل نہیں ہوتے۔ اسلام چونکہ مساوات' وحدت انسان اور اخوت کا علمبردار ہے اس لئے قدرتی طور پر مساوات کو ناپسند کرنے والے اس کے دشمن ہیں۔ اہلِ اسلام کے شدید ترین دشمن از روئے قرآن یہودی اور بت پرست تھے اور آج بھی ہیں' ایسے میں نئے عالمی سامراج کی بھی اصل شکار گاہ عالمِ اسلام ہے اس لئے اسرائیل' بھارت اور امریکا کی ٹرائیکا کی زد میں بھی یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ پچھلے دس سالوں سے سرزمین ایشیا کے پیداواری وسائل جو اتفاق سے زیادہ تر مسلمانوں کے پاس ہیں' سامراجیوں اور مفاد پرستوں کی زد میں ہیں۔ خطرات اس وقت حد سے زیادہ بڑھ گئے ہیں' جب دو گروہ ایشیا کے اندر سے اس لوٹ مار میں شرکت کے لئے بے قراری کا مظاہرہ کرنے لگے۔ عالمی امن کے لئے خطرات کی اصل یہی ٹرائیکا ہے جو جذبہ انتقام کی تسکین اور لوٹ مار کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے' یہی وجہ ہے نائن الیون جیسی سازش اور عراق پر جھوٹی تہمت کا بہانہ بنا کر عالمی امن کو تباہ کر دیا گیا ہے۔

رسول اکرم ﷺ کے دینِ اسلام میں کسی بے گناہ کو دھوکے سے قتل کرنا اور دہشت پھیلانا قطعی حرام اور ممنوع ہے مگر سازش اور جھوٹی تہمت سے تشدد کے خلاف متشددانہ جنگ اس سے بھی بڑا جرم ہے اور عدل وانصاف کے تقاضے پورے کئے بغیر خود ہی مدعی' خود ہی گواہ اور خود ہی عدالت بن جانا

بلکہ خود ہی اصل مجرم بھی ہونا انتہائی بھیانک جرم ہے اور عالمی امن کو اصل خطرہ اسی سے ہے۔ نئے عالمی سامراج کے نئے ایڈمنسٹریشن نے برسرِ اقتدار آتے ہی امن و سلامتی کے لئے پہلے سے ترسی ہوئی اور عدل و مساوات کی طالب دنیا کو تین تحفے دیئے ہیں۔ اوّل پہلے ہی سے لولی لنگڑی اقوامِ متحدہ کو بے اثر، بے وقعت اور دنیا کے لئے ناقابلِ اعتبار بنا دیا ہے۔ دوم یہ کہ ''جو ہمارے ساتھ نہیں وہ ہمارے خلاف ہے'' نے اختلافِ رائے اور ارادے کی آزادی سلب کر لیا اور یوں اندھی طاقت سے ہر رکاوٹ کو کچل دینے کا اعلان ہو گیا۔ نام نہاد حفظِ ماتقدم کے حملے کے حق نے تیسرا تیر چلایا جس نے دنیا کو ایک بار پھر جنگل کے پرانے قانون ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے حوالے کر دیا۔ اب کوئی بھی طاقتور، بش و او بامہ، شیرون و نیتن یاہو یا ایڈوانی، بال ٹھاکرے یا من موہن جب چاہے ظلم و جارحیت سے اپنے کمزور و مرعوب شکار پر جھپٹ سکتا ہے لیکن عالمِ اسلام کو دو اضافی تحفے بھی دیئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ گھناؤنی سے گھناؤنی سازش کر کے ہولناک سے ہولناک جرم کا چکر چلا کر الزام مسلمانوں کے سر تھوپا جا سکتا ہے کہ اب دہشتگردی صرف ان کا مشغلہ رہ گیا ہے۔

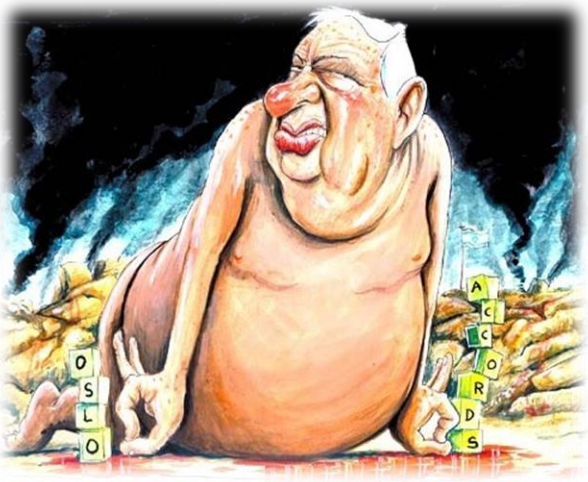

قیامِ اسرائیل اور تقسیمِ بنگال پر دہشت گردی کا بازار گرم کرنے والے یہودی اور ہندو تو کبھی تھے ہی نہیں اور نہ نہتے بے گناہوں پر یہود و ہنود کی ریاستی دہشتگردی یا افغانستان و عراق ہیں تباہی و بربادی کا ریکارڈ توڑنے سے۔ بش و او بامہ اور ان کے حلیفوں کی دہشت گردی تو پھولوں کے تحفے ہیں جو ہر حال میں مسلمانوں کو قبول کرنا ہونگے۔ نائن الیون کی گھناونی سازش اور عراق پر جھوٹی تہمت محض اس لئے تھی کہ تباہ حال افغانستان کے طالبان نے سنٹرل ایشیا کی دولت لوٹنے کے لئے راستہ دینے سے انکار کر دیا اور صدام نے نئے سامراج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنا تمام تیل پندرہ سال کے لئے روس، فرانس اور جرمنی کو بیچ دیا اور امریکی تیلی محروم ہوتے دکھائی دیئے تو اپنے پروردہ بلے کو میاوں کرنے کی سزا دینے کے لئے جھوٹی تہمت گھڑی گئی اور اس کے پیچھے اسرائیل کی ایک گہری سازش یہ بھی کارفرما تھی کہ اس علاقے میں صرف عراق کے پاس ایسی منظم فوج تھی جو اسرائیل کے وجود کے لئے خطرہ تھی۔ نیا اور پرانا سامراج تو اب دنیا کے سامنے بے نقاب ہو چکے ہیں مگر ان سامراجیوں کے جلو میں اپنا مفاد حاصل کرنے والے یہود و ہنود کی بھوک نہیں مٹ سکی، صیہونی بزعم خوش محفوظ اسرائیل کی فکر میں ہے خواہ یہ دیوار سے ہی ممکن ہو اور بھارتی مکار بنیا مقبوضہ کشمیر کی جنگِ آزادی کو ناکام کرنے کی فکر میں مرتا جا رہا ہے۔

افغانستان میں نیٹو اور نئے سامراج کے ساتھ ساتھ نئے سامراج کے گماشتے بھی امن قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ سفاک شیرون نے اپنا کام پہلے یاسر عرفات سے کروانا چاہا، لوگ پکڑے گئے، ظلم ہوا مگر عرفات پر یہ راز کھل گیا کہ شیرون قیامِ امن میں دلچسپی نہیں رکھتا، اس کے ذریعے آزادی پسندوں کو کچلوانے کی فکر میں ہے اور پھر اس کے بعد یاسر عرفات نے اپنی پالیسی کو تبدیل کر دیا، ادھر ہمارے سابق فاسق کمانڈو نے آزاد کشمیر کے مجاہدوں کو سابقہ آئی ایس آئی کے سربراہ اشرف قاضی کی وساطت سے زبردستی روک دیا اور طالبان کو پکڑ پکڑ کر امریکا کے حوالے کرنا شروع کر دیا جس کی بھاری قیمت وصول کرنے کا اعتراف بھی اپنی کتاب میں کیا مگر نہ تو افغانستان میں سامراجی گماشتوں کی تسلی ہوئی ہے اور نہ ہی چھ لاکھ سورماؤں کی کشمیر میں کمانڈ

کرنے والا جنرل دیپک اور دوسرے متعصب بنئے نہتے آزادی پسندوں کو دبا سکیں ہیں۔ دونوں یہی کہے جا رہے ہیں کہ ''پاکستان کچھ اور کرے'' جیسے وہ تو افغانستان اور مقبوضہ کشمیر میں سب کچھ کر چکے ہیں۔ اب ہمیں بھی کم از کم یا سر عرفات کی سطح پر آجانا چاہئے اور صرف ''دہشتگردی کی مذمت'' پر اکتفا کرنا چاہئے' یا پھر یہ کہ افغانستان سے تمام غیر ملکی فوج نکل جائے اور مقبوضہ کشمیر سے بھارتی مکار بنیا اپنے سورما بچا کر لیجائے تو شائد پاکستان کچھ کرنے کے قابل ہو سکے!

بات دراصل یہ ہے کہ عصرِ حاضر کا انسان قابلِ رحم ہے۔ خود غرضی اور مادی فوائد کے چکر نے اسے سکھ چین سے محروم کر دیا ہے۔ پھر سمٹتے فاصلوں 'وقت کی برق رفتاری ذرائع ابلاغ کی ہنگامہ خیزی نے دنیا کو ایک عالمی بستی بنا کر انسان سے اس کا سب کچھ چھین لیا ہے۔ یہ فضا بش جیسے ''ہمدرد انسانیت ''لیڈر کے ظہور کے لئے موزوں نہ تھی مگر قدرت کو ان کا ظہور منظور تھا جس سے سونے پر سہاگہ پھر گیا یا یوں کہہ لیجئے کہ جلتی پر تیلیوں نے تیل ڈال دیا ۔ سیانے لوگ کہتے ہیں کہ کسی بڑے انسان کی بڑائی کا پیمانہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کو کس حال میں پایا اور جب پھر گیا تو تو اسے کس حالت میں چھوڑا! اگر واقعی معیار وہی ہے تو جارج بش اور اس کے ہمنواوں کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ موصوف کا یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ انکل سام کے سیکولرازم اور جمہوریت کی لمبی ناک کے عین نیچے صہیونیوں نے فلسطین میں اور مکار ہندو بنئے نے کشمیر میں انسانوں سے الگ کرنے کے لئے دیواریں کھڑی کر کے جنوبی افریقہ کے نسل پرستوں کی یاد تازہ کر دی' کیا خوب قیامِ امن ہے؟

تاہم حیرانی کی بات نہیں ہے' افریقہ کے نسل پرستوں کو تو یورپ اور امریکا سمیت دنیا اچھوت گردانتی تھی اور سفارتی تعلقات سے گریزاں تھی کیونکہ جنوبی افریقہ میں اس نسل پرستی کی زد میں عیسائی تھے مگر فلسطین میں صہیونیوں کے شکار اور مقبوضہ کشمیر میں ہندووں کی چیرہ دستیوں کی زد میں مسلمان ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک مسلمان کی زندگی' عزت اور مال و متاع کی کیا قیمت ہے؟ ان پر دست درازی سے تو ''مہذب دنیا'' کو شرمندگی نہیں ہوتی لیکن کیا یہ دیوار امن کی ضمانت ہو گی؟ کیا ستم ظریفی ہے کہ لالہ لبھو رام واہگہ کی دیوار کو تو دیوار برلن کی طرح گرانے کا شوق رکھتا ہے مگر کشمیریوں کو کشمیریوں سے الگ کرنے کے لئے ''دیوارِ برہمن'' کھڑی کر رہا ہے۔ اس سے پہلے دسمبر ۱۹۷۱ء یہی ''دیوارِ برہمن'' پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان برہمن نے کھڑی کی تھی۔ یہ دیوار برہمن اور دیوارِ یہود دنیا میں امن تو قائم نہیں کر سکی بلکہ ان دیوروں کی اوٹ سے دنیا کے امن کو تباہ و برباد کرنے کی سازشیں مسلسل جاری ہیں، دنیا کو تو عدل و انصاف درکار ہے اور وہ مساوات کی طالب ہے جس سے عالمی امن کی ضمانت مل سکتی ہو!

رہے نام میرے رب کا جس کا پیغام ہی امن و سلامتی ہے!

بروز جمعرات ۱۸ صفر ۱۳۴۱ھ ۳ فروری ۲۰۱۰ء

حفظِ ماتقدم

رعونت، درندگی اور سفاکی، تہذیب کے ہر قرینے اور انسانیت کے ہر سلیقے سے عاری ہوتی ہے۔ وہ اپنی خوں آشامی کا جواز خود ہوتی ہے اور اپنی حیا باختگی کی دلیل خود تراشتی ہے۔ کسی کی برہمی، کسی کی تنقید اور کسی کی حرف گیری سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر ایسا ہونا ہوتا تو امریکا بہت پہلے سے اپنا چلن تبدیل کر چکا ہوتا اور اسے اندازہ ہو گیا ہوتا کہ اسلحے اور ٹیکنالوجی کے زور پر انسانوں کے پرخچے اڑانے اور بستیاں پیوند زمین کر دینے سے نہ کوئی قوم سربلند ہوتی اور نہ کوئی ریاست آبرو پاتی ہے۔ امریکی تاریخ حیا باختہ جنگوں، آزاد خود مختار ممالک کے امور میں ننگی مداخلت اور معصوم انسانوں کے قتل سے بھری پڑی ہے۔ اگر کسی کے پاس مستند اور مصدقہ اعداد و شمار جمع کرنے کا ہنر ہوتا تو پتہ چلتا کہ امن، انسانی حقوق، جمہوریت اور آزادی کا درس دینے والی سپر پاور کے دامن پر جھوٹ کے کتنے داغ اور مکاری کے کتنے چھینٹے ہیں۔

بھول جایئے کہ چھ اگست ۱۹۴۵ء کو ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم ''امن و آشتی'' کے اسی علمبردار نے گرایا تھا جس سے تین لاکھ سے زائد انسان ہلاک اور لاکھوں اپاہج ہو گئے۔ بھول جایئے کہ ۹/اگست ۱۹۴۵ء کو اسی مبلغِ انسانیت نے ناگاساکی پر دوسرا ایٹم بم گرایا تھا جس سے شہر کی ایک تہائی آبادی ہلاک ہو گئی تھی۔ اڑھائی سو سال پہلے ۱۷۶۳ء میں پہلے جراثیمی ہتھیار بھی امریکا میں، موجودہ امریکیوں کے آباواجداد نے استعمال کئے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران جنگی قیدیوں پر زہریلی گیس استعمال کرنے کا اعزا بھی امریکا کے پاس ہے۔ ۱۹۲۵ء میں جب جنیوا کنونشن کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کے استعمال پر پابندی لگا رہا تھا تو سب سے زیادہ مخالفت امریکا نے کی تھی اور اس پابندی کو قبول کرنے سے انکار بھی کر دیا تھا۔ یہ باتیں بھول جایئے کہ قصہ ماضی ہو چکی ہیں لیکن آج بھی امریکا این پی ٹی پر دستخطوں سے انکاری ہے۔ وہ روس سے کئے گئے اینٹی بلاسٹک میزائلوں کے معاہدے سے بھی یکطرفہ طور پر منحرف ہو چکا ہے۔ آج بھی اس کے ایٹمی گودام میں بارہ ہزار سے زائد ایٹم بم پڑے ہوئے ہیں۔ آج بھی اس کے پاس کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور آج بھی اس کی غارت گری اور انسانیت کشی جوں کی توں ہے بلکہ کئی گنا بڑھ چکی ہے۔

تقریباً آٹھ سال قبل جولائی ۲۰۰۲ء میں افغانستان کے ایک گاوں میں شادی کی ایک تقریب جاری تھی۔ بچیاں ڈھولک کی تھاپ پر گیت گا رہی تھیں، پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔ آسمانوں کی بلندیوں سے امریکی طیاروں نے دیکھا اور اسے طالبان کی جنگی تیاریوں کا کوئی کیمپ خیال کرتے ہوئے درجنوں بم گرا دیئے۔ عورتوں اور بچوں سمیت ۴۸ بے گناہ انسانوں کے پرخچے اڑا گئے۔ عالمِ اسلام نے جھرجھری تک نہ لی۔ مری مری، منمنی سرگوشیوں کے سوا احتجاج کی کوئی لے بلند نہ ہوئی۔ قبریں کھدیں اور جلنے سے بچ جانے والے اعضاء دفن کر دیئے گئے۔ امریکی سنٹرل کمانڈ نے سینہ تان کر کہا ''ہم اس حملے میں پوری طرح حق بجانب تھے، ہمارے جہازوں پر فائرنگ کی گئی تھی۔ اس سفاکی کے دو سال بعد ایسا ہی المیہ عراق کے ایک سرحدی گاوں میں بھی پیش آیا جہاں شادی کی ایک تقریب پر بم برسا کر ۵۵/افراد کو موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا۔ زمین پر رینگتے کیڑوں مکوڑوں کو دیکھ لینے والی ٹیکنالوجی کو شادی کی تقریب ''المہدی آرمی'' کی چھاونی نظر آئی۔ خبر رساں ایجنسی رائٹر نے ایک عینی شاہد کے حوالے سے بتایا کہ شہید ہونے والوں میں ۱۵/بچے اور ۵۲ خواتین بھی شامل تھیں۔ ایک اور عینی شاہد نے العربیہ ٹی وی چینل کو بتایا کہ امریکی طیاروں نے کم و بیش ایک سو بم گرائے۔ ٹی وی چینل نے یہ بھی

دکھایا کہ کس طرح لہو بہہ رہا ہے اور کس طرح ایک گرد سے اٹی ہوئی سڑک پر کٹی پھٹی لاشوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔

ابو غریب جیل اور بگرام ایئر بیس کی متعفن کہانیاں سامنے آنے کے بعد تحقیقات، گواہیاں، بیانات، کورٹ مارشلز اور بازپرس کا ڈرامہ بھی اس تہذیب یافتہ دنیا نے دیکھا لیکن اب تک کوئی نہیں جو اس کھلی بربریت پر امریکا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے۔ آج بھی جب وائٹ ہاوس، پینٹا گون یا سٹیٹ آفس کا کوئی کارندہ کسی مسلمان ملک کا رخ کرتا ہے تو حکمرانوں پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے سرخ قالین بچھتے، خیر مقدمی بینر لگتے اور پر تکلف ضیافتوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس کے خون آلود ہاتھوں کو تھامنا، مصافحہ کرنا اور چومنا اعزاز و افتخار خیال کیا جاتا ہے۔ اس کی تشریف آوری کو اپنی عزت افزائی سمجھا جاتا ہے۔

بیسویں صدی میں اٹھارہ کروڑ کے لگ بھگ انسان جنگوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اقوام متحدہ وجود میں آئی بھی تو خونریزی نہ روک سکی۔ اب تو امریکا نے کسی آزاد ملک پر حملہ آور ہونے کے لئے جھوٹے سچے پرمٹ کی روایت بھی ختم کر دی ہے اور ''حفظِ ماتقدم'' کا نیا فلسفہ تخلیق کیا ہے ، گزشتہ صدی کے اختتام پر جولائی ۱۹۹۸ء میں اقوام متحدہ کے ۱۲۰/رکن ممالک ہیگ میں جمع ہوئے۔ انہوں نے جینوا کنونشن کے ضابطوں کو زیادہ موثر بنانے اور جنگی جرائم کے مرتکب فوجیوں کو سزا دینے کے لئے انٹرنیشنل کریمنل کورٹ کے چارٹر کی منظوری دی۔ اس عدالت کو عملاً وجود میں آئے ہوئے بارہ سال ہونے کو ہیں لیکن امریکا کی بدمستیاں جاری ہیں۔ اس نے اس عدالت کے خلاف سب سے زیادہ واویلا کیا اور کہا ''ہماری فوج تو دنیا کے ایک سو ممالک میں موجود ہے، ہمیں سیاسی وجوہ کی بناء پر اس عدالت میں گھسیٹا جاتا رہے گا۔"

عالمی رائے عامہ کو مطمئن کرنے کے لئے صدر کلنٹن نے جاتے جاتے اس چارٹر پر دستخط تو کر دیئے لیکن قصر سفید میں قدم رکھتے ہی بش نے اپنے فرعونی اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس کی توثیق سے انکار کر دیا اور اوبامہ بھی انہی کی پالیسی پر کاربند ہیں۔ اس عدالت کو غیر موثر بنانے کے لئے امریکا نے دنیا کے ۸۹ ممالک سے معاہدہ کر لیا ہے کہ اگر کوئی امریکی فوجی یا سویلین انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور جنگی جرائم میں ملوث پایا گیا تو اسے امریکا کے حوالے کر دیا جائے گا۔ امریکا نے قانون بنا رکھا ہے کہ جو ملک اس نوع کا معاہدہ کرنے سے انکاری ہو، اس کی امداد روکی جا سکتی ہے۔ احتیاط مزید کے طور پر امریکا نے ۲۰۰۲ء میں سلامتی کونسل کی ایک قرارداد کے ذریعے اپنے آپ کو ایک سال کے لئے اس عدالت سے مستثنیٰ قرار دلوایا، جولائی ۲۰۰۳ء میں اس میں مزید ایک سال کی توسیع کر دی گئی اور اس کے بعد اب تک ہر سال امریکا استثنیٰ کا حق دار ٹھہرتا ہے۔

ادھر امریکا کے لے پالک اسرائیل نے غزہ کی پٹی میں ایک دفعہ پھر بیگناہ فلسطینیوں کا خون بہانا شروع کر دیا ہے اور اس کے ایک اور ہم آغوش نشیں بھارت نے ایک دفعہ پھر کشمیریوں کو کچلنے کا پروگرام شروع کر دیا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں پچھلے سال کئی ہزار گمشدہ افراد کی اجتماعی قبروں کا انکشاف ہوا جس

کی بازگشت اب عالمی پریس میں بھی اٹھائی جارہی ہے۔ پچھلے ایک ہفتے سے زائد سرینگر میں ظلم وستم کا بازار گرم ہے، کرفیو لگا کر کشمیریوں کو گھروں میں قید کر دیا گیا ہے۔ کشمیری پہلے ہی برسوں کی خانہ جنگی کی وجہ سے بھوک و مفلسی کا شکار ہیں اور بھارتی بنیاء یہ سمجھتا ہے کہ معاشی طور پر کشمیریوں کو تباہ کر کے ان کو حقِ خود ارادیت کے نعرے سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دے گا، ان کے بعض لیڈروں کو خرید کر ان کشمیریوں کو بھارت کے ساتھ مکمل الحاق پر مجبور کر دیں گے لیکن بھارتی بنئے کی تمام مکاریاں اور چالبازیاں اب تک ناکام ہو گئیں ہیں۔

نئی امریکی حکومت نے بھی اسرائیلی کاروائیوں کو مبنی بر حق قرار دے دیا ہے اور بھارت کو عظیم جمہوریت کا تازہ خراج پیش کیا ہے لیکن کسی سے کیا گلہ، مراکش سے انڈونیشیا تک ایک سناٹے کا راج ہے۔ بڑے بڑے بادشاہ، صف شکن سورما اور عالی قدر رہنما خاموش ہیں۔ حرفِ مذمت تو دور کی بات ہے، خونِ مسلم کی ارزانی پر دو آنسو بہانے والا کوئی نہیں، آخر کون آنسو بہائے؟ سب کی آنکھیں تو وائٹ ہاوس (قصر سفید) کی بارگاہِ ناز پر لگی ہوئی ہیں اور جب کوئی سواری وہاں سے ادھر کا رخ کرتی ہے تو قالینوں کا کاروبار چمک اٹھتا ہے اور پھولوں کی دوکانیں خالی ہو جاتی ہیں۔

ان حالات میں عافیہ کے ساتھ بے انصافی کی دہائی دینا تو بے سود ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس تمام واقعے کا مرکزی مجرم جس نے قوم کی بیٹی ڈاکٹر عافیہ کو ان حیوانوں کے سپرد کیا تھا، اس کا نام بالکل نہیں لیا جارہا۔ شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ عافیہ کا تعلق کسی بھی صاحبانِ اقتدار سے نہیں۔ آمنہ مسعود جنجوعہ بھی پچھلے کئی سالوں سے سینکڑوں گمشدہ افراد کے ساتھ اپنے شوہر کے لئے دن رات تڑپ رہی ہے۔ صاحبانِ اقتدار اب ان کو جھوٹی تسلیوں پر ٹرخا رہے ہیں۔

عافیہ! تم ایک دفعہ پھر حسین حقانی کی جھوٹی تسلیوں سے دھوکہ کھا گئی ہو اور پوری قوم کو بھی موجودہ حکومت نے اندھیرے میں رکھا ہوا ہے۔ بھلا یہ اپنے آقاوں کی اس سے بہتر اور کیا خدمت بجالاتے کہ پنے اقتدار کو بچانے کے لئے ایک کمزور و ناتواں لڑکی کی ''بلی'' چڑھا دیں! امریکی جیوری نے انصاف کی کس طرح دھجیاں اڑائی ہیں، یہ ایک غور طلب معاملہ ہے مگر اس فیصلے کے ذریعے قدرت نے پوری دنیا کے سامنے امریکی عدالتی نظام کے دوغلے پن کو بے نقاب کر دیا ہے اور یہ دکھا دیا کہ خود کو مہذب کہنے والوں کے ہاں کتوں کو تو فیملی ممبر کا درجہ حاصل ہے مگر کسی جیتی جاگتی انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں!

آج تمہاری خونخواری پر حیرت ہے حیوانوں کو — تم تو کل تہذیب سکھانے نکلے تھے انسانوں کو
کیسا شوق چرایا تم کو شہروں کی بربادی کا — جگہ جگہ آباد کیا ہے تم نے قبرستانوں کو
اتنے بھی سفاک منافق دنیا نے کب دیکھے تھے — کتوں کا منہ چومنے والے قتل کریں انسانوں کو
رہے نام میرے رب کا جو اپنے بندوں کا بہترین مددگار ہے!

بروز ہفتہ ۲۰ صفر ۱۴۳۱ھ ۵ فروری ۲۰۱۰ء

جبّار بھی قہّار بھی

ہم سب کو اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہونا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس اضافے کے لئے ہمیں کچھ کرتے بھی رہنا چاہئے۔ اگر ایک شخص جس کے ہاتھ پیر سلامت ہوں، وہ جوان ہو اور اس کی ہڈیاں مضبوط ہوں، اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا تو واجب ہے لیکن اگر کوئی اجنبی بندوق کی نوک پر اس کے سارے خاندان سے ناک کی لکیریں نکلوا رہا ہو اور وہ شخص کہے کہ اللہ کا شکر ہے، عزت کی زندگی بسر ہو رہی ہے تو اس کی صحت، اس کی جوانی، اس کی عزت کی زندگی کے آگے بہت بڑا سوالیہ نشان نظر آنے لگتا ہے۔ ہم پاکستانی گزشتہ برسہا برس سے کچھ اسی قسم کی عزت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہماری دونوں آنکھیں سلامت ہیں مگر ہر بار کوئی کاندھا ہمارا آگے کرتا ہے اور حکم ملتا ہے کہ اس پر ہاتھ رکھ کر سڑک پار کرو، ہماری دونوں ٹانگوں میں دم ہے لیکن ہمارے ہاتھ میں بیساکھی پکڑا دی جاتی ہے، ہم عاقل و بالغ ہیں لیکن ہمارا حقِ رائے دہی کوئی اور استعمال کر جاتا ہے۔

ہم خود کو انسان کہلاتے ہیں لیکن ہمارے ساتھ ڈھور ڈنگروں والا سلوک ہوتا ہے۔ پاکستان کے کئی شہروں میں یہ منظر آپ نے دیکھا ہو گا کہ اکثر چالیس پچاس بھینسیں، جن کا جثہ اور سینگ دیکھ کر ڈر لگتا ہے، خراماں خراماں چلی جا رہی ہوتی ہیں۔ انہیں ایک بڑی بڑی مونچھوں والا گجّر صرف درخت کی ایک شاخ سے جدھر چاہتا ہے، ادھر ہانک کر لیجاتا ہے۔ یہی حال ہمارا بھی ہے۔ ہمیں اپنے جثوں اور سینگوں کے نوکدار ہونے کا ادراک ہی نہیں ہے چنانچہ جو گجر ہم سے جیسا سلوک کرنا چاہتا ہے، ویسا کرتا ہے۔ وہ ہمیں جن راستوں پر چلنے کے لئے کہتا ہے ہم گروہ در گروہ ان راستوں پر چلنا شروع کر دیتے ہیں ، بھینس کے تھنوں کے پاس کٹا چھوڑا جاتا ہے اور جب وہ اپنے بچے کے لئے دودھ اتارتی ہے تو گجر اس کٹے کو پرے کر کے اپنا برتن دودھ سے بھر لیتا ہے اور بازار میں بیچ دیتا ہے۔

ہمارے بچوں کے حصے کا دودھ بھی ہمارے بچوں تک نہیں پہنچتا۔ بھینس تو پھر بھی کبھی کبھار کسی کو سینگ مار لیتی ہے، ہم اشرف المخلوقات ہیں، ہم ایسا نہیں کرتے۔ ہمیں تو سیدھا راستہ دکھانے کے لئے درخت کی ایک شاخ ہی کافی ہے۔ جانوروں کے ریوڑ میں جب کسی جانور کا سودہ ہو جاتا ہے تو اسے ریوڑ سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے درمیان بھی کچھ جانور ایسے ہیں جن کا سودہ ہو چکا ہے۔ ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہیں اور ان کے جسموں پر قیمتی پوشاکیں ہیں کہ اب یہ آوارہ نہیں، ان کی حیثیت بڑے بڑے ایوانوں میں پالتو کی ہے۔ یہ کان پر قلم دھرے گلی گلی آواز لگاتے ہیں، قصیدہ لکھوالو، ہجو لکھوالو۔ ان انسان نما جانوروں کے غول کے غول اپنے جسموں پر اپنی قیمتوں کے ٹیگ لگائے نیلام گھر کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان سے پارٹی بنوالو، پارٹی بدلوالو، بندے چکوالو، بندے مروالو، ہر کام کی قیمت مقرر ہے۔

ان میں سے کچھ نے مونچھیں رکھی ہوئی ہیں، کاندھے پر ''پرنا'' ڈال رکھا ہے۔ یہ مٹھی میں سگریٹ دبائے دفتروں، تھانوں، عدالتوں، اخباروں، اسمبلیوں اور بڑے بڑے ایوان میں نظر آتے ہیں، قوم کی موت ان کی حیات ہے۔ انہیں یہ بھی احساس نہیں کہ اگر ان کی آئندہ نسل میں خدانخواستہ کوئی بے غیرت پیدا نہ ہوا تو وہ بیچارہ بھوکوں مر جائے گا۔ بے غیرتی کا رزق نہ ملنے کی وجہ سے اس کی جو حالت ہو گی انہیں اس کی بھی فکر نہیں۔ انہیں صرف آج

کی فکر ہے اور صرف اپنی فکر ہے۔

ایک طبقہ ہم ''انسانوں'' کے درمیان اور بھی ہے اس نے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے' اس کے افراد صرف اپنی پیدائش کے وقت رو کر احتجاج کرتے ہیں۔ یہ ان کی ''سحری'' ہے ''افطاری'' کی نوبت ان کے آخری سانس تک نہیں آتی۔ یہ نہ کسی سے اختلاف کرتے ہیں نہ اتفاق کرتے ہیں' ان کے سامنے ملک و قوم پر آسمان ٹوٹ پڑے' لوگوں کی دلدوز چیخوں سے کلیجے شق ہو جائیں' ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ان کا ایک مخصوص جملہ ہے ''بس جی دعا کریں جو ہو رہا ہے ملک و قوم کے حق میں بہتر ہو''۔ ان بے حس چہروں پر غیر جانبداری کا ایک ملکوتی سا اطمینان ہمہ وقت طاری رہتا ہے۔ یہ کچھ بھی دیکھیں' کچھ بھی سنیں' ان کے ذہنوں میں کوئی سوال نہیں اٹھتا' خصوصاً شعر و ادب سے وابستہ کچھ لوگوں میں تو جانبداری گناہِ کبیرہ میں شمار ہوتی ہے۔ حبیب جالب کو شاعر اس لئے نہیں مانا گیا کہ وہ اس گناہِ کبیرہ کا بار بار مرتکب ہوتا تھا' چنانچہ خود ادیب اسے سنگسار کرتے رہے۔ ادیب کا کام صرف داخلی گتھیاں سلجھانا ہے' خارج سے اسے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ سودا کے بالیں پہ شور قیامت ہوا تو خدام ادب بولے ''یہ شور روکو' صاحب کی ابھی آنکھ لگی ہے۔ ہمارا منشور،

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

والے شعر میں پوری طرح آگیا ہے چاہے ''مراقبے'' کی اس کیفیت میں ''جاناں'' اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو جائے یا کوئی غنڈہ اسے ٹیکسی میں ڈال کر لے جائے۔ کچھ ایسا ہی حال مجھے اپنے موجودہ حکمرانوں کے مزاج میں بھی نظر آرہا ہے۔ کچھ خفیہ ہاتھوں نے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی داستان کو بھی بڑے بہیمانہ طریقے سے پاکستانی قوم کے ذہنوں سے محو کرنے کی کوشش میں اگلے ہی دن کراچی میں ریموٹ کنٹرول بم دھماکے کروادئے تاکہ پاکستانی قوم امریکا کے اس ظالمانہ قدم پر اپنا کوئی ایسا احتجاج نہ ریکارڈ کرواسکے جو بعد میں اس قدر شدت اختیار کر جائے کہ امریکا یا اسکی حمائت یافتہ حکومت کو رخصت ہونا پڑ جائے لیکن اب تو نوشتہ دیوار سامنے دیوار پر لکھا ہے کہ اس ظلم کے بعد اب اس خطے سے امریکا اور اس کے تمام اتحادیوں کو عزت سے واپسی کا راستہ نہیں مل سکے گا۔

اس بات کو بھی ذہن میں رکھیں کہ یہ تشدد اور بربریت ہی ان سب کے زوال کا سبب بنے گا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ایسے مظلوموں کا تعلق ان ممالک سے ہوتا ہے جہاں کے حکمران اپنے اقتدار کی خاطر اپنی غیرت' حمیت' عزت اور وقار بیرونی آقاوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں اور ایسا ہی غیرت فروش ڈکٹیٹر تھا جس نے عافیہ کو امریکا کے حوالے کیا' اس ملک کے بیٹوں اور بیٹیوں کو امریکا کے حوالے کرنے اور اس کے عوض ڈالروں کی آگ اپنے پیٹ میں بھرنے کا اعتراف بڑے فخر سے اپنی کتاب میں کر چکا ہے۔ اس فاسق جرنیل نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے اپنے ہم وطنوں پر ظلم و تشدد کرنے کے لئے امریکیوں کو پاکستان میں ہی عقوبت خانے کھولنے کی اجازت دے رکھی تھی اور اس کی بے شرمی اور بے غیرتی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے ہی ملک کی خواتین کو اذیت ناک مرحلوں میں مبتلا کرنے کے لئے بغیر کسی تحقیق کے امریکی سی آئی اے کے حوالے کر دیا۔ اذیت کے اس گھنے جنگل میں سفر کرنے والی خواتین کی ایک طویل فہرست ہے جس میں عافیہ صدیقی ایک ایسا روشن نام ہے جس کی بناء پر اس فاسق ڈکٹیٹر پر تاریخ ہمیشہ لعنت اور ذلت کے تبرے بھیجتی رہے گی!

عافیہ کا قصور یہ ہے کہ اس کا رشتہ محمد عربی ﷺ کے ساتھ ہے اور اس نے اپنے نبی پر نازل ہونے والی کتاب کو از بر اپنے دل میں اتار رکھا ہے۔ س کا دوسرا قصور یہ ہے کہ اس کا تعلق مسلمانوں کی پہلی جوہری طاقت کے حامل ملک پاکستان سے ہے جس کا کمانڈو بزدل سربراہ ایک ٹیلیفون کال پر ڈھیر ہو گیا تھا جبکہ دوسری طرف امریکا کی جمہوریت' قانون پسندی' بنیادی حقوق کا احترام' عدل وانصاف اور انسان دوستی صرف اپنے ملک کے شہریوں کے لئے وقف ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس کے پیمانے مختلف ہیں اور محمد عربی ﷺ کا کلمہ پڑھنے والوں کے لئے اس کا قانون بالکل جدا ہے اور پاکستانیوں کے لئے تو اس کے ضابطہ ہائے انصاف تو بالکل مختلف ہیں۔ امریکیوں کے پالتو کتوں اور بلیوں کو کانٹا بھی چبھ جائے تو امریکیوں کی انصاف کی دیوی کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے اور وہ کوبرا سانپ کی طرح پھن پھیلائے ڈنک مارے سے گریز نہیں کرتے۔

عراق میں پندرہ لاکھ مسلمانوں کا خون پی گئے' افغانستان میں تو کوئی گنتی ہے نہ شمار' کیا آج تک کسی امریکی عدالت نے ان بھیانک جرائم کی طرف توجہ دی؟ کیا امریکا کے ہاتھوں مارے جانے والے مشرق کے افتادگان خاک کو وہ حشرات الارض سے بھی حقیر جانتے ہیں؟ کیا امریکا کی انصاف کی منڈی میں ان کی بھی کوئی قیمت یا بولی لگائی گئی ہے؟ شائد ڈیڑھ ارب ڈالر سالانہ اسی مد میں ادا کئے جاتے ہیں کہ حکمران اپنی قومی غیرت اور حمیت کو گہری نیند سلا دیں۔

میں تصور میں جب بھی عافیہ کو دیکھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شائد ہم سب سے روٹھ چکی ہے اسی لئے اس نے تصویر میں بھی اپنی آنکھیں موندر کھی ہیں۔ ۲۰۰۳ء کو اچانک تین معصوم بچوں کے ساتھ اغوا کی جانے والی کمزور خاتون کا بگرام افغانستان کے عقوبت خانوں سے امریکا تک کا سفر اس بات کا گواہ ہے کہ عافیہ اب ہماری شکل دیکھنے کی روادار نہیں۔ شائد ہم اسی لائق ہیں۔ عافیہ! ہم تم سے شرمندہ ہیں!
رہے نام میرے رب کا جو جبار بھی ہے اور قہار بھی!

حیرت نہ کر بدن کو مرے چور دیکھ کر
ان رفعتوں کو دیکھ جہاں سے گرا تھا میں

بروز اتوار ۲۱ صفر ۱۳۴۱ھ ۶ فروری ۲۰۱۰ء

گناہِ کبیرہ

یخ بستہ ہوا ہو یا آگ برساتی لو، سورج سوا نیزے پر کھڑا ہو یا چھاجو مینہ برس رہا ہو۔ تعابن نامی بڑھیا کئی میل کا کٹھن سفر طے کر کے گرتی پڑتی ابو غریب جیل کے پھاٹک پر پہنچتی ہے تو امریکی گارڈ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ وہ اپنے بھاری بھرکم، بوسیدہ اور میلے کچیلے کپڑوں کو سنبھالتے ہوئے گٹھڑی سی بن کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو ٹپکتے ہیں اور وہ امریکیوں سے التجا کرتی ہے ''خدارا مجھے میرے بیٹے کے متعلق کچھ تو بتاؤ کہ وہ کہاں ہے؟'' امریکی گارڈز کندھے اچکا کر ہنستے اور اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ بڑھیا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے آنسو جھڑی میں بدل جاتے ہیں۔ ''تم لوگ تو کوئی جواب ہی نہیں دیتے، اتنا تو بتا دو کہ وہ کہاں ہے، زندہ بھی ہے یا نہیں؟''

صابرہ کے جواں سال بیٹے کو فوجی بغیر کچھ بتائے اٹھا کر لے گئے تھے جس کی آج تک کوئی خبر نہیں۔ وہ صدر دروازے پر کھڑی دہائی دیتی ہے ''میرا بیٹا مجھے ملوا دو، مجھے تو یوں لگتا ہے کہ تم نے اسے مار دیا ہے'' اور پھر وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر دلدوز چیخوں سے بین کرنے لگتی ہے۔

برسوں سے ادھیڑ عمر لاراء وعدہ کو اپنے شوہر کی تلاش ہے ''میرا تو اللہ اور اس کے سوا دنیا میں کوئی نہ تھا، میں اب کہاں جاؤں؟'' امریکی سگریٹ کا کش لیتے ہوئے لارا کو دھکا دیکر دوسری طرف گرا دیتا ہے اور دوسرے امریکی اس کی فریاد کو قہقہوں میں اڑا دیتے ہیں۔

ابراہیم حمید صحافیوں کو بتاتا ہے ''کئی ماہ پہلے ہم سب کھانا کھا رہے تھے کہ امریکی فوجی دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے اور اس کے بھائی کو مارتے ہوئے اٹھا کر لے گئے، آج تک اس کا کوئی پتہ نہیں کہ وہ زندہ بھی ہے یا کہ نہیں۔''

بغداد کے شمال میں واقع ابو صفا نامی چھوٹا سا گاؤں امریکیوں کی آمد کے بعد اب تک مردوں سے خالی ہو گیا ہے۔ نوعمر لڑکوں سے لیکر بوڑھوں تک سب کو نجانے کون ہانک کر لے گیا اور کہاں ڈال دیا۔ باپ بیٹے، شوہر سب چلے گئے، اب صرف عورتیں رہ گئیں ہیں یا بچے، عورتیں ہی کھیتوں میں ہل چلاتی، وہی لکڑیاں کاٹ کر لاتی اور وہی رات کو پہرہ دیتی ہیں۔ ایک مغربی صحافی گاؤں کے ایک ویران گھر پہنچا، ملائکہ حسن نامی خاتون نے اسے کرسی پیش کی اور اپنے دس سالہ بچے حسام کو آواز دی ''بیٹا دیکھو تو مہمان آئے ہیں'' ملائکہ نے مہمان کو بتایا ''سنا کرتے تھے کہ صدام کی فوج لوگوں کو مار دیتی تھی، ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا، لاشیں دریائے فرات میں بہا دی جاتی تھیں یا انہیں اجتماعی قبروں میں پھینک دیا جاتا تھا لیکن اب بھی یہی حال ہے، ہمیں اپنے پیاروں کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہیں اور ان پر کیا گزر رہی ہے، وہ انتظار کرتے گھروں کو لوٹ کر آئیں گے بھی یا نہیں؟''

بغداد سے کوئی بیس میل دور ابو غریب جیل ہمیشہ خوف و دہشت کی علامت رہی۔ ۲۸۰/ایکڑ پر پھیلی جیل کے پانچ کمپاونڈ اپنے بطن میں کئی اندوہناک کہانیاں لئے بیٹھے ہیں۔ اونچی دیواروں، خاردار تاروں اور چوبیس نگہبان ٹاورز میں گھری وسیع و عریض جیل ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ایک برطانوی فرم نے تعمیر

کی۔تب برطانیہ کو معلوم نہیں تھا کہ ایک دن وہ امریکا کا دست و بازو بن کر یہاں آئے گا اور یہ زندان خانہ صدام کی بجائے ''اتحادی فاتحین'' کے تصرف میں ہو گا۔صدام کے مظالم کے بارے میں مغربی میڈیا کی کم و بیش ساری کہانیاں ابو غریب جیل سے ہو کر گزرتی ہیں۔۲۰۰۲ء میں صدام نے اپنی صدارت کی توثیق کے لئے تازہ ریفرنڈم کروایا تو جانے اس کی جی میں کیا آئی کہ اس نے زندانوں کے منہ کھول دیئے اور سارے قیدی رہا کر دیئے۔یہ پہلا موقع تھا کہ ابو غریب کی جیل بھی مکمل طور پر خالی ہو گئی اور ویرانیاں نئی وحشتوں کی شکل میں کال کوٹھڑیوں میں آ بیٹھیں۔امریکی سپاہ نے ''عراق'' فتح کیا تو ابو غریب جیل کا کوئی نگہبان نہ تھا۔لوگ اس کے دروازوں اور کھڑکیوں سمیت سارا ساز و سامان اٹھا لے گئے تھے۔

"فتح عراق" اور صدام کا تختہ الٹنے کے بعد امریکا نے اعلان کیا "آج ہم نے عراقی عوام کو آزادی دلا دی ہے" صدام کی آمریت کا بت توڑنے والے نجات دہندوں کو سب سے پہلے ابو غریب جیل کا خیال آیا۔ہنگامی طور پر اس کی مرمت اور ''تزئین و آرائش'' کی گئی' صدر دروازے کے اندر لگا صدام حسین کا بہت بڑا پورٹریٹ اتار پھینکا گیا' اس کی جگہ جلی حروف میں لکھ دیا گیا امریکا سارے عراقی عوام کا دوست ہے''۔''ابو غریب جیل'' کا بورڈ اتار کر وہاں ایک نیا بورڈ لگا دیا گیا تھا جس پر لکھا تھا یعنی ''بغداد کا مرکز اصلاح''۔دیکھتے ہی دیکھتے وسیع و عریض جیل' جسے شہر کے اندر ایک شہر کہا جاتا تھا' آباد ہونے لگی۔ آزادی پانے والے ''ناشکرے لوگ'' جنہیں اپنی سرزمین پر امریکیوں کی موجودگی گوارہ نہ تھی' ابو غریب جیل کی کال کوٹھڑیوں کا رزق ہونے لگے۔

مزاحمت بڑھی تو بوکھلائی ہوئی ہراساں امریکی سپاہ نے بستیوں اور گھروں پر یلغار کر دی' جو ہاتھ لگا اسے اٹھا کر ابو غریب جیل میں ڈال دیا۔اب تک قید و بند کی سختیاں جھیلنے والے عراقیوں کی صحیح تعداد کا علم نہیں ہو سکا۔کچھ کے خیال میں ساڑھے چار ہزار اور کچھ دس ہزار سے بھی زائد بتاتے ہیں۔ان میں سب سے معمر قیدی کی عمر ۷۵ سال تھی اور سب سے کم عمر زندانی دس سالہ بچہ تھا' مارچ ۲۰۰۴ء میں ایک فوجی جج نے ۱۱۶۶ قیدیوں کے معاملات کا جائزہ لیا اور ان میں سے ۹۶۳ کو کلی طور پر بے گناہ پایا۔گناہ گار پائے جانے والوں کا گناہِ کبیرہ بھی یہ تھا کہ وہ امریکی جارحیت کو پسند نہیں کرتے تھے۔

ایسا ہی معاملہ افغانستان میں بھی جاری ہے۔افغانستان کوئی شہر کوئی گاوں یا کوئی قریہ ایسا نہیں جہاں ایسی وحشیانہ داستانیں آپ کو سننے کو نہ ملیں۔اس پر مستزاد رہی سہی کسر وہاں کے وار لارڈز نے پوری کر دی۔امریکی سپاہ کی نگرانی میں وہاں کے وار لارڈز کسی بھی فرد پر طالبان کا الزام لگا کر اس کی بقیہ زندگی جہنم بنا دیتے ہیں۔ان وار لارڈز کے لئے امریکیوں سے ڈالرز کمانے کا بے حد آسان طریقہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک امریکی صحافی نے ایک تحقیق کے بعد دنیا کو بتایا کہ گوانتانوبے میں ساٹھ فیصد سے زائد وہ بے گناہ افراد ہیں جنہیں کسی دشمنی یا امریکیوں سے رقم بٹورنے کے چکر میں طالبان یا القاعدہ کا رکن قرار دیکر امریکیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ایسا ہی مکروہ کاروبار پرویز مشرف نے بھی کیا۔کئی بے گناہوں کو امریکا کے حوالے کر کے لاکھوں ڈالر وصول کئے۔ سوال یہ ہے کہ کل کلاں اگر یہ قیدی جیل سے رہا ہو کر واپس آتے ہیں تو ان پر ہونے والے مظالم اور اس کے لواحقین پر گزرنے والی قیامت کا مداوا کون کرے گا؟

مظلوم ڈاکٹر عافیہ کو آخر کس جرم میں امریکا کے حوالے کیا گیا؟ایک کمزور لڑکی نے ساڑھے چھ فٹ کے فوجی سے بندوق کیسی چھین لی اور اس پر جو فائر کیا گیا اس کا کوئی ثبوت بھی نہیں ملا۔اس گولی کا کوئی خول' اس کمرے میں گولی کا کوئی نشان نہیں ملا' اس ایم فور بندوق پر عافیہ کے کوئی فنگر پرنٹ نہ مل سکے'

گن پاوڈر کے نشانات بھی نہ مل سکے اگرچہ عدالت کے پاس عافیہ کو مجرم ٹھہرانے کے لئے نہ کوئی ٹھوس ثبوت تھا نہ کوئی اخلاقی جواز مگر ہٹ دھرمی اور تعصب کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جانبداری کا اس سے بڑا ثبوت بھلا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ججوں میں وہ لوگ بھی تھے جو نائن الیون میں مرنے والوں کے لواحقین میں سے ہیں اور جیوری کے سامنے جو لوگ گواہی کے لئے پیش ہوئے' ان میں امریکی فوجی' ایف بی آئی کے اہلکار اور افغان فوج کے وہ اہلکار شامل تھے جن کے پاس امریکی گرین کارڈز تھے۔ جب منصف ہی فریق ہوں اور گواہ بھی ان کے ہمنوا تو ایسے میں انصاف کی توقع رکھنا بھی فضول تھا ۔ نتیجہ یہ کہ سات سال سے خوفناک اذیتوں اور ناانصافیوں کی بھٹی میں سلگنے والی ایک بے گناہ ماں اور ایک مظلوم بیٹی کو تعصب اور انا کی بھینٹ چڑھا دیا گیا

اب یہ مقدمے کے جج رچرڈ برمن پر منحصر ہے کہ وہ اس مظلوم اور بے گناہ مسلمان بچی کیلئے کیا سزا تجویز کرتا ہے۔ ڈاکٹر عافیہ کو سات سال سے لیکر سو سال تک کی سزا سنائی جا سکتی ہے۔ امریکی جیوری کا فیصلہ آنے کے بعد ڈاکٹر عافیہ کی والدہ ڈاکٹر عصمت صدیقی اور ان کی جری بہن ڈاکٹر فوزیہ صدیقی نے جس صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا' اس جذبے پر پوری قوم کا سر عقیدت کے ساتھ ان کے سامنے جھک گیا ہے۔ اس خبر سے ان پر صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا مگر انہوں نے اپنی ہمت اور حوصلے کو ٹوٹنے نہیں دیا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۔اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطرہ' فاقہ کشی' جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔

رہے نام میرے رب کا جو اپنے صابرین بندوں سے بہت محبت فرماتا ہے!

سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے
سنا ہے شیر کا جب پیٹ بھر جائے
تو وہ حملہ نہیں کرتا
سنا ہے جب کسی ندّی کے پانی میں
بئے کے گھونسلے کا گندمی سایہ لرزتا ہے
تو ندی کی روپہلی مچھلیاں
پڑوسی مان لیتی ہیں
ہوا کے تیز جھونکے جب درختوں کو ہلاتے ہیں
تو مینا اپنے گھر کو بھول کر
کوے کے انڈوں کو پروں میں تھام لیتی ہے
سنا ہے گھونسلے سے جب کوئی بچہ گرے تو

سارا جنگل جاگ جاتا ہے
ندی میں باڑ آجائے
کوئی پل ٹوٹ جائے
تو کسی لکڑی کے تختے پر
گلہری، سانپ، چیتا اور بکری
ساتھ ہوتے ہیں
سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہے
خداوندا، جلیل و معتبر، دانا و بینا، منصف و اکبر
ہمارے شہر میں اب
جنگلوں کا ہی کوئی دستور نافذ کر

بروز سوموار ۲۲ صفر ۱۴۳۱ھ ۷ فروری ۲۰۱۰ء

مشکوک کیمونٹی

معمول یہ ہے کہ جونہی نماز جمعہ سے نمازی فارغ ہوتے ہیں تو مسجد کے باہر اور دالان میں نمازی ایک دوسرے کے ساتھ محبت کے اظہار میں گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ اخوت کا یہ خوبصورت منظر آنکھوں کو بہت بھلا اور دل کی طمانیت کے لئے بڑا فرحت بخش ہوتا ہے اس لئے نماز کے بعد کئی دوست آئندہ کے پروگرام بھی یہاں طے کر لیتے ہیں۔ میں ابھی مسجد سے باہر نکلنے والا تھا کہ ایک دوست نے کان میں سرگوشی کی ''کچھ دیر کے لئے رک جائیں' آپ کی ملاقات کچھ ایسے دوستوں سے کرواتے ہیں کہ ان سے مل کر آپ کسی اور دنیا میں پہنچ جائیں گے۔ بڑی حیرت ہوئی اور قدم وہیں جم گئے۔

تھوڑی دیر بعد میرے دوست کے ساتھ تین افراد تشریف لائے' ان افراد کے چہرے کسی خاص یقین کے ساتھ چمک رہے تھے اور نجانے کیوں دل ان کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ سب ہی گلے ملے اور پہلا تعارفی کلمہ یہ سننے کو ملا کہ یہ تمام مجاہد گوانتاناموکے ایکسرے کیمپ میں اپنی زندگی کے کئی سال گزار کر آئے ہیں۔ ہم سب مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ گئے اور مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے کروں۔ جب یہ برطانوی مسلمانوں کا پہلا گروپ رہا ہو کر آیا تھا تو مشہور اخبار گارڈین نے ان افراد کے تاثرات پر مبنی تفصیلات شائع کی تھیں۔ مہذب دنیا کے سب سے بڑے ملک کی انسانی حقوق کو پامال کرنے کی داستان جس نے بھی پڑھی' حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

خوبصورت تیکھے نقوش والا جمال الحارث' جس کا چہرہ خوبصورت داڑھی کے ساتھ کچھ زیادہ ہی حسین لگ رہا تھا' میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ اسے کیمپ میں روزانہ پندرہ گھنٹے اس طرح بیڑیاں لگا کر پنجرے میں بند رکھا جاتا تھا کہ اس کے اعضا حرکت تک نہ کر سکتے تھے۔ گارڈز اور سٹاف کا قیدیوں کو جسمانی ایذا پہنچانا روز کا معمول تھا، ذرا غور کیجئے کہ ان قیدیوں کو نفسیاتی طور پر ریزہ ریزہ کرنے کے لئے کن کن حربوں کا استعمال عمل میں لایا جاتا تھا' کس طریقے سے ان کے انسانی حقوق پامال کئے جاتے رہے۔ کتنے کرب میں ہونگے اس کیمپ کے رہائشی کہ جن کو جنیوا کنونشن اور دیگر بین الاقوامی قوانین کے تحت بھی جو حقوق حاصل تھے' ان سے بھی انہیں محروم رکھا گیا۔

اس کے ساتھی جمال الدین جس کا تعلق مانچسٹر سے ہے' اس نے مجھے بتایا کہ میں نے ایک دن انسانی حقوق کی اس قدر پامالی دیکھنے کے بعد کیمپ کی انتظامیہ سے مطالبہ کیا کہ ہم قیدیوں کو کم از کم وہ حقوق ہی دے دیں جو امریکا میں جانوروں کو حاصل ہیں۔ اس نے مجھے مزید یہ بھی بتایا کہ اسے چالیس دفعہ بارہ بارہ گھنٹے کی تفتیش کا سامنا کرنا پڑا جس کے دوران ہر طرح سے اسے زیر کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ان کے تیسرے دوست حماد نے ظلم و ستم کی وہ داستانیں سنائیں کہ مجھے اپنا سارا وجود گھومتا ہوا نظر آنے لگا۔ حماد نے جب یہ کہا کہ جب ہم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے تو یہیں تصور میں حضرتِ بلالؓ اور حضرت خبابؓ کو اپنے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھتا تھا' مجھے اس بات پر شرم محسوس ہوتی تھی کہ میں اپنی تکلیف پر کسی کو برا بھلا کہوں۔ یقین کریں کہ میں ہر روز ان جلادوں کا انتظار کرتا تھا اور جب یہ جلاد ظلم کرتے ہوئے تھک جاتے تھے تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ابھی کسی وقت میں اپنے رب کے سامنے حاضر کیا جاؤں گا اور میرے ان زخموں کی گواہی میرے رب کو خوش کرنے کے لئے کافی ہو گی۔

کیوباکا گوانتاموہو یا خود امریکا' برطانیہ کی سرزمین' مسلمان ایک مشکوک کمیونٹی اور اسلام ایک مشکوک مذہب بن چکا ہے۔ گیارہ ستمبر کے حادثات کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک تحریک ہے جو مسلسل چلائی جارہی ہے جس کو سرکاری اور غیر سرکاری دونوں سطحوں پر پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ نائن الیون سے پہلے کھلے عام کسی مذہب یا شخص کے خلاف نفرت نہیں پھیلائی جاسکتی تھی مگر اس حادثے کے بعد یہ سلسلہ نہ صرف جاری ہے بلکہ اس کا مہلک پن روز افزوں ہے۔ آئے دن اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی نہ کوئی بیان داغ دیا جاتا ہے' کبھی پیغمبر اسلام کے کارٹون شائع کر کے مسلمانوں کو اشتعال دلانے کی کوشش کی جاتی ہے' کبھی آئے دن مسلمانوں کو دہشت گردی کے الزامات میں گرفتار کر کے ان کی تشہیر الیکٹرانک اور پریس میڈیا میں ایک طوفان کھڑا کر دیا جاتا ہے لیکن جب تحقیق کے بعد کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا تو خاموشی کے ساتھ ان کو رہا کر دیا جاتا ہے اور وہی میڈیا ان کی رہائی کو دانستہ طور پر نشر نہیں کرتا۔

جیری فالویل سے لیکر این کولٹر (امریکی خاتون) تک آئے دن کوئی نہ کوئی مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتا رہتا ہے۔ مسلمانوں کے سول رائٹس کا یہ حال ہے کہ انہیں یقینی بنانے کے لئے آئے دن عدالتوں کو رجوع کرنا پڑتا ہے۔ دو ہزار سے زائد مسلمان اب بھی امریکی قید خانوں میں بند ہیں' متعدد پر اب تک کوئی مقدمہ قائم نہیں کیا جاسکا اور کئی ایسے ہیں جن کو اس بات کا بھی علم نہیں کہ ان کو کس جرم میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ فلوریڈا کے ممتاز فلسطینی پروفیسر سمیع بھی جنہیں کسی زمانے میں وائٹ ہاوس میں مدعو کیا جاتا تھا جی' کئی سال جیل میں رہے جہاں انہیں کسی بھی قانونی مشیر سے رابطہ کرنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔ کسی نہ کسی ریڈیو یا ٹی وی اسٹیشن پر آئے روز ایسے کلمات کہے جارہے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے صریحاً خلاف ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ بہت ہی بیہودہ قسم کے الزامات کا پلندہ نشر کیا جارہا ہوتا ہے جس کی بناء پر مسلمانوں کو متعلقہ اداروں کو شکائت کرنا پڑتی ہے مثلاً ایک الزام یہ بھی لگایا گیا کہ مسلمان عراق میں یہودیوں کو قتل کرنا چاہتے تھے۔

ایک مربوط اور منظم مہم ہے جو مسلمانوں کے خلاف پوری دنیا میں بالعموم اور امریکا میں بالخصوص چلائی جارہی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ مہم اپنے اہداف حاصل کر پارہی ہے؟ میرے خیال میں یہ ناروا مہم چند ایک جگہ مقامی سطح پر تو شائد کامیاب ہوئی ہو مگر مجموعی طور پر اس مہم کے نتائج اس کے بنیادی مقاصد کے بالکل برعکس نکل رہے ہیں' وہ اس طرح کہ نائن الیون کے بعد تمام منفی پروپیگنڈے کے باوجود امریکا میں اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں چار گنا اضافہ ہوا ہے۔ اسلام کو جاننے اور اس کے متعلق پڑھنے والوں کی تعداد میں ہوشربا اضافہ ہوا ہے جس کا اندازہ اسلام کے متعلق لکھی جانے والی کتابوں کے مارکیٹ سے غائب ہو جانے سے لگتا ہے۔ ایک عام امریکی بھی اسلام کے متعلق سوال پوچھتا دکھائی دیتا ہے اس سلسلے میں ایسی ویب سائٹس میں اضافہ ہوا ہے جہاں اسلام کے بارے میں کتب کے علاوہ دوسری معلومات کے حصول میں اضافہ ہوا ہے اور متعدد امریکیوں نے انٹرنیٹ ہی کی سہولت کے ذریعے اسلام کی روشنی تک رسائی حاصل کی ہے۔

اس نفرت پر مبنی مہم کا ایک لازمی اور فطری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمانوں نے پہلی دفعہ اپنے آپ کو سیاسی سطح پر منظم کرنا شروع کر دیا ہے اور آپ نے پہلی دفعہ دیکھا کہ امریکی اور مغربی ممالک کے انتخابات میں مسلمانوں نے اپنی اجتماعی سیاسی قوت کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس صورتحال میں سفید فام امریکی اور برطانوی نہائت متفکر ہیں جو آبادی کے لحاظ سے بھی اپنی فیصلہ کن پوزیشن آہستہ آہستہ کھوتے جارہے ہیں۔ رائے شماری کے اندازوں کے

مطابق ۲۰۵۰ء تک ان کی موجودہ اکثریت خاصی حد تک کم ہو جائے گی اور ہسپانوی اور ایشیائی لوگوں کی تعداد میں تین گنا اضافہ ہو جائے گا۔ صرف ہسپانوی لوگ آبادی کا ایک چوتھائی بن جائیں گے جن کی تعداد ۳۶ ملین سے ۱۰۳ ملین تک جا پہنچے گی اور ان کا تناسب ۱۲۶ فیصد سے ۲۴۴ فیصد تک ہو جائے گا۔

یہ تو تھی امریکا کی صورتحال' کیا اسلام کے خلاف چلائی جانے والی اس مہم کو بین الاقوامی سطح پر بھی کوئی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کسی مقامی سطح پر تو شائد یہ مہم اسلام کا تاثر بگاڑنے میں کامیاب رہی ہو مگر مجموعی طور پر یہ مہم ناکام ہی رہی ہے۔ فرانس اور جرمنی میں عورتوں کے حجاب لینے کے معاملے پر اس قدر ردّ عمل ہوا کہ ان خواتین نے بھی اسکارف اوڑھنے شروع کر دیئے جنہوں نے کبھی یہ تردّد نہیں کیا تھا۔ جرمنی میں لاس اینجلس ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق مساجد کے مینار اب کثرت سے دکھائی دیتے ہیں جہاں صرف ان چند سالوں میں میناروں والی مساجد میں تین گنا اضافہ ہو گیا ہے۔

امریکا کے سب سے بڑے اتحادی برطانیہ کو ہی دیکھ لیں جہاں اسلام نہ صرف عوام میں تیزی سے پھیل رہا ہے بلکہ اشرافیہ میں بھی ۱۴۲۰۰ سفید فام (اب ان کی تعداد دگنی ہو چکی ہے) برطانوی اسلام قبول کر چکے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں برطانوی اسٹیبلشمنٹ کے لوگ بھی شامل ہیں مثلاً سابق ہیلتھ سیکرٹری فرینک ڈابسن

کے بیٹے احمد ڈابسن' بی بی سی کے سابق ڈائریکٹر جنرل لارڈ برٹ کے صاحبزادے یحییٰ برٹ جو اسلام پر خاصی ریسرچ میں مصروف ہیں اور سابق برطانوی وزیراعظم ہربرٹ ایسکیوتھ جو پرنس آف ویلز کے لئے ایک اسلامی باغ بھی ڈیزائن کر چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک سابق ڈپلومیٹ چارلس ایٹن کی اسلام کے متعلق تحریریں برطانوی عوام کو اسلام کے سمجھنے میں خاصی مدد و معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ ایک نجی ٹی وی کی سابق میزبان کرسٹیان بیکر بھی اسلام قبول کر چکی ہیں اس کے علاوہ جو لنکن شائر میں ۲۸ ہزار ایکڑ اراضی کے مالک ہیں' اسلام کی روشنی میں اپنا نام عبدالمتین رکھ چکے ہیں۔ ان حقائق سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کو پابند کرنے کی جتنی بھی کوششیں کی جا رہی ہیں' وہ نہ صرف ناکام ہو رہی ہیں بلکہ اسلام کی نشر و اشاعت میں اضافے کا سبب بن رہی ہیں۔

رہے نام میرے رب کا جو اپنے بندوں کا بہترین مددگار ہے!

بروز بدھ ۲۴ صفر ۱۴۳۱ھ ۹ فروری ۲۰۱۰ء

امن بذریعہ ظلم

امریکا کے اخبار ''واشنگٹن پوسٹ'' کی ویب سائٹ پر تحقیق کے لئے کچھ ڈھونڈ رہا تھا کہ ۱۲ مئی ۲۰۰۴ء کے اس کالم پر نظر ٹھہر گئی۔ جوں جوں پڑھتا جا رہا تھا رگوں میں دوڑتا ہوا خون جمنے لگا۔ خود امریکا کے اس اہم اخبار نے دنیا کی اس روشن خیال اور مہذب قوم کو جو تصویر پیش کی ہے' ہمارے ملک کے روشن خیال اور دن رات امریکا کی تعریفوں کے پل باندھنے والے بھی کھلی آنکھوں سے اپنے مربی اور آقا امریکا کا چہرہ دیکھ لیں جو ''روشن خیال'' قوم ہونے کا دعویٰ تو کرتا ہے لیکن اس قوم کا اندرون چنگیز سے بھی تاریک تر ہے۔ ابو غریب جیل میں عراقی قیدیوں نے امریکی تفتیشی افسران کے روبرو جو حلفیہ بیانات ریکارڈ کروائے ہیں' ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز اور ہلاکو کے مظالم امریکا کی فوجی پولیس کے شرمناک تشدد کے سامنے ہیچ دکھائی دیتے ہیں اور چنگیز اور ہلاکو اگر زندہ ہوتے تو یقیناً امن کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتے۔

قیدی قاسم مہدی حلاس نظریں جھکائے اپنے حلفیہ بیان میں کہتا ہے کہ ''جب وہ ابو غریب جیل پہنچا تو فوجی درندے تیزی کے ساتھ اس کی طرف لپکے اور اس کے بدن کے سارے لباس کو چند لمحوں میں تار تار کر کے ننگا کر دیا اور سب کے سامنے شدید قسم کا تشدد کیا جو ناقابل بیان ہے اور اسی مہدی حلاس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے بچشم خود دیکھا کہ ایک فوجی ترجمان نے ایک عراقی بچے کے ساتھ جس کی عمر پندرہ سے اٹھارہ سال تھی' بدفعلی کی۔ اس بدترین ظلم کی بنا پر وہ بچہ بعد میں اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا''۔ ایک اور قیدی محمد جمعہ نے اپنے حلفیہ بیان میں بتایا کہ ''جب اسے جیل لایا گیا تو سب سے پہلے اس کا لباس اتار کر سب کے سامنے ننگا کر کے بہیمانہ تشدد کیا گیا' اسے اگلے چھ روز اسی حالت میں ننگا رکھا گیا۔'' اسی قیدی محمد جمعہ نے یہ بھی بتایا کہ ''اس کے سامنے ایک باپ بیٹے کو بھی جیل میں لایا گیا' ان کے چہروں کو تھیلوں سے ڈھانپ کر ان کے بھی کپڑے اتار دیئے گئے اور اچانک کچھ فوجیوں نے ان پر بے پناہ تشدد شروع کر دیا۔ نوجوان یہ تمام تشدد اور سختی خاموشی سے برداشت کرتا رہا لیکن اس کا بوڑھا بہرہ باپ اپنے سر پر تھیلے کی وجہ سے یہ نہ جان سکا کہ یہ شور اس کے بیٹے پر ہونے والے تشدد کا ہے۔ کچھ دیر تشدد کے بعد اس نوجوان کے منہ کے اوپر سے تھیلا اتار دیا گیا۔ جونہی بیٹے نے اپنے والد کو اس حال میں دیکھا تو دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ قیدی جمعہ نے اپنے حلفی بیان میں مزید یہ بھی کہا کہ کئی بار جیلر گارنر نے کھانا لیٹرین (بیت الخلائ) میں ڈال دیا اور قیدیوں سے کہا کہ وہ وہاں سے اٹھا کر کھانا کھائیں۔

قیدی نمبر ۱۳۰۷۷ حیدر صابر نے اپنے حلفیہ بیان میں کہا کہ انہوں نے ہمیں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کتوں کی طرح چلنے پر مجبور کیا' وہ ہمیں کتوں کی طرح بھونکنے کا حکم دیتے' اگر ہم انکار کرتے تو ہمارے چہروں اور سینوں پر تھپڑوں کی بارش کر دیتے۔ ایک اور قیدی الشیخ نے اپنے حلفی بیان میں کہا کہ اسے ۱۷/اکتوبر کو رفتار کیا گیا' اور اسی روز ابو غریب جیل میں لایا گیا۔ پہلی رات تو اسے ایک خیمے میں رکھا گیا' دوسرے روز اسے ایک دو منزلہ عمارت میں منتقل کر دیا گیا جو تشدد کے حوالے سے مشہور تھی۔ اس نے بتایا کہ ایک بوری اس کے سر پر چڑھا دی گئی اور آناً فاناً اس کے کپڑے بھاڑ دیئے گئے اور اس کو ننگا کر دیا گیا۔ امریکی سپاہیوں نے اپنے طنزیہ تبصروں کے ذریعے اس پر طنز و طعن کے تیر برسانے شروع کر دیئے۔ ایک نے پوچھا کیا تم اللہ سے دعا مانگ رہے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو سپاہی نے مجھے اور اللہ کو (نعوذ باللہ) دونوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔

انہوں نے کہا تم یہاں سے صحیح سلامت ہر گز باہر نہ جاسکو گے بلکہ ساری عمر کے لئے تمہیں معذور بنا کر ہی بھیجیں گے۔اس نے مجھ سے پوچھا کیا تم شادی شدہ ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو اس نے کہا کہ اگر تمہاری بیوی تمہیں اس حالت میں دیکھ لے تو اسے کتنا افسوس ہو گا۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ اگر میں اس کی بیوی کو اس وقت دیکھ لوں تو اسے کوئی افسوس نہ ہو گا کیونکہ میں اس کی عزت لوٹ چکا ہوں۔اسی قیدی الشیخ نے بتایا کہ ایک سپاہی نے اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر لاٹھیوں کی بارش کر دی اور اسے اسلام کو برا بھلا کہنے پر مجبور کیا۔سپاہی نے الشیخ سے پوچھا کہ تمہارا کس پر ایمان ہے؟ قیدی نے کہا کہ میرا ایمان اللہ پر ہے' جواباً سپاہی نے کہا کہ میرا ایمان تو تشدد پر ہے اور میں تمہیں مسلسل تشدد کا نشانہ بناتا رہوں گا' اس کے بعد کیا گزری' پڑھکر دل دہل گیا ہے۔

واشنگٹن پوسٹ کی یہ رپورٹ پڑھتے ہوئے میرا دل گھبرانے لگا اور شدتِ غم سے میری آنکھوں کی نمی نے مجھے مزید پڑھنے سے روک دیا۔شائد میری زندگی کا سب سے اذیت ناک کالم ہے۔اس رپورٹ میں قیدیوں پر عینی تشدد کے بہیمانہ واقعات اور بھی درج ہیں لیکن میرا قلم انہیں تحریر کرنے سے قاصر ہے۔اس تفتیش کے دوران ملٹری پولیس کے کئی افسران نے کہا کہ انہیں امریکی انٹیلی جنس کی طرف سے قیدیوں پر تشدد کرنے کے احکامات موصول ہوئے تھے' ہم نے تشدد اپنے طور پر نہیں کیا ایک تحقیق کے دوران ان اعلیٰ امریکی رہنماوں کے نام بھی سامنے آچکے ہیں۔ کیا عافیہ کو مجرم قرار دینے والی جیوری نے ان افراد کو بھی مجرم قرار دیا ہے یا کہ نہیں؟ اگر ایسا نہیں ہوا تو تاریخ میں اس دوغلے پن پر جو لعنت بھیجی جائے گی بالآخر ان کا مقدر ٹھہرے گی اور آئندہ امریکی نسل ان ظلم و عفریت کے سیاہ داغ اور دھبوں کو اپنے خون سے دھو بھی سکے گی؟

ابو غریب جیل' کوفہ و نجف' بغداد و کربلا اور غزہ و رفاہ غرضیکہ قدم قدم پر امریکا نے براہِ راست یا اپنے لے پالک اسرائیل کے ذریعے مستقل قید خانے کھول رکھے ہیں اور دوسری طرف بھارتی ہندو بنیا کشمیر میں خونِ مسلم سے ہولی کھیل رہا ہے۔اس وقت عالمِ اسلام کے عوام پر ہر سطح پر امریکا کو گالیاں دے رہے اور ابرا بھلا کہہ رہے ہیں' بے بس اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں البتہ عالمِ اسلام کے حکمرانوں کی بے حسی ناقابل فہم ہے۔

فلسطین' عراق اور کشمیر یہاں ظلم و ستم کی خونیں لہروں سے نبرد آزما اہل جرات و عزیمت کے ہاتھ شل ہو چکے ہیں' اگرچہ انہوں نے ہمت و استقامت کے چراغ روشن کر رکھے ہیں مگر ان کی بے کسی کو بڑھانے کے لئے حد نظر پر اسلامی کانفرنس کا کنارہ بھی موجود ہے۔ کیا اب بھی دوٹوک فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے کہ نہیں؟ اب اسلامی کانفرنس کے پاس دو ہی راستے ہیں' یا تو وہ امتِ مسلمہ کی قیادت سے دستبردار ہو جائے یا پھر اس کی قیادت کا حق ادا کرے۔ امت مسلمہ کی قیادت کا حق یہ ہے کہ اسلامی کانفرنس کا ہنگامی اجلاس بلایا جائے اور اس میں مطالبہ کیا جائے کہ امریکا نے ایک طرف اقوام متحدہ کے چارٹر اور دوسری طرف جینوا کنونشن کے اصولوں کی دھجیاں اڑائی ہیں اس لئے ان تمام مظالم کے خلاف اس پر عالمی عدالت انصاف میں مقدمہ چلایا جائے اور جب تک ان مظالم کا عملی خاتمہ نہیں ہو جاتا' امریکا اور اس کے اتحادیوں سے ہر قسم کا تعلق ختم کر دیا جائے۔

علاوہ ازیں اس وقت دنیا کے امن پسند اور منصف مزاج لوگوں کو یہ سمجھانے کی بھی ضرورت ہے کہ امریکا دنیا میں ظلم کا بازار گرم کر کے عالمی امن کو تہہ و بالا کر رہا ہے' امریکی جنگی جرائم محض مسلمانوں کے خلاف نہیں' ساری انسانیت کے خلاف ہیں۔ اسلامی کانفرنس یورپ کے چند ممالک' روس اور چین کی مدد سے ایک نیا عالمی ادارہ انصاف قائم کرے جو صحیح معنوں میں اپنے چارٹر پر عمل کروائے۔ دنیا میں اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک ظلم کا خاتمہ نہ ہو۔ امریکا دنیا میں امن بذریعہ ظلم قائم کرنا چاہتا ہے جو ناممکن ہے۔ امریکا کو جتنی جلدی یہ بات سمجھا دی جائے اتنا ہی عالمی امن کے لئے مفید ہو گا۔ دنیا میں اس ظلم کا ساتھ دینے والے مسلمان ممالک کے ان رہنماؤں کو بھی انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کرنا ہو گا جو اس جرم میں برابر کے شریک ہیں اور اس وقت امریکی آشیر باد سے اپنی عوام اور ملک کے وسائل کو اس ظلم کی بھٹی کا ایندھن بنا رہے ہیں۔

سنا ہے کہ ہمارے صدرِ محترم کا روزانہ چار کالے بکروں کا صدقہ اتارا جاتا ہے۔ کیا روزانہ ان بیسیوں بے گناہ پاکستانیوں جن کے ڈرون حملوں میں پرخچے اڑا دیئے جاتے ہیں' ان کا صدقہ بھی محض اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے آخر کب تک ادا کرتے رہیں گے ؟ اس کا بھی تو حساب لیا جائے گا؟؟؟ آئے دن پوری قوم کو اضطراب کی سولی پر چڑھا دینے کا بیجا شوق کب ختم ہو گا۔ عدلیہ کو محض اس لئے تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی کہ این آر او ختم ہونے پر تمام مقدمات کا از سر نو کھل جانا ان کے اقتدار کی رخصتی کا سبب نہ بن جائے۔ ''انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند"!

رہے نام میرے رب کا' جس کے گھر میں دیر تو ہے لیکن اندھیر نہیں!

میں جل رہا ہوں کسی تیرگی کے منظر میں
بلا رہی ہے مجھے روشنی دریچوں سے
تیرہ شبی کا ذکر نہ کر گلے ملے گی
ثباتِ عرصہ کبھی روشنی دریچوں سے

بروز جمعرات ۲۵ صفر ۱۴۳۱ھ ۱۰ فروری ۲۰۱۰ء

ذرا رک کر سوچئے!

اگر سفر کے کسی موڑ پر، کسی نہ کسی سنگِ میل پر رک کر پیچھے پلٹ کر دیکھنا، سود و زیاں کا اندازہ لگانا اور آگے قدم بڑھانے سے پہلے نئے سرے سے کوئی فیصلہ کرنا، دانشمندوں کا کام ہے تو ہمیں ذرا دیر کے لئے دم لیکر سوچنا چاہئے کہ دہشت گردی کے خلاف جس مہم کو ہم نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہے کیا وہ واقعی دہشت گردی کے خلاف مہم ہے؟ کیا واقعی اس کا مقصد دنیا کو انتہا پسندی اور غار تگری سے نجات دلانا ہے؟ کیا واقعی اس کی منزل مراد امن، انصاف اور آزادی ہے؟ کیا واقعی جارج بش اور اس کے قبیلے کی شروع کردہ جنگ جو باراک اوبامہ کو ورثے میں ملی ہے، دہشت گردی کے اسباب و محرکات کو ختم کرنے میں مخلص ہے؟ کیا باراک اوبامہ اور امریکا کے پالیسی ساز خلوصِ دل کے ساتھ دنیا کے باسیوں کو ایک نئی پر امن دنیا کا تحفہ دینا چاہتے ہیں؟

ابتدائے عشق میں ہم دبے لفظوں میں کہا کرتے تھے کہ ''دہشت گردی'' کی واضح اور متعین تعریف کی جانی چاہئے۔ اب ہم نے یہ کہنا چھوڑ دیا ہے اور ایمان لے آئے ہیں کہ ہر وہ حرکت دہشت گردی ہے جسے امریکا دہشت گردی کہتا ہے اور ہر وہ شخص دہشت گرد ہے جسے امریکا ایسا سمجھتا ہے۔ آغازِ سفر میں ہم سرگوشی کے انداز میں یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ''دہشت گردی کے اصل محرکات کا خاتمہ کیا جانا چاہئے۔'' اب ہم نے ایسا کہنا ترک کر دیا ہے اور بھول گئے ہیں کہ دنیا بھر میں دہشت گردی کو کوئی ہوا دے رہا ہے اور کون ہے جس کے انسانیت سوز طرزِ عمل کے باعث نفرتوں کے الاؤ بھڑک رہے ہیں اور اشتعال میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ہم کہہ دیتے تھے کہ امریکا کو اپنی مہم کے بارے میں مسلم دشمنی کا تاثر نہیں دینا چاہئے لیکن اب ہم نے اشارے کنائے سے بھی ایسا کہنا چھوڑ دیا ہے اور اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں کہ افغانستان اور عراق میں کون بستا ہے، اسرائیل کس کے کھونٹے پر ناچ رہا ہے اور بھارت کس کی اشیر باد سے کشمیریوں کا لہو بہا رہا ہے؟

ایک عرصے تک کسی کو اندازہ نہ ہوا کہ ''القاعدہ'' کیا ہے؟ آج بھی کوئی نہیں جانتا کہ یہ تنظیم کب اور کہاں قائم ہوئی، اس کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے، اس کے نظم کا نقشہ کار کیا ہے، اس کے اہداف اور مقاصد کیا ہیں؟؟؟ یہ کس طرح کا نیٹ ورک رکھتی اور کیوں کر اپنے مقاصد کو آگے بڑھاتی ہے؟ ہمارے پاس اس تنظیم کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں لیکن امریکا کے ایماء پر ہر اس شخص پر ''القاعدہ'' کی مہر لگا دی جاتی ہے جو کسی بھی آشیانے سے گرفت میں آ جاتا ہے اور جس کے پاس پاکستانی شہریت نہیں ہوتی۔ پاکستان کے کسی گوشے میں بیٹھا ہر وہ شخص ''القاعدہ'' کا رہنما یا کارکن قرار پا چکا ہے جو کسی نہ کسی دور میں خود ہمارے بلاوے پر کسی امریکی طیارے میں بیٹھ کر یہاں آیا اور جہادِ افغانستان کے خاتمے کے بعد یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

نائن الیون کے ساتھ ہی دہشت گردی کے خلاف جو نام نہاد جنگ شروع کی گئی تھی اب وہ اپنا بھرم کھو چکی ہے اور جیلوں میں بند قیدیوں پر تشدد اور ان کے خلاف تذلیل کے واقعات کے بعد تو یہ جنگ مکمل طور پر بے ننگ و نام ہو چکی ہے اور اس سے وابستگی اعزاز کی بجائے دشنام بنتی جا رہی ہے۔ اس جنگ کا آغاز اس الزام سے ہوا کہ نائن الیون کی وارداتیں اسامہ بن لادن نے کی ہیں۔ آج تک اس کے ثبوت میں کوئی مستند یا ٹھوس ثبوت و دلیل سامنے نہیں

آسکی اور امریکا کوئی ایک بھی ایسی پگڈنڈی تلاش نہیں کر پایا جو افغانستان کے پہاڑوں اور گھاٹیوں کی طرف نکلتی ہو۔ یہ بلا جواز جنگ ابھی تک اسامہ بن لادن کی گرد پا کو بھی نہیں چھو سکی۔ دہشت گردی کی جنگ کا دوسرا نشانہ طالبان بنے کیونکہ انہوں نے امریکی طالبان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا ۔ جنگ کا یہ ہدف بھی آج رسوائیوں کی زد میں ہے کہ حامد کرزئی کا افغانستان ملا عمر کے افغانستان سے کہیں زیادہ بے وقعت اور بے توقیر ہو چکا ہے۔ اب وہاں کوئی مرکزی حکومت نہیں، تند خو وار لارڈز پھر سے حاکم بن گئے ہیں، امن وامان قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ پوست کی فصلیں لہلہا رہی ہیں اور انسانی خون پہلے سے کہیں زیادہ ارزاں ہو چکا ہے۔

دہشت گردی کی مہم کا تیسرا نشانہ عراق بنا۔ اس مہم جوئی کا یہ جواز پیش کیا گیا کہ صدام حسین کے پاس بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ایٹمی، کیمیائی اور جراثیمی ہتھیاروں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ اقوام متحدہ کے انسپکٹروں نے کہا یہ غلط ہے، ہم عراق کا چپہ چپہ چھان چکے ہیں لیکن امریکا نہ مانا بلکہ ایک رائے تو یہ بھی ہے کہ امریکا نے اسرائیلی انٹیلی جنس کے کہنے پر اقوام متحدہ کے انسپکٹروں کے ذریعے یہ مکمل یقین کر لیا کہ عراق کے پاس ایسا کوئی ہتھیار موجود نہ ہو جو جنگ میں ان کے خلاف استعمال ہو سکے۔ امریکا نے سلامتی کونسل سے حملے کی اجازت چاہی لیکن سلامتی کونسل نے انکار کر دیا۔ پھر جھوٹی اور بے بنیاد رپورٹیں تخلیق کی گئیں، دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی گئی جس میں برطانیہ کے ٹونی بلیر نے بھی پورا ساتھ دیا۔ فریب کاری کا ایک تماشہ رچایا گیا اور عراق کو نشانے پر دھر لیا گیا۔

افغانستان کو شکنجے میں کسے نواں سال ہو رہا ہے اور سرزمین کوفہ و بغداد کو جہنم زار بنائے اب آٹھواں سال چل رہا ہے۔ امریکی مہم نے ان دونوں سوختہ بخت بستیوں کو کیا دیا ہے ؟ کیا آج کا افغانستان ملا عمر کے افغانستان سے زیادہ خوش جمال ہے ؟ کیا آج کا عراق صدام حسین کے عراق سے زیادہ حسین و جمیل ہے ؟ کیا دونوں ممالک میں جمہوریت کی چاندی بکھر چکی ہے ؟ کیا ان دونوں ممالک میں آزادی کی شہزادی جھانجھریں چھنکاتی پھرتی ہے ؟ کیا دونوں ممالک میں امن کی دیویاں رقص کر رہی ہیں ؟ کیا دونوں ممالک میں امن و آشتی کا دور دورہ ہے ؟ کیا دونوں ممالک میں غربت و افلاس کا خاتمہ ہو گیا ہے ؟

اور اب تو یہ نام نہاد جنگ بالکل نئی وضع اختیار کر گئی ہے۔ امریکی مظالم کی کہانیوں نے سوا ارب مسلمانوں کے دلوں میں چنگاریاں بھر دی ہیں۔ اب تو یہ تاثر ایک قومی حقیقت بنتا جا رہا ہے کہ دہشت گرد افغانستان ہے نہ عراق، دہشت گرد تو امریکا ہے۔ دہشت گردی کو طالبان، اسامہ یا صدام نے نہیں بلکہ صہیونی طاقتوں کے سب سے بڑے ایجنٹ جارج بش اور ان کے وہ اتحادی تھے جو اب بھی مختلف چہروں سے دہشت گردی میں مصروف ہیں۔ صرف ابو غریب جیل اور کابل، قندھار اور ہلمند میں انسانیت سوز درندگی اور دہشت گردی کی اتنی کہانیاں رقم ہوئی ہیں جتنی پوری دنیا میں کئی صدیوں میں نہیں ہوئی ہونگی۔ فرانس، جرمنی اور اسپین کے عوام نے تو پہلا موقع ملتے ہی وہ حکومتیں الٹ دیں جو اس دہشت گردی کی مہم میں امریکا کا ساتھ دے رہی تھیں۔

لمحہ بھر رک جایئے' ذرا دم لیجئے کہ کیا دہشت گرد امریکا ہے یا فلوجہ کے نہتے اور بے سروساماں عراقی؟ دہشت گرد امریکا ہے یا مادرِ وطن کی عصمت و آبرو کا تحفظ کرنے والے عراقی؟ دہشت گرد امریکی سپاہ ہے یا المہدی آرمی؟ دہشت گرد امریکا ہے یا نجف و کربلا کے آتش بجاں؟ دہشت گرد امریکا ہے یا ابو غریب جیل کے عقوبت خانوں میں تڑپتے برہنہ قیدی؟ دہشت گرد ڈیزی کٹر اور کلسٹر بم گرانے والا امریکا ہے یا شادی کے گیت گانے والی بچیاں؟ دہشتگرد امریکا ہے یا قلعہ جنگی کے وہ قیدی جن کو ایک کنٹینر میں بند کر کے نیچے آگ دہکا دی گئی اور تمام قیدیوں کو اس آگ کی شدت سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا؟ دہشتگرد امریکا ہے یا گوانتاناموبے کے قیدی کہ جن کے اوپر مظالم کی داستانوں نے ساری دنیا کے امن پسند لوگوں کو ششدر کر دیا ہے؟

دہشتگرد امریکا ہے یا ملا عمر؟ دہشت گرد مسلمانوں کے حلق میں سور اور شراب انڈیلنے والے ہیں یا بیت الخلاؤں سے کھانا اٹھا کر کھانے پر مجبور کئے جانے والے بے بس اور مجبور قیدی؟ دہشت گرد امریکا ہے یا ایک مجبور و بیکس ڈاکٹر عافیہ صدیقی جس کو تین معصوم بچوں کے ساتھ اغوا کر لیا گیا اور پانچ سال کے بعد اس پر ہونے والے بہیمانہ ظلم کا دنیا کو پتا چلا اور اس کے دو معصوم بچوں کا ابھی تک پتہ نہیں چل رہا کہ وہ کہاں ہیں اور امریکا کا عدل و انصاف کا ادارہ بھی اپنے تعصب کو محض اس لئے چھپا نہ سکا کہ عافیہ مسلمان ہے!

خدا کے لئے ذرا رک کر سوچئے! آخر ہم دہشت گردی کی کون سی مہم کا دست و بازو بن گئے ہیں کہ امریکا خود تو طالبان کے ساتھ مذاکرات کر رہا ہے لیکن پاکستان کو اپنے ہی ملک میں ان جنگجوؤں سے بات کرنے کی اجازت نہیں جس کی تشکیل میں امریکا کے ساتھ اس کے حواری یہود و ہنود شامل ہیں؟ ہم امریکا کے کیسے اتحادی ہیں کہ جس کی سرزمین پر آئے دن ڈرون حملوں نے ایک قیامت ڈھا رکھی ہے؟ امریکا ہمارا کیسا دوست ہے جس نے پاکستانی عوام کی امنگوں کے خلاف ایک ڈکٹیٹر اور فاسق مشرف کی مکمل حمائت کرتا رہا اور عوام کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو این آر او کے تحت ان بدعنوان اور کرپٹ ترین لوگوں کو اقتدار میں لے آیا جو اب پاکستان کے تمام اداروں کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اپنے چلن پر نظر ثانی کریں اور پاکستان کو بچانے کے لئے ایک ایسی بھرپور تحریک کا آغاز کریں جہاں پاکستان کو لوٹنے والے اپنے انجام کو پہنچ سکیں۔

رہے نام میرے رب کا جو جزا و سزا کے دن کا مالک ہے!

فریادِ عندلیب سے کانپے تمام شہر — لیکن نہ گل نہ باغ نہ بادِ صبا سنے
شاہوں کی بات اور ہے شاہوں کا ذکر کیا — لیکن گدا کی بات نہ کوئی گدا سنے

بروز ہفتہ ۲۷ صفر ۱۴۳۱ھ ۲۱ فروری ۲۰۱۰ء

ہماری وصیت

اب تو الفاظ بھی ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ مظلومیت اب اس انتہا کو جا پہنچی ہے کہ آنکھوں سے آنسو بھی خشک ہو گئے ہیں' اب تو رونا بھی نہیں آتا۔ امریکی وحشی قوم نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس ظلم و فساد کی داستان تحریر کرنے کے لئے بیکس و مظلوم مسلمانوں کی آنکھوں سے بہنے والے خون کے آنسو کیا کم تھے کہ ای میل میں موصول ہونے والی وصی ظفر کی خون میں ڈوبی ہوئی بہت ہی خوبصورت نظم نے بے چین کر دیا ہے' یہ ایک بچے کی زبانی دہائی دیتی ہوئی ایک لوری ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اسی سے اپنا کالم شروع کروں کہ ایسے ہزاروں بچوں جن کا تعلق عراق' افغانستان' فلسطین اور کشمیر سے ہے' ان کا قرض ہم سب کے ضمیر پر ایک بھاری بوجھ بن چکا ہے۔

ماں! مجھے نیند نہیں آتی ہے
ایک مدت سے مجھے نیند نہیں آتی ہے
ماں! مجھے لوری سناؤ ناں
ماں! مجھے نیند نہیں آتی ہے
رت جگے اب تو مقدر ہیں میری پلکوں کے
نیند آئے تو لے آتی ہے بغداد کی یاد
آنکھ لگتے ہی کوئی بیوہ اٹھا دیتی ہے
پیٹ کتنا ہی بھروں بھوک نہیں مٹتی ہے
جلتے بصرہ کی مجھے پیاس جگا دیتی ہے
کوئی قندھار کی وادی سے بلاتا ہے مجھے
ذکر قندوز کا آئے تو مجھے لگتا ہے
کاٹ کے سر کوئی ہنستا ہے' جلاتا ہے مجھے
بم کی آوازیں مجھے کچھ نہیں کہتی ہیں مگر
زخم ان بچوں کے سونے نہیں دیتے ہیں مجھے
میرے سینے پر رکھو ہاتھ
رلا دو ناں مجھے
ہاں ماں! مجھے لوری سناؤ
سلا دو ناں مجھے
ماں! مجھے نیند نہیں آتی ہے

میرے سینے پر رکھو ہاتھ
رلا دو ناں مجھے
ناں ماں! مجھے لوری سناو
سلا دو ناں مجھے
ماں! مجھے نیند نہیں آتی ہے
ایک مدت سے مجھے نیند نہیں آتی ہے

ای میل سے موصول ہونے والی یہ نظم آج بڑی ہمت کر کے یہاں نقل کر رہا ہوں کہ شائد کسی ماں کو کوئی ایسی لوری یاد ہو کہ اسے سن کر یہ بچہ سو سکے۔ اس کی معصوم آنکھوں میں رتجگے خون کے دھارے بن کر اس کے چہرے پر لکیریں بن بن کر اس کے دامن کو خون آلود کر رہے ہیں اور اسے سونے نہیں دیتے۔ بے خوابی ایسے ہزاروں بچوں کی آنکھوں میں جم گئی ہے۔ میں نے ایسی کئی تصاویر دیکھی ہیں جن کا میں اپنے آپ سے بھی ذکر نہیں کر سکتا۔ میری ماوں، بہنوں اور بیٹیوں کی ان درندوں نے اتنی بے عزتی کی ہے کہ ان کی تصاویر تو شائد کبھی نہ چھپ سکیں۔ اب تو لگتا ہے امریکا اور اس کے اتحادیوں کو نہ تو تیل چاہئے، نہ ہی مسلمان ممالک کی دولت اور زمین، ان کا مقصد مسلمانوں کی مکمل تباہی اور ان کی عزت نفس کی بربادی ہے۔

یہ درندے مسلم اقوام کی غیرت اور حمیت ملیامیٹ کرنے کے درپے ہیں اور ان کا مقصد یہ لگتا ہے کہ مسلمان دنیا کے صفحہ ہستی سے اپنے دین و ایمان کے ساتھ مٹ جائیں اور کسی گمشدہ تاریخ کا حصہ بن جائیں۔ میں نے جو تصویریں دیکھی ہیں، ان کے بعد ایک بھی مسلمان کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ عراق، افغانستان فلسطین اور کشمیر کی عمارتیں برباد ہوں تو پھر بن سکتی ہیں لیکن ان ملکوں کے مسلمانوں کی عزتیں جس طرح برباد کی گئیں ہیں، وہ کبھی واپس نہیں آسکتیں۔ اب تو خود امریکا اور اس کے اتحادی ممالک کے امن پسند افراد اپنے ہی ملکوں کی اس پالیسی کو نفرت سے دیکھتے ہیں لیکن جی چاہتا ہے کہ اپنے ملک کے ان دانشوروں، سیاستدانوں اور ڈکٹیٹروں کا منہ نوچ لیا جائے جواب بھی جدید تاتاریوں کی مسلم کش پالیسیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان سے دوستی کے لئے مرتے جا رہے ہیں۔ امن و آشا کے نام پر ان ظالموں کی وکالت کر رہے ہیں اور الٹا مسلمانوں کا گالی دے رہے ہیں کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسی قابل تھے۔

کیا کوئی پسماندہ اور غریب کی اس لئے ماں بہن اٹھالے اور اس کی عصمت دری کر دے کہ وہ اتنا طاقتور نہیں ہے کہ اپنا تحفظ کر سکے۔ امریکی فوج جیسی درندہ صفت اور وحشی فوج تاریخ میں کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ ایک باخبر بتا رہا تھا کہ افغانستان میں امریکی افواج نے یہی کچھ کیا ہے اور کشمیر میں بھارتی افواج نے ان سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان تمام مظالم کی خون آشام تصاویر بنی ہیں مگر یہ فوٹو گرافر ان ظالموں کے خونی پنجوں میں گرفتار ہو چکے ہیں اور ان ظالموں نے ان تصاویر کو بھی اپنے تئیں جلا دیا ہے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ مظالم اور درندگی کی تصاویر تو وہاں کی دھرتی اپنے سینے میں محفوظ کر لیتی ہے اور وقت آنے پر اگل دیتی ہے۔

اب تک جو تصاویر سامنے آچکی ہیں، وہ کیا کم ہیں؟ ہماری لٹی ہوئی عزتوں کی ایک عافیہ کی تصویر ہی کافی ہے جو ہمارے کسی بچے کو سونے نہیں دیتی اور کسی

ماں کو بھی ایسی لوری یاد نہیں جو ان روٹھی ہوئی نیندوں کو واپس لا سکے۔ عافیہ کے وہ معصوم بچے کہاں ہیں جن کے کانوں میں لوری کی بجائے اپنی ماں کی دلدوز چیخیں اور آہ وزاری گونج رہی ہے۔ عافیہ کے دو چھوٹے معصوم کہاں ہیں، کسی کو ان کی خبر ہے؟ عافیہ کا بڑا بچہ جس نے اپنی ماں کو اس اذیت میں دیکھا ہے، اپنے دو بہن بھائیوں کا پتہ پوچھ رہا ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟ ان بچوں کیا قصور ہے جو اس بہیمانہ ظلم اور ناانصافی کی آگ میں جھونک دیئے گئے! یہ بچے جب جوان ہونگے تو آگ کے ان گولوں کو کس طرح کی لوری سلا سکے گی! ہم تو جیتے جی مر گئے ہیں لیکن ہماری آنے والی نسلیں زندہ رہیں گی اور ان لٹی ہوئی عصمتوں کا ضرور حساب اور انتقام لے ں گی۔ ہماری ان کے لئے یہی وصیت ہے! سنئے میرا رب کیا فرماتا ہے!

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَاوَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَايَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَابِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَايَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ"

جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی اور انسان کہے گا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اس روز وہ اپنے (اوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اسے (ایسا کرنے کا) حکم دیا ہوگا۔ اس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے تاکہ ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں"۔

رہے نام میرے رب کا جس کا ہر وعدہ سچا ہے!

بروز اتوار ۲۸ صفر ۱۳۴۱ھ ۱۳ فروری ۲۰۱۰ء

اعترافِ جرم!

میں نے اپنا پچھلا کالم ''ہماری وصیت''میں شاعر وصی ظفر کی نظم کو اپنا عنوان بنایا تھا۔افسوس تو یہ ہے کہ میں وصی ظفر کی اس نظم پر ان کو خراجِ تحسین نہ پیش کر سکا لیکن یہ نظم اس قدر پسند کی گئی اور اتنے دلوں میں اتر گئی کہ شاعر نے نہ معلوم کتنے دلوں کو تہہ و بالا کر دیا۔اس کالم کے آخر میں نئی نسل سے عرض کیا گیا کہ ہم تو کچھ نہ کر سکے'اب وہی ہمارے اوپر ڈھائے ہوئے مظالم کا انتقام لیں گے اور یہی ''ہماری وصیت'' ہے۔اس پر امریکا کے بہت ہی پوش علاقے میں رہنے والی ایک بیٹی نے سوال کیا کہ ''آپ لوگوں نے ہمیں دیا کیا ہے کہ اب آپ ہم سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہم آپ کی وصیت پر ضرور عمل کریں'آپ کے ارمانوں اور خواہشات کی تکمیل کریں'آپ پر جو ظلم ہوئے ہیں ان کا انتقام لے سکیں؟"

میرے والدین انتہائی خوشحال تاجر ہیں۔دونوں صبح گھر سے نکلتے ہیں اور ڈھیر ساری دولت کما کر اپنے بینک اکاونٹس میں منتقل کر کے ہم پر یہ احسان جتاتے ہیں کہ ہماری ساری یہ محنت اپنے بچوں کے بہترین مستقبل کے لئے ہے تاکہ آئندہ زندگی میں یہ دولت آپ کی روشن اور کامیاب زندگی کے لئے مددگار ثابت ہو۔لیکن انہوں نے مجھے آج تک نماز پڑھنے کے لئے نہیں کہا کیونکہ وہ خود ایسا اہتمام کرنے سے قاصر ہیں۔والدہ کبھی کبھار رمضان المبارک کی ستائیسویں رات کو ہم سب بہن بھائیوں کو جمع کر کے گویا سارے سال کی عبادت کا کفارہ ادا کرتی ہیں۔بس اتنے عمل کو ہی اپنی اولاد کے لئے اسلامی تعلیمات اور تربیت کا مکمل کورس سمجھتی ہیں۔یہ تو کرمفرمائی ہے امریکا کی جس نے میرے جیسے کئی نام نہاد مسلمانوں کو مسلمان بنا دیا'انہیں احساس دلایا کہ وہ چونکہ مسلمان ہیں اس لئے ہمارے ظلم و عتاب کے سزاوار ٹھہرے ہیں۔ہم سوئے ہوئے مسلمانوں کو امریکا اور اس کے مغربی اتحادیوں کے بموں کی گھن گرج نے گہری نیند سے جگایا اور ہمارا رخ قبلہ کی طرف کر دیا ورنہ ہم تو اپنے دین و مذہب اور تہذیب و ثقافت سے بے بہرہ اور غافل تھے۔

ہماری نوجوان نسل کو پہلی مرتبہ اپنے مسلمان ہونے کا احساس ہوا'اور ہمیں اپنی کسی اہمیت کا پتہ چلا۔ہم نے جانا کہ مسلمان ہونا غیر مسلموں اور مسلم دشمنوں کی نظروں میں کیا ہوتا ہے'ہم کتنے اہم ہیں کہ دنیا کی اکلوتی سپر طاقت جو تاریخ میں اپنی طاقت کے اعتبار سے بے مثال ہے'اپنی پوری طاقت کے ساتھ ہم پر ٹوٹ پڑی ہے کہ جب تک ان کی جان میں جان ہے'ہم چین سے دنیا پر حکومت نہیں کر سکتے'اس لئے ان کو ختم کر دو اور اتنا کمزور کر دو کہ یہ ہمارے سامنے اٹھ نہ سکیں۔پہلے انہوں نے دنیا بھر کے مسلمان حکمرانوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور پھر مسلمان عوام پر ٹوٹ پڑے۔فلسطین'عراق' افغانستان اور کشمیر میں امریکی یا ان کے گماشتے اور ایجنٹ ہی مسلمانوں کی نسل کشی کر رہے ہیں۔اس نوجوان پاکستانی لڑکی نے بڑے تفاخر سے کہا کہ میں اب سر پر دوپٹہ یا اسکاف لیتی ہوں تاکہ میں دور سے بھی ایک مسلمان خاتون دکھائی دوں اور جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ میرے اندر یہ احساس میرے والدین اور آپ جیسے بزرگوں نے نہیں'امریکا نے پیدا کیا ہے۔ہمارے دشمن نے ہمیں ہم سے آگاہ کیا ہے اور ہم سے ہمارا تعارف کرایا ہے۔

میں دم بخود اور نہائت شرمسار ہو کر اس مسلمان پاکستانی لڑکی کی باتیں سنتا رہا۔میرے پاس اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں تھا'میری خاموشی میرے جرم کا اعتراف تھی۔میری نسل نے اپنی آنے والی نسل کو کیا دیا ہے جو ہم اس سے کوئی مطالبہ کر سکیں۔ہم نے بزرگوں کا بنا بنایا ملک برباد کر کے ان کے

سپرد کر دیا ہے۔ یہ ایک نظریاتی ملک تھا' کچھ اسباب تھے کچھ مطالبات تھے' کچھ تقاضے اور ضرو تیں تھیں جن کو ہمارے بزر گوں نے محسوس کیا اور ان کی تکمیل کے لئے ہمیں ایک ملک لے کر دیا کہ تم اس میں ایک مثالی نظریاتی اور فلاحی ریاست قائم کرو اور دنیا کے لئے ایک بہترین نمونہ بن جاو کسی نے اسے اسلام کا قلعہ کہا اور کسی نے اسے احیائے اسلام کا مرکز قرار دیا لیکن ہم نے اس ملک کو نہ اسلامی بنایا اور نہ غیر اسلامی' پتہ نہیں کیا بنا دیا کہ یہ کوئی نظریاتی ملک ہے اور نہ ہی کوئی سیکولر ترقی یافتہ ملک۔

اسے رشوت خوروں' بد معاشوں اور چوروں ڈاکوؤں کا ملک بنا دیا۔ کبھی جمہوری اور کبھی آمرانہ ملک بناتے رہے اور اس سے کھیلتے رہے۔ اگر کبھی صحیح الیکشن کرا بھی دیئے تو ان پر عمل نہیں کیا اور ملک تڑوالیا ورنہ جب بھی الیکشن کروایا اس میں دھاندلی کی۔ آدھے سے زیادہ عمر فوجی آمریت میں بسر کر دی۔ قوم نے یک زبان ہو کر یہ کبھی نہیں پوچھا کہ آپ کہاں سے آئے' کیوں آئے' آپ کے پاس آنے کا جواز کیا ہے بلکہ ہمارے سیاستدان کیا سوٹ بوٹ والے اور کیا جبہ و دستار والے سبھی ان کی خوشنودی میں جت گئے اور اس میں بازی لیجانے پر ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے رہے۔ آج ہم یہی منظر کھلی آنکھوں سے دن دیہاڑے دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے پاس آج نہ وہ دل باقی رہا ہے نہ دماغ اور نہ وہ زبان کہ ہم اپنی نسل سے کوئی مطالبہ کر سکیں' اس سے کوئی امید وابستہ کر سکیں۔ مجھے ڈر ہے اگر وہ مڑ کر ہم سے کچھ پوچھ لے تو ہم اس کا کیا جواب دیں گے۔

میں جب بھی مسلمانوں پر مغرب کی یلغار دیکھتا ہوں اور اس پر نوجوان نسل کی برہمی اور ردعمل کا ایمان افروز نظارہ کرتا ہوں تو مجھے حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا یہ الہامی مصرع یاد آتا ہے

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے

یہ کوئی اسی سال پہلے کی بات ہے کہ علامہ نے جو فرمایا' یہ اس وقت بھی درست تھا اور آج تو یوں لگتا ہے جیسے علامہ نے یہ مصرع کہہ کر محفوظ کر دیا تھا کہ مغرب جب پوری قوت کے ساتھ مسلمان دنیا پر ٹوٹ پڑے اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر اسلام جاگ اٹھے تو انہیں یہ پیش گوئی سنا دی جائے ۔آج کے جدید دور کے ایک نہائت خوشحال اور ماڈرن بچی سے میں اقبالؒ کی زبان میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ :

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

مجھے اپنے اس کالم کے جواب میں ایک اور پاکستانی نوجوان کا پیغام بھی ملا ہے جس کے ایک ایک لفظ میں آگ بھری ہوئی تھی۔ اس نے الیکٹرانک میں ڈاکٹریٹ کیا اور ایک قابل ستائش جذبے کے ساتھ اپنے ملک پاکستان کی خدمت کے لئے ڈیڑھ سال مختلف سرکاری محکموں میں دھکے کھاتا رہا۔ وہ بڑا پر عزم ہو کر پاکستان میں بجلی کے بحران کو ختم کرنے کے لئے اپنے ملک پاکستان گیا۔ اس کا خواب تھا کہ وہ پاکستان کو بجلی میں نہ صرف خود کفیل کر دے گا بلکہ ملک کی آدھے سے زیادہ آبادی کو مفت بجلی فراہم کر سکے گا جیسا پڑوسی ملک چین میں ہو رہا ہے۔ جب بھی حکومت کے کسی بڑے عہدیدار کو اپنا

پراجیکٹ بتاتا تھا تو اس سے پہلا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ اس پراجیکٹ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تمہیں فلاں کمپنی کے ساتھ اپنی شراکت کرنا ہو گی بلکہ کئی شاطر افراد نے اس پراجیکٹ کے بلیو پرنٹ کا مطالبہ بھی کیا تا کہ اس نوجوان کی برسوں کی تحقیق ان کے قبضے میں آجائے اور اس ملک کو لوٹنے کا نیا بہانہ ان کے ہاتھوں میں آجائے۔ اس نے جن پاکستانی افراد کی فہرست مجھے لکھی ہے اس میں سیاستدانوں بیوروکریٹس کے علاوہ ان خفیہ ہاتھوں کا بھی ذکر کیا ہے جو ہر دور میں ہماری قسمت کے مالک رہے ہیں۔

بالآخر مایوس اور بددل ہو کر وہ نوجوان دوبارہ اپنی اسی یونیورسٹی میں تحقیق کے کاموں میں دن رات مصروف ہے جہاں اس کے پروفیسر نے پاکستان جانے سے پہلے اس کو بہت پیار سے سمجھایا تھا کہ ہیرے کی تراش خراش میں ہم جیسے جوہری ہر قیمت ادا کرتے ہیں' آپ اپنے ملک کی محبت میں اس وقت بہت دیوانے ہیں آپ ضرور جائیں' بہر حال یہ ادارہ آپ کا انتظار کرے گا۔ آج دنیا کے درجن سے زائد ممالک میں اس کا خصوصی استقبال کیا جاتا ہے۔ اس نے آخر میں میری طرف بڑا تیکھا اور دل میں اتر جانے والا تیر پوری طاقت سے پھینکا کہ آپ نے ساری عمر پاکستان سے باہر کیوں گزار دی؟ میں اس کو کیا بتاؤں کہ میں ہر روز جب سوتا ہوں تو صبح اٹھنے کی دعا پاکستان کی کرتا ہوں! اب رہنے دیجئے اگر ایسا ذکر چل نکلا تو بہت سے راز طشت از بام ہو جائیں گے لیکن میں تو منادی کرنے والا ہوں لیکن اب بھی ایمان کی حد تک یقین ہے کہ میرے رب نے ارضِ پاکستان سے دنیا میں ایک بہت بڑا کام لینا ہے اور میری دعا ہے کہ اس تبدیلی کو میں اپنے بچوں کے لئے بطور ''وراثت'' چھوڑ جاؤں!

رہے نام میرے رب کا جو غیب کے تمام علوم کا مالک ہے!

کچھ خواب ہیں جو نیند میں دیکھے نہیں جاتے
کچھ غم ہیں کہ چہرے سے نمایاں نہیں ہوتے
دل ہے کہ کبھی درد سے خالی نہیں رہتا
ہم ہیں کہ کبھی بے سروساماں نہیں ہوتے

بروز یکم ربیع الاوّل ۱۴۳۱ھ ۱۵ فروری ۲۰۱۰ء